
خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
دسمبر 2018
URDU TUBE
A HOME OF ENTERTAINMENT
www.urdutubes.com
Digitized by Google

بانیِ و مُدیرِ اعلیٰ —— محمود ریاض

مُدیرہ —— سادرہ خاتون

مُدیر —— آذر ریاض

نائب مُدیرہ —— رضیہ جمیل

مُدیرِ خصوصی —— امت الصبور
بلقیس بھٹی

نفسیات —— عدنان

اشتہارات —— خالدہ جیلانی

قانونی مُشیر —— نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

خواتین ڈائجسٹ

خط وکتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE	رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز



زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ------ 700 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 6000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے

subscriptions@khawateendigest.com

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

Digitized by Google



نظمیں غزلیں

رنگا رنگ پھول

میری بیاض سے

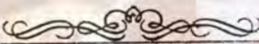
URDU TUBE

www.urdutubes.com

پکوان

نفسیات

بیوٹی بکس



دسمبر 2018

جلد 46 شمارہ 8

قیمت 70 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی

پبلشر آزر ریاض نے ابنِ حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

Digitized by Google

مدیر

کہی سنی

خواتین ڈائجسٹ کا دسمبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔
دسمبر سال کا آخری مہینہ۔ اداسیوں کا موسم جب سال کے رخصت ہوتے لمحے کچھ کھونے کا احساس دلاتے ہیں۔ احساس زیاں دل میں درد جگاتا اور اداسیاں بھر دیتا ہے۔ طویل خاموش راتوں میں بچھڑے عزیز دوست اور ان کے ساتھ گزارے خوبصورت پل یاد آتے ہیں۔

دسمبر کے مہینے سے ہماری تاریخ کے دو انتہائی المناک سانحے بھی وابستہ ہیں جن کے زخم کبھی نہ بھر پائیں گے۔

16 دسمبر 1971ء جب پاکستان دولخت ہوا اور ہمارا ایک بازو ہم سے جدا ہو گیا۔

16 دسمبر 2014ء۔ جب پھول جیسے معصوم بچوں کے جسم میں بارود اتار دیا گیا۔ وہ جو آنکھوں میں روشن مستقبل کے خواب سجائے علم حاصل کرنے گھر سے نکلے تھے، گھر لوٹے تو خواب دیکھنے والی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بے نور ہو چکی تھیں۔

سقوط ڈھاکہ ہماری تاریخ کا وہ المیہ ہے جب ہم اپنوں کی نظر میں نامعتبر ٹھہرے۔ وہ جو ہمارے اپنے تھے، انہوں نے اپنے راستے ہم سے علیحدہ کر لیے۔ ہماری آپس کی نااتفاقی نے اغیار کو موقع فراہم کیا اور اس کے نتیجے میں ہمارا ملک ٹوٹ گیا۔ ہمارے نوے ہزار فوجیوں کو انڈیا کی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی ذلت اٹھانا پڑی۔ پوری اسلامی تاریخ میں شکست، فتح، غداری، وفاداری کی داستانیں تو ملتی ہیں لیکن ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔

ان دونوں سانحات میں غور کریں تو ایک ہی بات سامنے آتی ہے۔ جب ہمارے درمیان یکجہتی نہیں رہتی، ہم متحد نہیں ہوتے، اپنے اپنے تعصبات کے اسیر ہو کر آپس میں ہی لڑنے لگتے ہیں تو ایسے اندوہ ناک المیے جنم لیتے ہیں۔
جو وقت گزر گیا، وہ تاریخ بن گیا اور تاریخ ہمیشہ بعد میں آنے والوں کے لیے عبرت و سبق کا باعث بنی ہے۔
اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ آمین۔

نیا سال۔ سروے،

جنوری کا شمارہ سالنامہ نمبر ہوگا۔ اس میں نئے سال کے حوالے سے سروے بھی شامل ہوگا۔
سوالات یہ ہیں۔

1۔ اب تک گزاری ہوئی زندگی کا وہ یادگار سال جس سے کوئی سنہری یاد وابستہ ہے۔
2۔ آنے والے سال سے وابستہ آپ کے خواب، توقعات اور امیدیں۔؟

ان سوالات کے جواب اس طرح بھجوائیں کہ ہمیں 24 دسمبر تک موصول ہو جائیں۔

اس شمارے میں،

- عمیرہ احمد کا ناول۔ الف،
- نمرہ احمد کا ناول۔ حالم،
- نعیمہ ناز کا مکمل ناول۔ رزق زوال،
- سدرہ حیات کا مکمل ناول۔ سب ہی کھوٹ من کے تھے،
- قرۃ العین سکندر، قرۃ العین خرم ہاشمی، ہاجرہ ریحان، نوشابہ زینت، نودین زہرہ اور حبیبہ انجم کے افسانے،
- باتیں مزنہ وقاص سے،
- پروگرام سچ سویرا کی میزبان ہما ارسلان سے ملاقات،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

Digitized by Google

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

آخری کلام

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس کی آخری گفتگو لا الہ الا اللہ ہو گی وہ جنت میں جائے گا۔'' (اسے ابوداود اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ اور امام حاکم نے اسے صحیح الاسناد کہا ہے۔)

فوائد و مسائل:

اس کا مطلب یہ ہے کہ لا الہ الا اللہ کا زبان پر جاری ہو جانا اس کے مومن ہونے کے علامت ہے اور مومن یقیناً جنتی ہے، تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ پہلے مرحلے ہی میں جنت میں چلا جائے گا یا سزا بھگتنے کے بعد دوسرے مرحلے میں جائے گا۔ یہ اللہ کی مشیئت پر موقوف ہے۔

اسی طرح توحید اور اس کے تقاضوں کو بھی اگر وہ سمجھنے اور شرک سے اجتناب کرنے والا ہو گا، تب جنت میں جائے گا ورنہ بہت سے نام نہاد کلمہ گو شرک صریح میں مبتلا ہیں، وہ کس طرح جنت میں جا سکتے ہیں۔

کلمہ کی تلقین کرنا

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اپنے مردوں کو لا الہ الا اللہ پڑھنے کی تلقین کرو۔'' (مسلم)

فائدہ:

مُردوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو قریب المرگ ہوں۔ اور تلقین کا مطلب بعض کے نزدیک یہ ہے کہ ان کے پاس بیٹھ کر لا الہ الا اللہ پڑھا جائے تاکہ اسے سن کر وہ بھی پڑھ لیں۔ ان کو پڑھنے کی تلقین نہ کی جائے کیونکہ اس طرح کرنے میں خطرہ ہے کہ کہیں وہ گھبراہٹ یا جھنجلاہٹ میں انکار نہ کر دیں جس سے

Digitized by Google

کفر لازم آسکتا ہے۔ اعاذنا اللہ منہ۔

لیکن شیخ ناصر الدین البانی رحمتہ اللہ نے اس بات کو درست قرار نہیں دیا اور لکھا ہے کہ تلقین کا مطلب یہی ہے کہ اسے لا الہ الا اللہ پڑھنے کے لیے کہا جائے اور خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بالفعل بھی ایسا ہی ثابت ہے۔

مرنے والے کی آنکھیں بند کرنا

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوسلمہ کے پاس حاضر ہوئے جبکہ (قبض روح کے بعد) ان کی آنکھیں اوپر کو کھلی ہوئی تھیں (جیسے کسی کے تعاقب میں ہوتی ہیں۔) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آنکھیں بند کردیں، پھر فرمایا:

''بے شک روح جب قبض کی جاتی ہے تو آنکھیں اس کے پیچھے لگتی ہیں۔''

تو ان کے گھر والوں میں سے کچھ لوگ چیخ کر رونے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اپنی جانوں کے لیے بھلائی ہی کی دعا کرو، اس لیے کہ جو تم کہتے ہو فرشتے اس پر آمین کہتے ہیں۔''

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اے اللہ! ابوسلمہ کو بخش دے اور اس کے درجے مہدیین میں بلند فرما اور اس کے بعد اس کے پسماندگان میں اس کا جانشین بن جا اور ہمیں اور اس کو اے رب العالمین! بخش دے۔ اور اس کی قبر کو فراخ کردے اور اس کے لیے اس کی قبر کو روشن فرما۔'' (صحیح مسلم)

فوائد و مسائل:

انسان کی روح جب قبض ہوتی ہے تو آنکھیں اس کے تعاقب میں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ اس لیے میت کی آنکھیں بند کردینی چاہئیں۔

ایسی مجالس میں بددعا نہ کی جائے کیونکہ وہاں موجود فرشتے آمین کہتے ہیں۔

اہل علم و فضل کو چاہیے کہ وہ میت والے گھر میں آئیں اور میت کے لیے مغفرت کی اور متعلقین کے لیے صبر جمیل اور دیگر امور خیر کی دعا کریں۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دعا سے میت کو نفع پہنچتا ہے۔ اس لیے مرنے کے بعد مرنے والے کے گھر آکر تعزیت کرنا اور دعا کرنا ایک مسنون عمل ہے، جس کے جائز بلکہ سنت ہونے میں کوئی شک نہیں۔ لیکن ہمارے ملک میں جو رواج ہے کہ باہر دری یا صفیں بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں اور تین دن تک بیٹھے رہتے ہیں، ان ایام میں لوگ آتے ہیں اور گھڑی گھڑی ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھتے ہیں، یہ طریقہ مسنون نہیں اور نہ اس موقع پر فاتحہ پڑھنے ہی کا کوئی جواز ہے۔ اس لیے اس رواج سے بچتے ہوئے مذکورہ سنت طریقے سے دعا کرنی چاہیے، میت کے لیے بھی اور اس کے ورثا کے لیے بھی۔ اس موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا ثابت نہیں ہے۔ اس لیے بہتر ہاتھ اٹھائے بغیر ہی دعا کرنا ہے کیونکہ طریقہ نبوی اور تعامل صحابہ یہی ہے۔

دعا

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب تم بیمار یا میت کے پاس آؤ تو بھلی بات کہو، اس لیے کہ جو تم کہتے ہو فرشتے اس پر آمین کہتے ہیں۔''

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ''جب (میرے خاوند) ابوسلمہ فوت ہوگئے تو میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ابوسلمہ وفات پاگئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم یہ دعا پڑھو: اللھم! اغفرلی......

''اے اللہ! مجھے اور اسے بخش دے اور مجھے اس سے بہتر بدل عطا فرما۔''

میں نے ان ہی الفاظ میں دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے بہتر بدل محمد صلی اللہ علیہ وسلم عطا فرما دیے۔ (صحیح مسلم)

فائدہ:

Google

ورثائے میت کو چاہیے کہ وہ مرنے والے کے خلا کو پر کرنے کے لیے یہ مسنون دعا پڑھا کریں تاکہ انہیں بدل ہی نہیں نعم البدل ملے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، اس کے لیے کوئی بات مشکل نہیں۔

مصیبت کے وقت دعا

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

''جس بندے کو کوئی مصیبت پہنچے اور وہ کہے: ''ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، اے اللہ! مجھے میری مصیبت میں اجر عطا فرما۔ اور اس کی جگہ بہتر بدل عطا فرما۔'' تو اللہ تعالیٰ اسے اس کی مصیبت میں اجر عطا کرتا اور اس کی جگہ اسے بہتر جانشین عطا فرماتا ہے۔''

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب ابو سلمہ فوت ہو گئے تو میں نے اسی طرح دعا کی جس طرح مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے (بہت) بہتر جانشین، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عطا فرما دیے۔ (مسلم)

فوائد و مسائل:

مطلب یہ ہے کہ حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو گیا۔ اس طرح دنیا ہی میں اللہ نے انہیں بہتر ہی نہیں بلکہ بہترین بدل عطا فرما دیا۔

اگر کسی کو دنیا میں بہتر بدل نہ ملے گا تو آخرت میں تو یقینی ہے۔ بہر حال یہ بھی اللہ کی مشیئت پر ہی موقوف ہے اور وہی بندوں کی مصلحتوں کو بہتر جانتا ہے۔

اولاد کی وفات

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب بندے کا بچہ فوت ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرماتا ہے: تم نے میرے بندے کے بچے کی روح قبض کر لی۔''

''وہ کہتے ہیں: ہاں۔''

اللہ تعالیٰ پھر فرماتا ہے: ''تم نے اس کے دل کا پھل لے لیا۔''

وہ کہتے ہیں: ''ہاں۔''

تو اللہ فرماتا ہے ''تب میرے بندے نے کیا کہا؟''

وہ کہتے ہیں کہ ''اس نے تیری حمد کی اور انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔''

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

''میرے بندے کے لیے جنت میں گھر بنا دو اور اس کا نام بیت الحمد رکھو۔'' (اس حدیث کو امام ترمذی رحمتہ اللہ نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔)

فوائد و مسائل:

ولد (بچہ) سے مراد انسان کی اولاد ہے، چاہے وہ مذکر ہو یا مؤنث۔ اولاد کی وفات والدین کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے لیکن اس پر صبر کرنا اور اللہ کی تقدیر پر شاکر رہنا، اس کی بھی بڑی فضیلت ہے۔

شیخ البانی رحمتہ اللہ نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

بدلہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

''جب میں اپنے مومن بندے کی دنیا کی پسندیدہ چیز چھین لوں، پھر وہ اس پر ثواب کی نیت رکھے (اور صبر کرے) تو میرے پاس اس کے لیے جنت کے علاوہ کوئی بدلہ نہیں ہے۔'' (بخاری)

صبر کی تلقین

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں میں سے ایک صاحبزادی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلوانے کے لیے پیغام بھیجا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی کہ اس کا بچہ یا بیٹا موت کی آغوش میں ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قاصد سے فرمایا:

''واپس جا اور اس سے کہہ کہ اللہ ہی کے لیے ہے جو اس نے لیا اور اسی کا ہے جو اس نے دیا اور ہر

Digitized by Google
Khawateen Digest December 2018

چیز اس کے پاس ایک وقت مقرر کے ساتھ ہے، پس اس کو حکم دے کہ وہ صبر کرے اور اللہ سے ثواب کی امید رکھے۔" اور باقی حدیث بیان کی۔
(بخاری و مسلم)

فائدہ:
اس میں مصیبت کے وقت صبر کرنے کی تلقین کا بیان ہے۔

میت پر بین اور نوحہ

نوحہ کرنا تو حرام ہے۔ اس کی ممانعت کی بھی بہت سی احادیث ہیں اور یہ حدیث ہے کہ میت کو اس کے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے۔ اس کی تاویل کی گئی ہے اور اسے ان لوگوں پر محمول کیا گیا ہے جو رونے پیٹنے کی وصیت کر کے جائیں۔ اور رونا وہ ممنوع ہے جس میں بین اور نوحہ ہو، ورنہ بین اور نوحے کے بغیر رونے کے جواز پر کثیر احادیث دلالت کرتی ہیں۔ چند ایک درج ذیل ہیں

آنسو بہانا

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن عبادہ کی عیادت کی اور آپ کے ساتھ عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم بھی تھے۔ (وہاں پہنچ کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (بے اختیار) رو پڑے۔ جب لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی رو پڑے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"کیا تم سنتے نہیں! یقیناً اللہ تعالیٰ آنکھ کے آنسو اور دل کے غم پر عذاب نہیں دے گا، لیکن اس کی وجہ سے عذاب دے گا یا رحم کرے گا۔"
اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک کی طرف اشارہ فرمایا۔ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:
شدت غم سے آنکھوں سے آنسوؤں کا جاری ہو جانا، اسی طرح دل کا غمگین ہونا، یہ دونوں چیزیں فطری ہیں جن پر انسان کا اختیار نہیں، بلکہ یہ رحمت کا ایک حصہ ہیں۔ یہ ممنوع ہیں نہ قابل مؤاخذہ۔ مؤاخذہ جس پر ہوگا اور جس کی ممانعت ہے، وہ ہے زبان سے بین اور نوحہ کرنا۔ لیکن اگر اسی زبان سے صبر و شکر کے کلمات ادا کیے جائیں تو انسان رحمت الٰہی کا مستحق ہوگا۔

ندب کے معنی ہیں: مرنے والے کے محاسن اور خوبیوں کا تذکرہ۔ اور نوحہ کا مطلب ہے: چیخ چیخ کر ان کا ذکر کرنا اور پھر اس پر جزع فزع کرنا۔ یہ دونوں مل کر ممنوع ہیں جسے ہم بین اور ماتم کرنا کہتے ہیں۔ ورنہ محض مرنے والے کے محاسن اور خوبیوں کا تذکرہ کرنا ممنوع نہیں بلکہ محمود و مستحسن ہے تاکہ دوسرے لوگوں کو بھی انہیں اختیار کرنے کی ترغیب ہو۔ اسی طرح جو حدیث ہے کہ میت کو اس کے گھر والوں کے اس پر رونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے۔ اس میں بھی ایک تو رونے سے مراد وہی بین اور ماتم کرنا ہے ورنہ محض رونا تو فطری عمل ہے، وہ نہ ممنوع ہے نہ قابل گرفت۔

علاوہ ازیں یہ حکم ایسے شخص کے لیے ہے جو خود بھی اپنی زندگی میں نوحہ و ماتم کرتا رہا ہوگا، یا اپنی میت پر نوحہ و ماتم کرنے کی وصیت کر کے مرا ہوگا، یا اس کے علم میں ہو کہ میرے مرنے کے بعد میرے گھر والے مجھ پر خوب نوحہ و ماتم کریں گے جیسے کہ بعض خاندانوں میں رواج ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ انہیں منع کر کے نہیں مرا۔

ان تینوں صورتوں میں وہ خود بھی شریک جرم متصور ہوگا اور اس پر اس کے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے عذاب ہوگا۔ لیکن اگر تینوں صورتوں میں سے کوئی ایک صورت بھی نہیں ہوگی اور اس کے باوجود میت کے گھر والے محض اپنی جہالت کی وجہ سے اس پر نوحہ و ماتم کریں گے تو سارا گناہ نوحہ و ماتم کرنے والوں ہی کو ہوگا، میت کو ان کی وجہ سے عذاب نہیں ہوگا کیونکہ یہ کسی طرح بھی ان کے اس گناہ میں شریک نہیں ہے۔ اس لیے لا تزر وازرۃ وزر اخری (بنی اسرائیل 15:17) کے مطابق اس پر کوئی وبال نہیں ہوگا۔

Khawateen Digest December 2018
Google

رحم

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان کے نواسے کو اٹھا کر لایا گیا جو مرنے کے قریب تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا۔

''اے اللہ کے رسول! یہ کیا ماجرا ہے؟''

آپ نے فرمایا: ''یہ رحمت ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے رحم دل بندوں ہی پر رحمت فرماتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

اللہ کی رضا

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بیٹے ابراہیم کے پاس آئے جو کہ جان کنی کے عالم میں تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں کے ساغر چھلک پڑے تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اور آپ بھی (روتے ہیں) اے اللہ کے رسول!''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے ابن عوف! یہ رحمت و شفقت ہے۔'' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ رو پڑے اور فرمایا:

''بے شک آنکھیں آنسو بہاتی ہیں اور دل غمگین ہے لیکن ہم وہی بات کہیں گے جو ہمارے رب کو راضی کر دے۔ اور اے ابراہیم! ہم تیری جدائی پر یقیناً غم زدہ ہیں۔'' (اسے بخاری نے روایت کیا ہے) اور مسلم نے بھی اس کا کچھ حصہ روایت کیا ہے۔

فائدہ:

ابراہیم، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ بیٹا تھا جو حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھا۔ وفات کا یہ واقعہ دس ہجری کا ہے۔ ان احادیث سے رونے کا جواز بالکل واضح ہے لیکن وہ رونا جس میں بین اور نوحہ نہ ہو۔

میت کے عیب بیان کرنے سے زبان کو روکنے کی تاکید

حضرت ابو رافع اسلم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص کسی میت کو غسل دے (اور وہ اس میں کوئی عیب دیکھے) پس وہ اس کی پردہ پوشی کرے تو اللہ تعالیٰ اسے چالیس مرتبہ معاف فرمائے گا۔''

(اسے امام حاکم نے شرط مسلم پر صحیح کہا ہے۔)

فوائد و مسائل:

اس سے معلوم ہوا کہ دوران غسل کوئی جسمانی عیب نظر آئے یا کسی وجہ سے اس کی شکل وصورت میں تغیر رونما ہو جائے تو اسے بیان کرنے سے گریز کیا جائے تا کہ اس کی ذلت و رسوائی نہ ہو۔

بعض علماء عبرت کے طور پر مسخ شدہ لاش کی بابت بیان کرنے کو جائز قرار دیتے ہیں، تاہم حدیث میں پردہ ڈالنے ہی کا حکم ہے، اس لیے پردہ پوشی ہی صحیح ہے۔

جنازہ کے ساتھ چلنا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو شخص جنازے میں حاضر ہوا یہاں تک کہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے، اس کے لیے ایک قیراط اجر ہے اور جو اس کے دفن تک موجود رہے اس کے لیے دو قیراط اجر ہے۔''

دریافت کیا گیا: ''دو قیراط کی مقدار کیا ہے؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دو بڑے پہاڑوں کی مثل۔'' (بخاری و مسلم)

فائدہ:

اس میں مسلمان کے جنازے میں شرکت کی فضیلت کا بیان ہے۔ اگر جنازے اور نماز میں شرکت کی جائے تو ایک بڑے پہاڑ کی مانند اجر ملے گا اور اگر تدفین میں بھی شریک ہوا جائے تو اس سے دگنا اجر ملے گا، یعنی دو بڑے پہاڑوں کے برابر۔



Digitized by Google

قدرت اللہ شہاب کی باتیں

ابنِ انشاء

لاہور اور کراچی کے کئی اخباروں میں یہ خبر چھپی ہے کہ قدرت اللہ شہاب جو اردو کے ایک نامور ادیب ہیں، بھیس بدل کر اور جان ہتھیلی پر رکھ کر ان علاقوں میں گھس گئے جو ہمارے نزدیک عرب علاقے ہیں اور ہمارے دشمنوں کی اصطلاح میں ''اسرائیل۔'' وہاں یہ بیت المقدس میں گھومے پھرے، عربوں کے گھروں میں گئے، ان کے انڈر گراؤنڈ لیڈروں سے ملے کیونکہ یہ الفتح کے مجاہدین کے ساتھ یا ان کی مدد و اعانت سے ہی تو گئے تھے اور اسرائیلی چیرہ دستیوں کے ثبوت مع فلم فوٹو وغیرہ لے کر واپس پہنچ گئے اور وہاں یونیسکو کے پلیٹ فارم سے ایسی معرکے کی تقریر کی کہ اسرائیلی اور حامیان اسرائیل بوکھلا کر رہ گئے۔ اقوام متحدہ کے اس پلیٹ فارم سے نہ صرف اسرائیل کی مذمت ہوئی بلکہ یونیسکو کے ڈائریکٹر جنرل کو تفتیش کے لیے خود بھاگ کر تل ابیب جانا پڑا۔

☆☆☆

ہم نے یہ خبر پڑھی اور آنکھیں ملیں، پھر اپنے چٹکی لی، یہ جاننے کے لیے کہ ہم جاگ رہے ہیں یا خواب دیکھ رہے ہیں کیونکہ ہم اس قسم کی جرأت کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ہمارا واسطہ زیادہ تر کاغذی شیروں کے ساتھ پڑتا ہے، سچ مچ کا شیر صرف چڑیا گھر میں یا ایم جی ایم کی فلموں میں ٹائٹل پر دیکھا ہے۔

دیکھا جائے تو اس میں چٹکی لینے کی چنداں بات بھی نہ تھی، کیونکہ ایک صاحب کے قول کے مطابق قدرت اللہ شہاب ایک آتش برگ ہیں۔ برف کا پہاڑ، ایک درجہ پانی کے اوپر دس درجے نیچے، ایک طرف درویش خدا مست ہیں، دوسری طرف شوخ وشنگ افسانہ نگار، ایک طرف الحاج، تہجد گزار، اعتکاف نشین؛ دوسری طرف بقول ایک صاحب کے رابن ہڈ کے ہم زلف۔

1948ء میں کشمیر پر حملہ ہوا تو نوکری چھوڑ کر آڑی یا تراڑ کھل میں جا بیٹھے لیکن ہم سے پوچھیے تو ان کا مزاج اس سے پہلے سے بلکہ لڑکپن ہی سے عاشقانہ تھا۔

قحط بنگال کے دنوں میں جب کہ یہ نئے نئے آئی سی ایس ہوئے تھے اور مدناپور میں تملوک کے ایس ڈی او تھے تو انہوں نے اپنی نگرانی میں بیوپاریوں کے گودام لٹوا دیے تھے، جن میں ہزاروں بوریاں لالہ پنا لال اگر وال نے موقع مناسب پر سونے کے مول بیچنے کے لیے ذخیرہ کر رکھی تھیں، ان پر ایک تحقیقاتی کمیٹی بھی بیٹھی تھی لیکن یہ دیکھ کر لوگ تو ان کو پوجنے لگے ہیں، بیٹھی ہی بیٹھی رہ گئی۔

اور بھاگل پور کا واقعہ تو اس سے بھی عجیب ہے، کوئٹ انڈیا تحریک زوروں پر تھی۔ ایک گاؤں میں لوگوں نے سرکاری ڈاک خانہ جلا دیا تھا، اوپر کی سطح پر فیصلہ ہوا کہ یہ پورا گاؤں جلا دیا جائے تا کہ دوسروں کو عبرت ہو، چنانچہ کمشنر میکفرسن، ڈپٹی کمشنر پریڈو، ڈی آئی جی پولیس کچھ نفری لے کر تیل کے کنستروں سے مسلح شہاب صاحب کی عمل داری میں پہنچ گئے، انہوں نے پوچھا۔

''خیریت؟''

جواب ملا۔

''ہم فلاں گاؤں جلانے آئے ہیں۔''

یہ بولے۔

''مجھ سے اجازت لے لی؟''

کمشنر وغیرہ بہت ہنسے اور بولے۔

''تو کون ہے؟''

انہوں نے کہا۔

''میں اس علاقے کا ایس ڈی او، آپ کتنے بھی بڑے حاکم ہوں' یہ علاقہ میری تحویل میں ہے۔ یہاں کے نظم ونسق کا میں ذمہ دار ہوں، آپ لوگ چلے جائیے۔''

وہ اور زیادہ ہنسے کہ چہ پدی چہ پدی کا شوربا۔

ان کے پاس ایک اردلی تھا شیر خان، جہلم کا رہنے والا، اس سے انہوں نے کہا۔

''دیکھو شیر خان! یہ صاحب لوگ گاؤں کو جلانے آئے ہیں، تم میرا حکم مانو گے؟''

بولا۔

''حضور آپ ہی کا حکم مانوں گا۔''

URDU TUBE

Google

انہوں نے فرمایا۔

''اچھا تو ان صاحب لوگوں میں سے جو بھی اس دروازے سے باہر نکلنے کی کوشش کرے اس کو گولی مار دو۔''

وہ اور بھی بگڑے دل تھا، بولا۔

''جناب! اگر حکم ہو تو، یہ لوگ اگر نہ بھی نکلیں تب بھی گولی مار دوں؟''

انہوں نے کہا۔

''نہ نہ، ایسا مت کرنا۔''

یہ بات ان افسران عالی مقام کو سنا کر کہی گئی تھی، ڈی آئی جی صاحب نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن شیر خان کی بندوق کی نال دیکھ کر سہم گئے۔ ساری پارٹی کو بے نیل و مرام غصے کے شعلے اگلتے لوٹنا پڑا۔

چیف سیکریٹری کے ہاں غلطی ہوئی تو یہ استعفیٰ جیب میں رکھ کر لے گئے، انہوں نے کہا برخوردار! تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے۔ ایک گاؤں جل جاتا تو سارے بہار میں آگ لگ جاتی لیکن اتنے بڑے بڑے حاکموں کی، حکم عدولی نہیں کیا کرتے، اب جاؤ میں سمجھ لوں گا۔''

تتمہ اس کہانی کا یہ ہے کہ راجندر پرشاد جو ان ہی نواحات کے رہنے والے تھے اور بعد میں بھارت کے صدر ہوئے۔ یہ ماجرا سن کر ایک جلوس لیے زندہ باد کے نعرہ لگاتے ان کے گھر آئے اور اس رشتے سے بعد میں تاحیات ان کو عید پر عید کارڈ بھیجتے رہے۔

☆☆☆

جھنگ اور لائل پور کی ڈپٹی کمشنری کے زمانے میں بھی یہ ہارون الرشیدی کیا کرتے تھے، یعنی بھیس بدل کر شہر اور دیہات میں گھوما کرتے تھے۔ وہاں انہوں نے لوگوں کے لیے جو کچھ کیا اس کی بنا پر اب تک یاد کیے جاتے ہیں لیکن وہاں کے پیروں اور جاگیرداروں کو یہ ایک آنکھ نہ بھائے اور آخر ان کی ڈپٹی کمشنری چھڑا کر انہیں ہالینڈ بھیج دیا گیا۔

ایران کے بادشاہ فتح علی قاچار کے ملک الشعراء پر بھی یہی گزری تھی، ایک بار بادشاہ نے کچھ اشعار لکھے جو نہایت پوچ تھے، ملک الشعراء سے رائے مانگی تو انہوں نے کہا۔

''حضور! یہ کہاں کی شاعری ہے؟''

بادشاہ نے غصہ ہو کر اسے طویلے میں بند کرا دیا۔ کچھ دن بعد پھر بادشاہ نے فکر سخن کی اور ملک الشعراء کو بلایا تاکہ آکر داد دیں، انہوں نے شعر سنے اور اٹھ گئے۔

شاہ نے پوچھا۔ کہاں چلے؟'' بولے۔

''پھر طویلے جاتا ہوں۔''

☆☆☆

لاہور کے ایک اخبار نے کمال کیا، ان کے عرب مقبوضہ علاقوں میں جانے کی خبر دی اور ساتھ ہی ٹانکا لگایا کہ یہ کسی ملک کا جعلی پاسپورٹ بنوا کر گئے تھے؟ وہ کوئی پاکستان کا دشمن ملک ہی ہو سکتا ہے۔ ان کی تحقیق ہونی چاہیے، تب ہمیں معلوم ہوا کہ الفتح کے مجاہدین جب چھاپہ مارنے جاتے ہیں، سرحد پر اسرائیلی افسروں کو بتاتے ہیں کہ ہم آپ کے علاقے میں بم پھینکنے جا رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، اچھی بات ہے اور مہر لگا کر اجازت دے دیتے ہیں، بلکہ آدمی بھی ساتھ کر دیتے ہیں تاکہ کوئی ان کو منع نہ کرے۔

دوسری بات بھی ایسی ہی جوڑ دی کہ ایک صاحب جو شہاب کے دوست ہیں۔ پچھلے دنوں کراچی سے لندن آتے ہوئے ماسکو اترے تھے اور ایک محفل میں پاکستان بھارت کی کنفیڈریشن کے بارے میں خیال آرائی کرتے سنے گئے۔ لیجیے ''رائی'' یہ تھی کہ کوئی صاحب جو شہاب کے ایک ہزار ایک دوستوں میں سے ہوں گے۔ پی آئی اے کی اس فلائٹ سے آئے جو ماسکو کے راستے جاتی ہے، اتر کر ماسکو کی سیر بھی کی ہوگی اگرچہ کوچن سے ان کے ملنے کا امکان کم ہے۔ بہر حال پربت یہ بنا کہ ضرور قدرت اللہ شہاب لندن میں بیٹھے پاکستان اور بھارت کی کنفیڈریشن بنا رہے ہوں۔ خبر سے خبر ہی نکلتی ہے بلکہ نکالی جاتی ہے۔

وہ بزرگ بڑے دور اندیش تھے، جن کی چھاتی پر سے چوہا گزر گیا تو رونے لگے۔ لوگوں نے کہا۔

''میاں اس میں کیا بات گھبرانے اور رونے کی ہے۔''

بولے۔

''میں چوہے کو نہیں روتا، چوہے کے پیچھے بلی دوڑی آئے گی، بلی کے پیچھے کتا آئے گا، کتے کے پیچھے پولیس کا پیادہ آئے گا اور پھر پوری فوج پریڈ کرتی میری چھاتی پر سے گزر گئی تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔''

شہاب صاحب سمجھے ہوں گے کہ انہوں نے اسرائیل پر چھاپہ مار کر بڑا کام کیا، یہاں ایک معمولی اخبار والے نے دفتر میں بیٹھے بیٹھے ٹنگڑی ماری اور چاروں شانے چت کر دیا۔ واہ بھئی واہ اخبار والو۔ ☆

Digitized by Google



مارننگ شو کی میزبان

ہما ارسلان سے ملاقات

شاہین رشید

پاکستان میں چینلز کا اجرا ہوا تو جہاں ڈراموں کی بھرمار ہو گئی وہاں مارننگ شو بھی ہر چینل سے پیش کیے جانے لگے، ابتداء میں ان مارننگ شوز میں بڑی ورائٹی ہوا کرتی تھی ...... اور ناظرین بڑی دلچسپی کے ساتھ ان پروگراموں کو دیکھا کرتے تھے۔ مگر آہستہ آہستہ یہ مارننگ شوز شادی بیاہ، میک اپ کی باتیں، گورا کرنے کے طریقے اور ناچ گانے تک محدود ہوتے گئے اور ان میں وہ کچھ پیش کیا جانے لگا جو سوائے چند لوگوں کے شاید کوئی بھی پسند نہیں کرتا ہو گا......

اور سچ بات تو یہ ہے کہ اب مارننگ شوز کو دیکھ کر غریب گھرانے کی لڑکیاں تو احساس کمتری کا ہی شکار ہوتی ہیں۔ کیونکہ کپڑے زیورات اور میک اپ کی باتیں لاکھوں میں کی جاتی ہیں۔ اور لاکھوں روپے کے عروسی جوڑے پہنا کر دلہنیں تیار کی جاتی ہیں ......

انہی مارننگ شوز میں جو پروگرام ہمیں سب سے الگ اور منفرد لگا وہ ''سچ سویرا'' ہے جو کہ سچ ٹی وی سے پیش کیا جاتا ہے اور جس کی میزبان ''ہما ارسلان'' آج ہمارے خواتین ڈائجسٹ کی مہمان ہیں۔

''کیا حال ہیں آپ کے؟''

''اللہ کا شکر ہے۔''

''آپ کا مارننگ شو دیگر شوز سے بالکل مختلف ہے ...... اس کو دیکھنے کے بعد اگر اسے ایک کیلچر شو کہیں تو غلط نہ ہوگا؟''

''اچھا نام دیا آپ نے میرے پروگرام کو ...... بلکہ مارننگ شو کو لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ یہ کوئی لیکچر شو نہیں ہے بلکہ بنیادی طور پر یہ ''سوشل ایونٹس'' کا پروگرام ہے جو ڈیزائن کیا گیا ہے...... اس کا فارمیٹ ہی ایسا ہے کہ اسے ہم نے ایک ٹاک شو کے طور پر پیش کرنا ہے...... جیسا کہ اس پروگرام کو دیکھنے والوں کو اندازہ ہوگا کہ ہم روزانہ کسی ایک ''موضوع'' کا انتخاب کرتے ہیں اور اسی فیلڈ کے ماہرین کو مدعو کرتے ہیں جیسے اگر ''صحت'' کا پروگرام ہے۔ نفسیات کا کوئی پروگرام ہے، تو اس فیلڈ کے ماہر لوگ آئیں گے۔ یوں سمجھیں۔۔۔ کہ ہمارے ملک کے، ہمارے معاشرے کے جو مسائل ہیں ان کو زیر بحث لاتے ہیں۔''

''اس کا دورانیہ شاید دو گھنٹے ہوتا ہے اور کیا یہ پروگرام زیادہ دیکھا جاتا ہے یا کم؟''

''جی، شاید نہیں ...... بلکہ واقعی اس کا دورانیہ دو گھنٹے ہوتا ہے اور جو بھی موضوع ہم لیتے ہیں۔ اس کے متعلق کچھ رپورٹس بھی ہوتی ہیں، ماہرین بھی ہوتے ہیں اور یہ پروگرام کافی زیادہ دیکھا جاتا ہے۔ اس لیے چھ سات سال سے ریگولر پیش بھی کیا جا رہا ہے...... اور اسی فارمیٹ سے چل رہا ہے اور آپ یقین کریں کہ بہت اچھا فیڈ بیک آتا ہے ہمیں اپنے پروگرام کا......

لوگ بڑی تعداد میں ہمیں کالز کرتے ہیں...... لوگ اپنے مسائل بتاتے ہیں اور پھر ان کا حل بھی چاہتے ہیں...... کبھی کبھی کچھ فارمیٹ میں بھی چینج کر دیتی ہوں، یعنی شروع میں ہم پرابلمز بتا رہے ہوتے ہیں۔ درمیان میں ہم وجوہات بتاتے ہیں کہ ان وجوہات کی بنا پر مسائل جنم لے رہے ہیں اور آخر میں ہم مسائل کا حل بتاتے ہیں کہ ہم آگے کیسے بہتری لا سکتے ہیں۔''

''ایک ہی موضوع کو دو گھنٹے تک ڈسکس کرنا، کیا آپ بور نہیں ہو جاتیں؟''

''ہنستے ہوئے...... ایمانداری سے بتاؤں تو میں بالکل بھی بور نہیں ہوتی ...... کیونکہ آپ روزانہ تین سے چار لوگوں سے بات کر رہے ہوتے ہیں ایک ہی ٹاپک پہ...... میں بھی لوگوں کو جج کر رہی ہوتی ہوں کہ یہ پرابلمز کو کس طرح فیس کرتے ہوں گے، درمیان میں وجوہات بھی بتاتے ہیں۔ اب اس کے حل کی طرف کیسے جائیں گے، تو ایک لحاظ سے بہت دلچسپ پروگرام ہوتا ہے ...... اور بریک میں جب ہم خوش گپیاں کرتے ہیں تو بریک کے بعد ایک نئی انرجی کے ساتھ پروگرام کرتے ہیں۔''

''بے شک لوگ شوق سے دیکھتے ہوں گے، استفادہ بھی کرتے ہوں گے، مگر پھر بھی کوئی ورائٹی ضرور ہونی چاہیے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟''

''ورائٹی والی رائے آپ کی بہت اچھی ہے کہ میوزک بھی ہونا چاہیے۔ ویسے آپ کو بتاؤں کہ ہمارے پروگرام میں ورائٹی ہوتی ہے۔ وہ اس طرح کہ پیر کے دن ہمارے مہمان ''آسٹرولوجسٹ'' ہوتے ہیں، جن سے لوگ اپنے بارے میں پوچھتے ہیں۔ سب سے زیادہ سوال شادی کے بارے میں ہوتا ہے کہ ہماری شادی کب ہوگی ...... فیوچر کیسا ہو گا، تعلیم کے بارے میں بھی نوجوان کال کرتے ہیں۔ زائچہ بنوانا لوگوں کا خاص شغل ہوتا ہے۔

منگل کے دن ''جنرل فزیشن'' ہمارے مہمان ہوتے ہیں۔ جو صحت سے متعلق کیے گئے سوالوں کے جوابات دیتے ہیں بلکہ بیماریوں کے بارے میں اور ان سے بچنے کے طریقے بھی بتاتے ہیں ...... یہ ایک بہت ہی معلوماتی پروگرام ہوتا ہے اور بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے ...... وزن بڑھنے اور گھٹنے کے بارے میں لوگ بہت سوال پوچھتے ہیں......

اسی طرح جمعہ کے دن اسلامی شوز ہوتے ہیں۔ جیسے ''دیانت داری'' کے بارے میں کیا کہا گیا ہے۔ ''حسد'' کے بارے میں کیا کہا گیا ہے۔ جھوٹ کے بارے میں کیا کہا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح

Digitized by Google

جمعرات کو مختلف فیلڈ کے مختلف لوگوں کو بلاتے ہیں۔ جیسے مارشل آرٹ کے جو ماہر ہیں یا جنہیں فوٹو گرافی کا شوق ہے ان کو بلا لیتے ہیں۔ ایکسر سائز کے ماہرین یا یوگا کے ماہرین کو بلا لیتے ہیں۔ تو اس لحاظ سے ورائٹی بہت ہے ہمارے پروگراموں میں۔"

کبھی کبھی ڈائریکٹرز، فیشن ڈیزائنر اور بیوٹیشن کو بھی بلا لیتے ہیں...... بیوٹیشن سے ٹوٹکے اور فیشن ڈیزائنر سے کیا ان ہے یا کیا آؤٹ ہے۔ نوجوانوں کو کس طرح فیشن کرنا چاہیے اور بڑی عمر کے لوگوں کو کس طرح کا فیشن کرنا چاہیے، سب شامل ہوتا ہے۔"

"موضوع کے انتخاب میں آپ کا کیا کردار ہوتا ہے؟"

"مجھے صرف یہ بتا دیا جاتا ہے کہ کل کیا موضوع ہوگا اور کون کون سے مہمان ہوں گے۔ سچ سویرا کی جو ٹیم ہے یہ انہی کا کام ہوتا ہے کہ اگلے دن کیا پروگرام ہوگا، کیا موضوع ہوگا۔"

"مارننگ شوز" کو اگر دیکھیں تو آپ واحد ایسی ہوسٹ ہیں جو اسکارف میں آتی ہیں۔ یہ پابندی ہے یا آپ کی اپنی چوائس اور عام زندگی میں آپ کیسی ہیں۔"

"میں چھ سال سے سچ ٹی وی سے وابستہ ہوں اور اسی اسٹائل میں آتی ہوں۔ یہ سب سے مختلف اور منفرد اسٹائل ہے۔ ہمارے پروگرام کے فارمیٹ کا حصہ ہے۔ عام زندگی میں اسکارف تو نہیں لیتی لیکن دوپٹہ ضرور لیتی ہوں۔ سر پہ بھی لے لیتی ہوں تو کافی مشابہت ہے میری لائف میں اور پروفیشنل لائف میں میں عام زندگی میں سادگی پسند ہوں، اچھے کپڑے ضرور پہنتی ہوں اور اپ ٹو ڈیٹ بھی رہتی ہوں۔ ایسی نہیں ہوں کہ "جھلی" بنی رہتی ہوں، فیملی اورینٹڈ بندی ہوں اور کوشش کرتی ہوں کہ فیملی کو زیادہ سے زیادہ ٹائم دوں۔"

"تھوڑی تنقید کرنا چاہوں گی کہ آپ کا انٹروڈکشن کا اسٹائل ایک سا ہی ہے...... انٹروڈکشن میں موسم کا ذکر لازمی ہوتا ہے؟"

"تنقیدی پوائنٹ بہت اچھا ہے اور موسم کا حال ہمارے فارمیٹ کا حصہ ہے اور یہ ہمارے پروڈیوسر کی ہدایات ہوتی ہیں کہ آپ نے آنا ہے، ٹاپک کے بارے میں بات کرنی ہے۔ پھر موسم کا حال اور پھر مہمانوں کا تعارف...... تو ان کے کہنے کی وجہ سے، بار بار کہنے کی وجہ سے اور ہر روز کہنے کی وجہ سے میں نے بھی اپنی عادت بنالی ہے...... اور یہ فارمیٹ چینج ہوسکتا ہے اور اب ٹرائی کروں گی کہ اسے کیسے چینج کروں۔"

"کوئی پروگرام جو بہت زیادہ پسند کیا گیا ہو؟"

"بہار ثقافت کے نام سے ہم "کلچرل ویک" مناتے ہیں، یہ اپریل کے فرسٹ ویک میں ہوتا ہے۔ جس میں چاروں صوبوں، گلگت بلتستان، پوٹھوہار، سرائیکی، کشمیر کی ثقافت کو ہم پیش کرتے ہیں کہ وہاں کے مشہور کھانے کون سے ہیں۔ وہاں کی موسیقی، وہاں کا ادب، وہاں کی روایات، رسم و رواج کیا ہیں، لباس کیا ہے، بولنے کا انداز، پھر بچوں کے حوالے سے کہ وہ کس انداز میں بچوں کی پرورش کرتے ہیں...... تو یہ ویک بہت زیادہ پسند کیا جاتا ہے......

اور جس جس صوبے اور علاقے کی ثقافت ہم بتاتے ہیں اِس دن میں بھی وہاں کی ثقافت کا لباس اور زیورات اور میک اپ کرکے آتی ہوں اور مہمان بھی وہی بلائے جاتے ہیں جن کے بارے میں پروگرام ہوتا ہے۔ سیٹ بھی ویسے ہی ہوتے ہیں تو بہت اچھا ہوتا ہے ہمارا یہ ویک۔"

"ٹی وی پہ آمد کیسے ہوئی...... ابتدا میں کیا کیا؟"

"2013ء میں میں نے ٹی وی جوائن کیا، یہ میرا پہلا تجربہ تھا جاب کا...... ٹی وی پہ آنا، پروگرام ہوسٹ کرنا درحقیقت میری مما کا خواب تھا اور وہ ہی مجھے موٹیویٹ کرتی تھیں۔ وہ کسی اینکر کو خبریں پڑھتے دیکھتیں یا کسی کو میزبانی کرتے ہوئے دیکھتی تھیں تو

Google

مجھے کہتیں کہ تم بھی یہ کر سکتی ہو، تم میں بہت پوٹینشل ہے، اچھا بولتی ہو۔ لوگوں سے میل ملاپ جلدی کر لیتی ہو تو بس تمہیں ٹی وی پہ آنا چاہیے...... اور میں ہمیشہ انکار کر دیتی کہ نہیں مجھے جاب کرنی ہے کیونکہ میں نے ایم بی اے کیا تھا اور میں بینک میں جاب کرنا چاہتی تھی......

مما کی باتیں میرے لاشعور میں گھر کر گئی تھیں، مگر میں نے خود سے کوشش نہیں کی، ایک بار ایک کزن نے بتایا کہ اسلام آباد میں ایک نیوز چینل ہے "سچ ٹی وی" کے نام سے اور وہاں جاب کے لیے جگہ خالی ہے۔ میں نے کوئی رسپانس نہیں دیا۔ ایک دن چائے پیتے ہوئے میں نے مما سے اس جاب کا ذکر کر دیا اور بتایا کہ بھائی نے کہا ہے کہ کوئی سچ ٹی وی میں جاب کرنا چاہے تو بتائیں...... بس پھر تو مما کا اصرار کہ تم جا کر آڈیشن دو...... مختصراً یہ کہ میں گئی آڈیشن دیا...... اور پہلی بار کیمروں کا سامنا کیا، اسٹوڈیو کیا ہوتا ہے پہلی بار معلوم ہوا۔

نیوز کیسے بنتی ہیں، اس کے پیچھے ٹیم کی کتنی محنت ہوتی ہے سب کچھ پہلی بار معلوم ہوا، تین بار میرا اسکرین ٹیسٹ لیا گیا...... اور دو دن کے بعد کال آ گئی کہ میں سلیکٹ ہو گئی ہوں اور اب مجھے ٹریننگ کے لیے آنا ہے...... مجھے ٹریننگ دی گئی اور ڈائریکٹ "آن ایر" کر دیا گیا۔ یہ میری مما کا خواب تھا ورنہ اس مقام تک آنے کے لیے لوگ بہت محنت کرتے ہیں، بہت سال لگے رہتے ہیں تب کہیں جا کر سیٹ ہوتے ہیں۔ مگر مجھے بہت تھوڑا ٹائم لگا۔ مما کی دعائیں ہیں...... اور جب جوائن کر لیا ٹی وی تب اپنی جگہ بنانے کے لیے میں نے بہت محنت کی...... کیونکہ راستہ مجھے مل گیا تھا۔ عبور میں نے کرنا تھا...... اور میری ماں کی خواہش کہ میں مارننگ شو کروں اور اس کے لیے راستے بھی میرے رب نے بنا دیے...... مجھے چھ سال ہو گئے ہیں اس چینل میں اور ان چھ سالوں نے مجھے بالکل چینج کر کے رکھ دیا ہے۔ نیوز اینکر سے ہوسٹ کا سفر بہت اچھا گزرا بہت کچھ سیکھا۔ پہلے میں اخبار نہیں پڑھتی تھی مگر اپ ڈیٹ رہنے کے لیے ہر صبح بہت سے اخبار پڑھنا پڑتے ہیں۔"

"پہلا پروگرام تو یقیناً نیوز کا ہی ہو گا تو یہ سب کچھ کیسا لگتا تھا...... مطلب لائف کی یہ تبدیلی کیسی لگتی تھی؟"

"جی پہلا پروگرام "نیوز بلیٹن" تھے۔ مارننگ شفٹ ہوتی تھی اور صبح اٹھنا بہت مشکل لگتا تھا۔ لیکن عادت بن چکی تھی، کچھ ہفتوں سے صبح اٹھنے کی، صبح آٹھ سے چار کی شفٹ ہوتی تھی اور سات بجے گھر واپسی ہوتی تھی...... نیوز پڑھنا بہت مشکل کام ہے کیونکہ آپ صرف نیوز ڈیلیور نہیں کر رہے ہوتے۔ جب میں نے خبریں پڑھنا شروع کیں تو الیکشن کا دور تھا...... الیکشن سے پہلے صرف ایک بلیٹن کرتی تھی مگر گیارہ مئی کو میری بلیٹن کی شفٹ کافی لمبی تھی اور اس دن چار پانچ بلیٹن مجھے کرنے تھے...... تو ابتدا سے ہی ٹف ڈیوٹی شروع ہو گئی تھی...... بہر حال...... جدوجہد کے بعد ہی صلہ بھی ملتا ہے۔ اب کام کرنے کا زیادہ مزہ آتا ہے۔"

"گویا نیوز میں مزہ نہیں آتا تھا؟"

"مارننگ شو کی وجہ سے بہت آسانیاں ہیں میری زندگی میں، جبکہ نیوز بہت مشکل تھی۔ میں کہہ سکتی ہوں کہ نیوز سے مارننگ شو تک کا سفر بہت مشکل تھا...... لیکن اب میں بہت خوش ہوں اور یہ خوشی ایک سال قبل ہی ملی ہے۔"

"ہوں...... گڈ...... اب اپنے بارے میں کچھ بتائیں؟"

"28 اپریل کو راولپنڈی میں پیدا ہوئی۔ بچپن راولپنڈی اسلام آباد میں ہی گزرا، ابتدائی تعلیم اور پھر ایم بی اے اسی شہر سے کیا۔ تعلق بھی اسلام آباد راولپنڈی سے ہی ہے اور الحمد اللہ...... میں شادی شدہ ہوں۔ ڈیڑھ سال ہو گیا ہے میری شادی کو، میرے میاں صاحب کا تعلق اس فیلڈ سے نہیں ہے بلکہ وہ بزنس مین ہیں۔ بہت سپورٹیو ہیں۔ سسرال میں بھی

سب بہت دلچسپی کے ساتھ میرا پروگرام دیکھتے ہیں الحمدللہ سب بہت اچھے ہیں...... میرے میاں صاحب میرے پروگراموں کو بہت پسند کرتے ہیں۔ مجھے بہت اچھے اچھے مشورے بھی دیتے ہیں اور کبھی بھی میرا پروگرام مس نہیں کرتے، لائیو نہ دیکھ سکیں تو ری میں دیکھتے ہیں اور ریپیٹ میں بھی نہ دیکھ سکیں تو پھر ''یوٹیوب'' پر دیکھتے ہیں کوئی دن ایسا نہیں کہ انہوں نے میرا پروگرام نہ دیکھا ہوگا۔''

''مزاجاً کیسی ہیں اور گھر داری سے کتنا لگاؤ ہے؟''

''اگر اپنے منہ میاں مٹھو نہ بنوں تو میں ہنس مکھ اور خوش مزاج ہوں...... اور اپنے بارے میں یہ ضرور کہوں گی کہ میں ایک میچیور لڑکی ہوں، سارے معاملات کو سامنے رکھ کر کوئی قدم اٹھاتی ہوں۔ بہت ساری باتوں کو دل میں رکھ لیتی ہوں یا درگزر کر دیتی ہوں اور کبھی کبھی شارٹ ٹمپر بھی ہو جاتی ہوں اور چیخنا چلانا شروع کر دیتی ہوں۔ روایتی خواتین کی طرح...... ویسے میری مما کہتی ہیں کہ تم ایک سمجھ دار لڑکی ہو، تب مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ میرے میاں صاحب کی رائے ہے کہ میں اپنی عمر سے زیادہ میچیور ہوں۔ کیونکہ آج کل کی لڑکیاں اتنی سمجھ دار نہیں ہوتیں جتنی تم ہو......

گھریلو امور کی پوچھیں تو سچ بتاؤں شادی سے پہلے گھریلو امور کیا ہوتے ہیں۔ کھانا پکانا، کپڑے دھونا گھر کے کام کاج کے بارے میں کچھ نہیں پتا تھا...... جبکہ شادی کے بعد ایک سال تک کافی عیاشی کی زندگی گزاری...... اور ابھی بھی کوئی پابندی نہیں ہے...... مگر اب تھوڑی دلچسپی اور ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے اور کوشش کرتی ہوں کہ خود ہی پکاؤں کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ دو تین بار میرے میاں صاحب فوڈ پوائزننگ کی وجہ سے کافی بیمار ہوئے...... تو میں نے سوچا کہ گھر پہ ہی کھانا پکنا چاہیے...... اور اب میری مما حیران ہوتی ہیں کہ میں کھانا کیسے پکا لیتی ہوں اور وہ بھی لذیذ کھانا...... اور اب میں مما کو گھریلو ٹوٹکے بتاتی ہوں تو وہ میری شکل دیکھ رہی ہوتی ہیں کہ یہ میری بیٹی ہما ہے۔''

''فارغ اوقات میں کیا کرتی ہیں؟''

''ٹی وی، فلم دیکھنا یا پھر اپنے ادھورے کام کرنا، گھومنے پھرنے کا بہت شوق ہے تو میاں کے ساتھ بہت گھومتی پھرتی ہوں، اور اپنی لائف کو بہت انجوائے کرتی ہوں...... مری بہت جاتی ہوں اور نادرن ایریاز کو ایکسپلور کیا۔ بہت مزہ آیا...... نیند کی بہت دھنی ہوں...... گیمز موبائل کی حد تک پسند ہیں۔''

''اور چلتے چلتے کچھ کہنا چاہیں گی؟''

''جی بالکل کہنا چاہوں گی...... اور وہ یہ کہ جو کچھ بھی میں آج ہوں، وہ اپنے والدین کی بدولت، کہ اللہ تعالیٰ کے بعد انہوں نے ہر موقع پر میرا ساتھ دیا، مجھے فخر ہے کہ میرے والدین نے میری ہر خواہش کو پورا کیا...... ایسا نہیں تھا کہ میں کوئی اکلوتی اولاد ہوں۔ ماشاء اللہ ہم پانچ بہن بھائی ہیں اور سب کے ساتھ میرے والدین کا مساوی سلوک ہے...... والدین کے بعد یعنی بابا کے انتقال کے بعد کافی حالات چینج ہو گئے اور زمین آسمان کا فرق آ گیا، میری مما نے بہت مشکلات بھی اٹھائیں پھر بھی مجھے بہت سپورٹ کیا...... میری فیملی ہی میرے لیے سب کچھ ہے۔

شادی سے پہلے میری ماں میری دوست تھیں اور شادی کے بعد میرے میاں...... اب میرے دو دوست ہیں، مما اور میاں...... اور میرے میاں مجھے بہت سپورٹ کرتے ہیں۔ میں شاید اتنا ڈیزرو بھی نہیں کرتی جتنا سب مجھے پیار کرتے ہیں۔ مجھے بہت اچھا سسرال ملا...... ایسا نہیں کہ کسی نے مجھے اکیلا چھوڑا ہو۔ بہت سارے لوگوں کا ہاتھ ہے۔ اس لیے میں سب کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی...... اور آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے موقع دیا کہ میں اپنے بارے میں کچھ بتا سکوں۔''

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے ''ہما ارسلان'' سے اجازت چاہی۔

Digitized by Google

مزنہ وقاص سے باتیں

شاہین رشید



(1) ''اصلی نام؟''

''مزنہ وقاص۔''

(2) ''پیار کا نام؟''

''گڑیا۔''

(3) ''تاریخ پیدائش؟''

''بیس نومبر 1983ء۔''

(4) ''قد؟''

''پانچ فٹ سات انچ۔''

(5) ''مادری زبان؟''

''اردو۔''

(6) ''تعلیمی قابلیت؟''

''ماسٹر ان لنگوئیسٹک (ماہر لسانیات)

(7) ''شادی؟''

''جی ماشاء اللہ سے سات سال ہو گئے ہیں۔''

(8) ''شوبز میں کون رکاوٹ بنا؟''

''جب فیلڈ میں آئی تو تھوڑے مسائل ہوئے اور شادی کے بعد شوبز میں کام کرنے کی اجازت ملی۔''

(9) ''بہن بھائی آپ کا نمبر؟''

''تین بہنیں اور دو بھائی۔ میں درمیان کی، یعنی دو بڑے دو۔۔ چھوٹے اور میں۔''

(10) ''بچپن کی بری عادت جو مشکل سے گئی؟''

''مٹی کھاتی تھی۔''

(11) ''پہلی کمائی کس کے ہاتھ میں رکھی؟''

''بارہ سو پہلی کمائی تھی جو کہ اپنی دادی کے ہاتھ

Digitized by Google

میں رکھی تھی، پاپا نے کہا کہ "دادی" گھر کی ہیڈ ہیں ان کے ہاتھ میں دو۔"

(12) "ایک ادھورا خواب جو اکثر دیکھتی ہوں؟"

"اپنا بیوٹی سیلون۔"

(13) "آپ کا سورج کب طلوع ہوتا ہے؟"

"فجر کے وقت الحمد للہ۔"

(14) "صبح کیا نہ ملے تو صبح نہیں ہوتی؟"

"چائے۔"

(15) "بھوک کو کم کرنے کے لیے کیا کھاتی ہیں؟"

"جو فوری طور پر مل جائے۔"

(16) "پاکستان کے لیے کیا سوچتی ہیں؟"

"تعلیمی نظام بہتر ہو اور میڈیکل، دوائیں فری ہو جائیں۔"

(17) "کس ملک کی شہریت کی خواہش ہے؟"

"کسی کی بھی نہیں ...... اپنا ملک زندہ باد۔"

(18) "زندگی تب بری لگتی ہے جب؟"

"جب اپنا کوئی بچھڑتا ہے۔"

(19) "مداح (فینز) ملتے ہیں تو آپ کا ردعمل؟"

"بہت اچھا لگتا ہے ...... کسی کو آٹوگراف دینے اور سیلفی سے منع نہیں کرتی اور فیملی کے سامنے اپنی اتنی عزت دیکھ کر بہت اچھا لگتا ہے۔"

(20) "کھیلوں سے ــــ آپ کا لگاؤ؟"

"کرکٹ، بیس بال اور بیڈمنٹن بہت پسند ہیں۔"

(21) "زندگی سے کیا سیکھا؟"

"بہت کچھ، امتحان دینا اور پھر اگلے امتحان کی تیاری کرنا۔"

(22) "اپنے آپ کو کس عمر کا تصور کرتی ہیں؟"

"جس عمر کی ہوں۔"

(23) "عشق اور محبت میں کیا فرق ہے۔ آپ کو عشق ہوا یا محبت؟"

"محبت میں امتحان اور توقعات ہوتی ہیں۔ جو پوری نہ ہوں تو انسان نا امید ہو جاتا ہے۔ لیکن "عشق" بے نیاز ہوتا ہے، ہر چیز سے بالاتر پھر موازنہ نہیں ہوتا کسی بھی چیز کا اور آپ بے لوث عشق کیے جاتے ہیں۔ مجھے پہلے اپنے میاں صاحب سے محبت تھی اور اب عشق ہے۔"

(24) "پہلی بار کیمرے کا سامنا کیا تو؟"

"تو بہت ہی زیادہ ڈری ہوئی تھی۔ زبان اور جسم ساتھ نہیں دے رہا تھا۔"

(25) "کبھی ہجوم میں تنہائی محسوس کی؟"

"بہت زیادہ، خاص طور پر کسی تقریب میں جاؤں تو امی اور پاپا بہت یاد آتے ہیں۔ تب لگتا ہے کہ میں بہت تنہا ہوں۔"

(26) "دل کی دھڑکن کب تیز ہوتی ہے؟"

"جب ٹوبی اور ٹونا ٹ لی کے بیچ میں پھنسی ہوئی ہوتی ہوں اور تب بھی جب کیمرے کا سامنا کرتی ہوں۔"

(27) "مارننگ شو کی میزبانی کا موقع ملے تو؟"

"تو ضرور کروں گی۔"

(28) "گھر میں سب سے زیادہ پیار کس سے ملا؟"

"سب سے ہی، لیکن امی اور پاپا سے زیادہ اور ان کے بعد اب تک اسٹیپ مام سے۔ میری امی اور میری اسٹیپ مدر دونوں ساتھ ہی رہتی تھیں۔"

(29) "بیمار ہونے پر اپنی بیماری کو سیریس لیتی ہیں؟"

"اگر اسپتال میں داخل ہونا پڑ جائے تب۔ ورنہ نہیں۔"

URDUTUBE
www.urdutube.com

Digitized by Google

(30) ''بھوک میں آپ کی کیفیت؟''
''بہت بری...... تب کسی کو نہیں پہچانتی میں۔''
(31) ''اگر ہوائی جہاز کا اوپن ٹکٹ ملے تو کہاں جائیں گی؟''
''سعودی عرب۔''
(32) ''اور اگر کسی کا بلینک چیک ملے تو؟ اماؤنٹ؟''
''صرف 1 کروڑ۔''
(33) ''سیاست میں آئیں تو کس کو فالو کریں گی؟''
''کسی کو نہیں...... بلکہ میری تو اپنی ایک تنظیم ہو گی۔''
(34) ''ایک نصیحت جو لڑکوں/لڑکیوں کو کرنا چاہتی ہیں؟''
''اپنے والدین کا احترام کریں جب تک وہ حیات ہیں۔ اپنی ساری باتیں اپنے مسائل انہی سے شیئر کیا کریں، کیونکہ دنیا میں ان سے زیادہ مخلص اور بےلوث رشتہ کوئی نہیں۔''
(35) ''جھوٹ کب بولتی ہیں؟''
''جب کسی کی بات چھپانی ہو اور پھر صحیح موقع دیکھ کر بتا دیتی ہوں کہ جھوٹ بولا تھا۔''
(36) ''گھر آ کر کیا دل چاہتا ہے؟''
''بھانجیوں کے ساتھ کھیلنے کا اور میاں کے ساتھ کھانا کھانے کا۔''
(37) ''کسی کی تعریف میں دو ہی جملے جو بولتی ہیں؟''
''ماشاءاللہ...... اللہ نظر بد سے بچائے۔''
(38) ''شوبز میں جگہ بنانے کے لیے کیا ضروری ہے؟''
''مجھے کچھ اندازہ نہیں...... اور نہ ہی پتا چل سکا آج تک۔''
(39) ''کس فنکار کے ساتھ رومینٹک سین کرنا اچھا لگتا ہے؟''
''فیصل قریشی کے ساتھ کرنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ وہ بہت نیچرل اداکار ہیں۔''
(40) ''خواہش ہے کہ ایسی فلم میں کام کروں جو؟''
''آرٹ مووی جو حقیقت کے قریب ہو یا پھر کارٹون مووی میں کام کرنا چاہوں گی۔''
(41) ''اپنی کمائی کا کتنے فیصد بچا لیتی ہیں؟''
''کچھ بھی نہیں، خالی ہاتھ آئے خالی ہاتھ سب کو جاتے دیکھا، اس لیے نیکیاں کرتی ہوں اور دعائیں سمیٹتی ہوں۔''
(42) ''ایک محبت جو بھول نہیں سکتی؟''
''جس سے محبت کی وہ اب میرے شوہر ہیں...... انہیں کیسے بھول سکتی ہوں۔''
(43) ''کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہوں؟''
''بچوں کو گھمانے، احسن طالش کی بیگم کے ساتھ چائے پینے اور اپنے میک اپ آرٹسٹ کے پاس جانے کے لیے ہر وقت تیار رہتی ہوں۔''
(44) ''کس کو دیکھے بغیر نیند نہیں آتی؟''
''اپنے میاں صاحب کو۔''
(45) ''گھر کے کس کمرے میں سکون ملتا ہے؟''
''اپنے کمرے میں۔''
(46) ''کسی کی سچی محبت دیکھنی ہو تو؟''
''ادھار مانگ لیں۔''
(47) ''کبھی کرائسس میں وقت گزارا؟''
''بہت وقت گزارا۔''
(48) ''بی پی ہائی ہو جاتا ہے جب؟''
''جب کوئی اپنی غلطی ماننے کے بجائے اس کی وضاحتیں دے رہا ہو یا دے رہی، ہو تب بی پی ہائی ہو جاتا ہے۔''
(49) ''آپ کے والٹ کی تلاشی لیں تو؟''
''تو ماں باپ کی تصاویر، اے ٹی ایم کارڈ اور

Digitized by Google

''دعا'' نکلے گی۔''

(50) ''نصیحت جو بری لگتی ہے؟''

''پیسے بچا کر رکھا کرو۔ برے وقت میں کام آئیں گے کیونکہ برے وقت میں کوئی نہیں دیتا۔''

(51) ''کھانے کی ٹیبل پہ کیا نہ ہو تو کھانے کا مزہ نہیں آتا؟''

''چٹنی، ہری مرچیں، اچار اور کالی مرچیں۔''

(52) ''کھانا کھانا کہاں پسند ہے، چٹائی، اپنا بیڈ یا ڈائننگ ٹیبل؟''

''چٹائی پہ دستر خوان بچھا کے سب کے ساتھ کھانے میں مزہ آتا ہے۔''

(53) ''انسٹا گرام، فیس بک اور انٹرنیٹ سے آپ کی دلچسپی؟''

''تھوڑی ہے، زیادہ نہیں۔''

(54) ''وقت کی پابندی کرتی ہیں؟''

''بہت زیادہ ...... اور افسوس ہوتا ہے ان فنکاروں پر جن کا انتظار کرو اور کہو کہ آپ نے مجھے پہلے کیوں بلایا تو فنکار بجائے سوری کرنے کے الٹا ڈھٹائی دکھاتے ہیں...... تب بہت دکھ ہوتا ہے۔''

(55) ''کوئی کھانا جو کئی دن تک کھا سکتی ہیں؟''

''دال چاول۔''

(56) ''کوئی ایسی تاریخ جو بھول نہیں سکتیں؟''

''چھ جنوری جب امی کا انتقال ہوا اور گیارہ فروری کو پاپا کا انتقال ہوا...... کیسے بھول سکتی ہوں۔''

(57) ''دوسرے ملک جا کر کیا بات نوٹ کرتی ہیں؟''

''ایسا اتفاق ہوا نہیں۔''

(58) ''اپنے لیے سب سے زیادہ قیمتی چیز کیا خریدی؟''

''اپنی گاڑی۔''

(59) ''کوکنگ سے آپ کا لگاؤ؟''

''بہت زیادہ ہے۔''

(60) ''کوئی کردار جو آپ کرنا چاہتی ہیں؟''

''پاگل کا۔''

(61) ''ایک کردار جو مقبول ہوا؟''

''بلو، جو سنو چندا میں کیا تھا۔''

(62) ''ایک کردار جو کر کے پچھتائیں؟''

''فائزہ کا کردار۔''

(63) ''آپ کی فیوچر پلاننگ؟''

''بیوٹی سیلون بنانا ہے۔''

(64) ''عورت حسین ہونی چاہیے یا نہیں؟''

''بیوٹی ود برین۔''

(65) ''ایک خواب جو بار بار دیکھتی ہیں؟''

''امی اور پاپا کو دیکھتی ہوں۔''

(66) ''پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟''

''جہاں بھی لذیذ پکوان ملیں وہی پسندیدہ ہو جاتی ہے۔''

(67) ''آئینہ دیکھ کر سوچتی ہیں؟''

''شکر کرتی ہوں رب کا۔''

(68) ''شادی میں پسندیدہ رسم/گفٹ یا کیش؟''

''مہندی کی رسم پسند ہے / اور کیش دینا چاہیے۔''

(69) ''ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟''

''امی کے ہاتھ کا پسند تھا...... اب تو خود ہی بنا لیتی ہوں۔''

(70) ''بدلہ لیتی ہیں؟''

''منحصر ہے اس بات پہ کہ کیا ہوا تھا۔''

(71) ''کب فریش ہوتی ہیں؟''

''پوزیٹو انرجی سے۔''

(72) ''اپنے تجربے سے سیکھتی ہیں یا دوسروں کے؟''

''دونوں سے سیکھتی ہوں۔''

Google

(73) ''آپ کو فوبیا ہے؟''
''فوبیا ہے، بارش سے اور اونچائی سے۔''
(74) ''دنیا میں اللہ کا بہترین تحفہ؟''
''ہر آتی جاتی سانس...... اللہ کا تحفہ ہے۔''
(75) ''لوگ ملتے ہیں تو کیا فرمائش کرتے ہیں؟''
''سیلفی کی۔''
(76) ''فلم، ماڈلنگ کی آپ نے؟''
''فلم میں ایک سین کیا تھا...... ماڈلنگ نہیں کی۔''
(77) ''بچپن کا کوئی کھلونا جو آج بھی محفوظ ہے؟''
''ایک گن ہے جو بھائی نے دی تھی۔''
(78) ''آپ کی عجیب وغریب خواہش؟''
''سیلون کھولنا مخنس (تیسری جنس) کے لیے۔''
(79) ''کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟''
''جی بالکل۔''
(80) ''دل کی سنتی ہیں یا دماغ کی؟''
''دل کی سن کر دماغ سے فیصلہ کرتی ہوں۔''
(81) ''اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی ہیں؟''
''جی بالکل۔''
(82) ''غصے میں پہلا لفظ؟''
''اللہ تمہارا بھلا کرے، اللہ تمہیں نیک ہدایات دے۔''
(83) ''بستر پہ لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے؟''
''نیند بہت دیر سے آتی ہے۔''
(84) ''رات سونے سے پہلے ایک کام جو ضرور کرتی ہوں؟''
''سب گزرے لوگوں کی بخشش کی دعا کر کے سونا اور اپنا سیل فون آف کرنا...... نہیں بھولتی۔''
(85) ''قسمت سے پیسہ ملتا ہے یا محنت سے؟''
''ہم تو محنت کا کھا رہے ہیں اور کچھ قسمت کا کھا رہے ہیں۔''
(86) ''پسندیدہ تہوار؟''
''عید کا۔''
(87) ''زندگی کب بری لگتی ہے؟''
''جب بوریت ہو، جب فارغ بیٹھی ہوں۔''
(88) ''مارننگ شو کیسے لگتے ہیں؟''
''بہت اچھے۔''
(89) ''کن چیزوں کے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟''
''سیل فون، ڈیوائس اور والٹ۔''
(90) ''آپ کی اچھی، بری عادت؟''
''اچھی عادت یہ کہ سب کی مدد کرتی ہوں۔ سب کا درد دل میں محسوس کرتی ہوں اور بری عادت غصہ زیادہ آتا ہے۔''
(91) ''شوبز میں نہ ہوتیں تو؟''
''پھر ٹیچنگ کے شعبے سے وابستہ ہوتی۔''
(92) ''ایک وہم جو پریشان کرتا ہے؟''
''رشتوں کو کھو دینے کا...... جیسے امی ابو کو کھو دیا۔''
(93) ''کیا چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟''
''چائے...... اور چاکلیٹ۔''
(94) ''خدا کی حسین تخلیق؟''
''بچے۔''
''اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟''
''میں ہر حال میں شکر کرنے والی بندی ہوں۔ اللہ جس حال میں رکھے شکوہ نہیں کروں گی۔''

سرورق کی شخصیت

ماڈل ------ اریج خان
میک اپ --- روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی ---- موسیٰ رضا

Digitized by Google

عمیرہ احمد

الف

حسن جہاں سے زندگی میں ایک غلطی سرزد ہوئی۔ لیکن وہ بھی معاف نہیں کی گئی، وہ بار بار خط لکھ کر اپنی غلطی کی معافی مانگتی ہے۔

ایک بچہ تواتر سے اللہ تعالیٰ کو خط لکھتا ہے اور اسے ایک درخت کے تنے میں رکھ دیتا ہے۔ وہ جواب کا منتظر ہے، ایک دن ماں بتاتی ہے کہ اس کے خط کا جواب آگیا ہے۔

ایک بوڑھا خطاط آیت کی خطاطی کر رہا ہے۔ یک دم اس پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اسے اپنے گرد روشنیوں کا ہالہ رقصاں نظر آتا ہے۔

قلب مومن انڈسٹری کا کامیاب ترین ڈائریکٹر ہے۔ اسے خود پر، اپنی صلاحیتوں پر پورا اعتماد ہے۔

مومنہ سلطان ایک باصلاحیت فنکارہ ہے لیکن اسے اب تک اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے کوئی موقع نہیں ملا ہے۔ انڈسٹری میں ہیروئنیں اس کے ٹیلنٹ سے خائف ہیں، وہ اسے آگے نہیں آنے دیتیں۔

مومنہ کا باپ سلطان میک اپ آرٹسٹ ہے۔ وہ اداکارہ حسن جہاں کا میک اپ مین رہ چکا ہے اور اس کا بہت بڑا مداح ہے۔ اب بیماری کی وجہ سے انڈسٹری سے آؤٹ ہے۔ مومنہ کی ماں ثریا بھی اپنے وقت کی اداکارہ ہے۔ اب انڈسٹری نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ مومنہ کے اکلوتے بھائی جہانگیر کے گردے جواب دے چکے ہیں، وہ ڈائیلاسس پر ہے۔


Digitized by Google

گردے کے ٹرانسپلانٹ کے لیے ایک بڑی رقم کی ضرورت ہے۔ مومنہ فلموں میں کام نہیں کرنا چاہتی۔ اسے فلم انڈسٹری پسند نہیں ہے لیکن مجبوراً یہ کام کرنا پڑ رہا ہے۔

پانچویں قسط



Digitized by Google

قلب مومن نئی فلم بنانے کا اعلان کرتا ہے تو داؤد مومنہ کی سفارش کرتا ہے۔ وہ آڈیشن کے لیے قلب مومن کے پاس جاتی ہے تو قلب مومن اس کو دوپٹہ اتارنے کے لیے کہتا ہے۔ مومنہ انکار کردیتی ہے تو وہ اسے اسٹوڈیو سے نکل جانے کے لیے کہتا ہے۔

مومنہ باہر نکل جاتی ہے تو اس کو یاد آتا ہے کہ وہ جہانگیر کی میڈیکل ٹیسٹوں کی فائل اسٹوڈیو میں بھول آئی ہے۔ وہ لوٹ کر جاتی ہے تو قلب مومن اس کے ساتھ بہت ہتک آمیز انداز میں پیش آتا ہے۔ جواباً مومنہ بھی کوئی لحاظ نہیں کرتی اور اسے کھری کھری سنا کر آئینہ دکھا دیتی ہے۔

وہ کہتی ہے کہ تمہارا کام چیپ اور تم اس سے زیادہ چیپ ہو، عورت کا جسم دکھا کر جو تم آرٹ کی خدمت کر رہے ہو، میں اس کا حصہ نہیں بننا چاہتی۔

طٰہٰ عبدالعلی اپنے باپ کو خط لکھتا ہے اور اس میں معذرت کے ساتھ اپنی تکلیف بھی بیان کرتا ہے۔ ان سے کہتا ہے کہ وہ طٰہٰ کو معاف کریں گے تو ہی اللہ اسے معاف کرے گا۔

قلب مومن کو اس کی ماں ایک خط دیتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ خط اللہ کی طرف سے آیا ہے۔ خط پڑھنے پر اسے علم ہوتا ہے کہ یہ خط اللہ نے نہیں اس کے دادا عبدالعلی نے لکھا ہے وہ اس سے ملنے آرہے ہیں۔

حسن جہاں کو جب اس بات کا علم ہوتا ہے کہ اس کا شوہر بھی واپس آرہا ہے تو وہ خوب بجتی سنورتی ہے اور بے تحاشا خوش ہوتی ہے۔ قلب مومن اپنی ماں کو اس طرح دیکھ کر مبہوت رہ جاتا ہے۔ اور ماں سے فرمائش کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ ایسی ہی رہے۔

مومنہ کو اس کی ماں سمجھاتی ہے کہ اسے عقل کرنی چاہیے تھی اور یوں انکار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ جہانگیر اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ وہ ایک دن ضرور سپر اسٹار بنے گی۔ جبکہ مومنہ اداکارہ نہیں بننا چاہتی۔ اسے خطاطی سے دلچسپی ہے۔ مومنہ اپنی انا کو مار کر اپنی دوست سے کہتی ہے کہ وہ ایک بار پھر داؤد سے بات کرلے۔ شاید قلب مومن اسے موقع دے دے، جہانگیر کی دن بدن بگڑتی حالت اسے مجبور کردیتی ہے کہ وہ قلب مومن سے کام مانگے۔

جبکہ دوسری جانب مومن نیہا کو پروپوز کرتا ہے اور ایک بے حد قیمتی انگوٹھی اسے پہناتا ہے۔ قلب مومن کے گھر ہونے والی ایک اور پارٹی میں پوری انڈسٹری مدعو ہوتی ہے۔ لیکن اچانک ملازم کسی نئے مہمان کو اپنے ساتھ لے کر آتا ہے جسے دیکھ کر قلب مومن ساکت رہ جاتا ہے۔

قلب مومن اللہ کو خط لکھتا ہے۔

کچھ دن بعد اس سے اس کے دادا ملنے آتے ہیں لیکن باپ نہیں آتا۔ عبدالعلی سے حسن جہاں کو علم ہوتا ہے کہ اس کا شوہر عبدالعلی کے پاس بھی نہیں گیا۔ عبدالعلی قلب مومن کے لیے ایک پینٹنگ لے کر آتے ہیں جو اُن کے ہاتھ کی بنی ہوتی ہے۔ کچھ دن بعد مومن ان سے نیہا کی ملاقات کرواتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ اس کی قریبی دوست ہے۔

مومنہ حالات سے مجبور قلب مومن کے پاس جاتی ہے لیکن وہ اسے بے عزت کر کے آفس سے نکال دیتا ہے۔ وہ انتہائی دکھی اور ٹوٹی حالت میں ماسٹر ابراہیم کے پاس جاتی ہے جہاں وہ شہید قرآن پاک کی مرمت کا کام کرتے ہیں۔ وہ اسے تسلی دیتے ہیں۔ وہیں اس کی ملاقات ایک لڑکی سے ہوتی ہے۔

مومنہ کو اس کی دوست کا فون آتا ہے وہ اسے آڈیشن کے لیے لاہور بھیجتی ہے جہاں اس کا آڈیشن کامیاب ہوجاتا ہے اور اسے ہالی وڈ کی فلم کے لیے سائن کرلیا جاتا ہے۔

قلب مومن اور نیہا کا جھگڑا ہوجاتا ہے جس کی وجہ ضوفی ہے۔ مومنہ کراچی واپس آتی ہے تو اسے داؤد کا رویہ عجیب لگتا ہے وہ گھر کے بجائے اسے مردہ خانہ لے آتا ہے۔

قلب مومن کے دادا حسنِ جہاں کو خط لکھ کر اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں۔

حسن جہاں کو اسپتال میں داخل کروانا پڑتا ہے۔ وہ بڑی مشکل سے زندگی کی طرف لوٹتی ہے۔ ٹھیک ہوجانے کے بعد وہ واپس پاکستان آجاتی ہے اپنی ماں کے پاس، قلب مومن سمجھتا ہے کہ وہ لوگ بہت امیر ہوگئے ہیں۔ اب آگے پڑھیے

Digitized by Google

میرے پیارے اللہ!

آج میں نے بابا کو پھر خواب میں ستارہ بنتے دیکھا۔ جیسے ترکی میں دیکھا تھا۔ تب میں نے اُنہیں ستارہ بنتے دیکھا تھا پھر وہ آگ کا گولہ بن گئے اور پھر وہ بہت دور چلے گئے۔ آج پھر میں نے اُنہیں دور جاتے دیکھا اور میری آنکھ کھل گئی۔ بابا کہیں بھی نہیں تھے۔ میں بہت اُداس ہوں۔ بہت زیادہ۔

میں نے آپ کو اپنے بارے میں نہیں بتایا۔ پہلے اپنے بارے میں بتانا چاہیے تھا۔ میرا نام قلبِ مومن ہے۔ آپ کو یاد ہے، کئی مہینے پہلے میں آپ کو خط لکھا کرتا تھا۔ تب میں ترکی میں رہتا تھا، اب پاکستان میں رہتا ہوں۔

آپ نے میرے خطوں کے جواب میرے دادا کو بھیجے تھے مگر دادا نے وہ مجھے نہیں دیے۔ آپ کو میں یاد آگیا نا؟ مجھے پتا تھا میں آپ کو یاد آجاؤں گا کیونکہ ممی کہتی ہیں، آپ کبھی کوئی چیز بھول ہی نہیں سکتے' خاص طور پر اُن کو جو آپ سے پیار کرتے ہوں اور میں تو آپ سے بہت پیار کرتا ہوں۔ دیکھیں میں نے آپ کے لیے ہارٹس بھی بنائے ہیں اور ہمیشہ کی طرح اس خط پر پھول اور ستارے بھی بنائے ہیں۔ رنگین پینسلوں سے۔

آپ سوچتے ہوں گے اگر میں آپ سے اتنا پیار کرتا ہوں تو پھر آپ کو اتنے مہینوں سے خط کیوں نہیں لکھ رہا۔ میں آپ کو بھولا نہیں ہوں، بس پاکستان آگیا ہوں لیکن آپ سے روز باتیں کرتا ہوں۔ رات کو بستر پر لیٹ کر سونے سے پہلے۔ جب سپارہ پڑھتا ہوں تب بھی آپ کو یاد کرتا ہوں اور جب نماز پڑھتا ہوں تب بھی۔ نماز ساری نہیں پڑھتا اور روز بھی نہیں پڑھتا، لیکن سیکھ رہا ہوں' آپ ناراض مت ہونا۔ مجھے پتا ہے آپ ناراض نہیں ہوں گے کیونکہ میں بچہ ہوں اور آپ بچوں سے بہت پیار کرتے ہیں۔

ہم اب بہت بڑے گھر میں رہتے ہیں لیکن میں یہاں خوش نہیں ہوں۔ مجھے اپنا اسکول یاد آتا ہے۔ اپنے دوست بھی اور وہ جنگل بھی جہاں میں آپ کے لیے خط چھوڑ کر آتا تھا۔ میں نے یہاں بھی ایک جگہ ڈھونڈ لی ہے جہاں میں آپ کے لیے خط چھوڑ سکتا ہوں۔

میرے پیارے اللہ! میرا دل پاکستان میں نہیں لگتا۔ یہاں اب ہمارے پاس وہ سب کچھ ہے جو میں آپ سے مانگتا تھا۔ بڑا سا گھر، گاڑی اور وہ ساری چیزیں جو میں آپ سے مانگتا تھا، وہ ممی مجھے بازار سے لے دیتی ہیں۔ سب کچھ مل گیا ہے مجھے لیکن ممی کھو گئی ہیں۔ یہ میری والی ممی نہیں ہیں۔ وہ الگ کمرے میں رہتی ہیں اور میں الگ کمرے میں اور کبھی کبھی وہ کئی کئی دن گھر بھی نہیں آتیں۔ مجھے لگتا ہے، اُنہیں اب میری اور بابا کی پروا نہیں ہے۔ وہ اب بابا کو مس نہیں کرتیں۔ اُن کے لیے پہلے کی طرح روتی بھی نہیں ہیں۔ اب بہت اچھے اور مہنگے کپڑے پہنتی ہیں۔ زیور بھی، میک اپ بھی اور وہ بہت ہنستی ہیں۔ بہت بہت زیادہ۔ کبھی کبھی وہ اتنا ہنستی ہیں کہ مجھے اُن پر غصہ آتا ہے۔

مجھے اُن کے بارے میں بہت ساری خراب باتوں کا بھی پتا چل گیا ہے لیکن وہ میری ممی ہیں اس لیے میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔ اس کے لیے سوری۔

مجھے اب بابا بہت یاد آتے ہیں اور دادا بھی۔

میرے پیارے اللہ! کیا آپ مجھے اُن دونوں کے پاس ترکی نہیں بھیج سکتے۔ میرا دل ممی کے پاس نہیں لگتا۔ وہ مجھے ایک چڑیل لگتی ہیں۔ مجھے پتا ہے مجھے ممی کو یہ نہیں کہنا چاہیے لیکن مجھے اُن پر غصہ آتا ہے۔ مجھے لگتا ہے انہوں نے میرے بابا کو جان بوجھ کر ناراض کیا ہے۔ اگر وہ ترکی میں رہتیں تو بابا مل جاتے۔ میں خود ڈھونڈ لیتا اُن کو۔ مجھے ہر کھو جانے والی چیز کو ڈھونڈنا آتا ہے۔

میرے پیارے اللہ! میں نے آپ سے کہا تھا، آپ میری ممی اور بابا کی صلح کروادیں اور ہم سب اکٹھے رہیں لیکن آپ نے مجھے جو جواب بھیجا تھا، وہ دادا نے مجھے نہیں دیا۔ اور اب دادا بھی کہیں گم ہو گئے ہیں۔

میں بہت اُداس ہوں یہاں پاکستان میں۔ آپ کو خط اس لیے لکھ رہا ہوں تا کہ آپ میرے لیے کچھ کریں۔

Digitized by Google

کیا آپ میرے پر اُگا سکتے ہیں تاکہ میں اُڑ کر ترکی چلا جاؤں اور ممی مجھے ڈھونڈتی رہ جائیں؟ مجھے پتا ہے آپ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ آپ کب مجھے اپنے بابا اور دادا سے ملوائیں گے؟ جلدی ملوادیں۔ میں بڑا ہو گیا تو وہ مجھے نہیں پہچانیں گے۔ اب میں سونے لگا ہوں۔ آپ بھی سو جائیں۔

آپ کا قلبِ مومن

☆☆☆

بستر پر لیٹے رات کے اُس پچھلے پہر اُس کا جسم کچھ دیر جھٹکے کھاتا رہا تھا' یوں جیسے وہ نیند میں کسی چیز سے ڈر رہا تھا اور پھر یک دم اُس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ کانپ رہا تھا۔ کمرے میں نائٹ بلب کی روشنی تھی اور بہت دور سے کسی میوزک کی آواز آرہی تھی۔ کچھ عورتوں اور مردوں کے قہقہوں کی بھی۔

قلبِ مومن بستر سے نکل آیا۔ اُس نے کمرے کی لائٹ آن کرلی تھی۔ باہر سے آنے والی موسیقی اور اُن قہقہوں کی آوازوں کا اب وہ عادی ہو چکا تھا۔ وہ اُن کی وجہ سے نہیں جاگا تھا اور نہ ہی وہ آوازیں کبھی اُس کی نیند کو روک سکتی تھیں۔

وہ بہت بڑا اور آرام دہ کمرہ تھا جس میں وہ اس وقت موجود تھا۔ وہاں بہترین فرنیچر تھا اور کوئی بھی بچہ اُس کمرے میں رہ کر خوش ہوتا۔ اپنے بستر سے اُٹھ کر وہ کمرے میں دیوار کے ساتھ پڑی ایک اسٹڈی ٹیبل پر جا بیٹھا۔ دراز کھول کر اُس نے ایک رائٹنگ پیڈ نکالا اور پھر لیمپ آن کرلیا۔ کاغذ پر وہ کچھ لکھنے لگا تھا۔ وہی سب کچھ جو وہ رات کے اس پہر اس طرح خواب میں ڈر جانے پر لکھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے نام ایک اور خط۔ وہ خط شاید اُس کی روح میں کہیں بہت پہلے لکھے گئے تھے جواب اُس پر اُتر رہے تھے۔ قلبِ مومن کو ہر بات پر صرف اللہ یاد آتا تھا۔ خوش ہونے پر بھی، خفا ہونے پر بھی، کوئی چیز مل جانے پر بھی اور کچھ کھو دینے پر بھی، کسی چیز کی طلب ہونے پر اور کسی چیز کو پا نہ سکنے پر بھی۔

اُس کا خاندان کئی نسلوں سے اللہ کے ناموں کی خطاطی کرتا آیا تھا، پر قلبِ مومن کو خطاطی نہیں کرنا تھی' خط لکھنے تھے۔ اللہ کے ناموں اور اُس کی آیات کی خوبصورتی نہیں بیان کرنا تھی۔ اُس سے باتیں کرنا تھیں اور باتوں کا وہ سلسلہ ترکی سے پاکستان آکر رُک گیا تھا۔ کئی مہینے رُکا رہا تھا اور پھر دوبارہ شروع ہو گیا تھا۔ وہ تنہا رہ گیا تھا اور اُداس بھی۔ اور ناخوش بھی اور ناراض بھی اور اُس کے پاس اللہ کو لکھنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ پہلے اُس کے خطوں میں شکوے اور شکایتیں نہیں ہوتی تھیں صرف ضرورتیں ہوتی تھیں۔ اب ضرورتیں پوری ہو گئی تھیں تو اُن کی جگہ شکووں اور شکایتوں نے لے لی تھی۔ مگر مومن کو اللہ سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ اُس کے سارے شکوے حسنِ جہاں سے تھے۔ اُس کی ممی سے۔

☆☆☆

وہ بڑی احتیاط سے گھر کے مین دروازے سے عقبی لان میں نکلا تھا۔ وہاں ایک درخت پر اُس نے وہ لیٹر باکس کچھ ہفتوں پہلے ہی اس طرح رات کو لٹکایا تھا تاکہ کسی کو اُس کے بارے میں پتا نہ چل سکے۔ عقبی لان کی باڑھ کے پار سوئمنگ پول کے گرد اس وقت وہ پارٹی جاری تھی جس کا شور اُس کے کمرے تک آرہا تھا اور باہر لان میں وہ شور بہت بڑھ گیا تھا۔

قلبِ مومن کو اُس باڑھ کے سامنے سے گزر کر لان کے آخر میں آم کے اُس درخت تک جانا تھا جس پر اُس نے وہ لیٹر باکس لٹکایا ہوا تھا۔ اُس قد آدم باڑھ کے سامنے سے گزرتے ہوئے مومن نے باڑھ کے درمیان جگہ جگہ چھوٹے بڑے سوراخوں سے پول کے اردگرد موجود مردوں اور عورتوں کو شراب کے گلاس پکڑے، جھومتے دیکھا وہ وہاں رُکا نہیں۔

Google

آم کے درخت کے نیچے اندھیرا تھا۔ اُس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا لفافہ اپنے دانتوں میں دبالیا اور درخت پر چڑھنے لگا۔ اُسے اُس پر چڑھنے کی اچھی خاصی پریکٹس ہو گئی تھی۔ وہ چند ہی منٹوں میں درخت کی ایک اونچی والی شاخ پر تھا اور اُس شاخ پر بیٹھ کر اُس نے سوئمنگ پول کے دوسری جانب دیکھا۔ وہاں بہت سارے مرد اور عورتیں جھوم رہی تھیں لیکن ناچنے والی عورت صرف ایک تھی اور وہ حسنِ جہاں تھی۔ تیز بے ہنگم موسیقی کے ساتھ ناچتے ہوئے وہ مومن کو بہت بُری لگی اور اُس نے اُس سے نظریں چرائیں اور اپنے سر پر موجود ایک دوسری شاخ کے ساتھ بندھے لیٹر باکس میں اپنے منہ میں دبا لفافہ نکال کر ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اُس کا پاؤں یک دم سلپ ہوا۔ اُس نے شاخ پکڑ کر سنبھلنے کی کوشش کی۔ وہ ناکام ہوا اور پھر خوف کے عالم میں اُس نے اپنے آپ کو اُس اوپر کی شاخ سے نیچے گرتے پایا۔ اُس نے بے اختیار ایک چیخ ماری تھی۔ زمین پر گرتے ہوئے اُس نے ہوا میں اُڑتے اُس لفافے کو دیکھا جو ایک لمحہ کے لیے باہر گیٹ پر لگی روشنیوں میں آسمان سے نیچے گرتا نظر آیا تھا اور پھر قلبِ مومن کو ہوش نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

اُس کی آنکھ جب دوبارہ کھلی تو وہ اپنے بستر میں تھا اور اُس کا بازو ایک پلاسٹر میں لپٹا ہوا تھا۔ درد کی ایک لہر اُس کے بازو میں اُٹھی تھی مگر اُس سے زیادہ گہری وہ شرمندگی تھی جو اُسے حسنِ جہاں کو اپنے اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھے اُن خطوں کو پڑھتے دیکھ کر ہوئی تھی۔

"آپ نے میرے لیٹرز کیوں پڑھے؟ یہ آپ کے لیے نہیں تھے۔" وہ بے اختیار ماں پر خفا ہوا تھا اور اُس کی آواز پر کرسی پر بیٹھی حسنِ جہاں نے پلٹ کر اُسے دیکھا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں کوئی ایسا تاثر تھا جس نے قلبِ مومن کے غصے اور خفگی کو پل بھر میں غائب کیا تھا۔

"تم دادا کے پاس جانا چاہتے ہو؟" وہ کرسی سے اُٹھ کر اُس کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔

"نہیں۔ میں بابا کے پاس جانا چاہتا ہوں۔" اُس نے لیٹے لیٹے ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

وہ اُسے دیکھتی رہی پھر اُس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ "تم اُن کے پاس نہیں جاسکتے۔"

"وہ تو آسکتے ہیں۔" قلبِ مومن نے بے ساختہ کہا تھا۔

"وہ بھی نہیں آسکتے۔" اُسے گمان ہوا اُس نے حسنِ جہاں کی آنکھوں میں پانی دیکھا تھا۔ پانی ہی ہوسکتا تھا آنسو تو نہیں ہوسکتے تھے۔

"کیوں نہیں آسکتے؟" وہ بے چین ہوا۔ "اس لیے نہیں آسکتے کیونکہ آپ سے ایک غلطی ہوئی ہے اور وہ آپ کو معاف نہیں کرسکتے۔" مومن کو جیسے کئی بار دہرائی بات یاد آئی۔

حسنِ جہاں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ "تمہارے بابا اللہ کے پاس چلے گئے ہیں۔"

"مجھے پتا ہے اسی لیے میں نے اللہ کو لیٹرز لکھے ہیں۔" قلبِ مومن نے بھی اُسی اطمینان سے کہا تھا۔

وہ اُس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اُس نے مومن کا وہ ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا تھا جو پلاسٹر میں جکڑا ہوا نہیں تھا۔

"تم بابا کو ستارہ بنتے دیکھتے تھے نا؟ تمہارے بابا واقعی ستارہ بن گئے ہیں۔ آنہیں سکتے وہ اب ہمارے پاس۔" قلبِ مومن نے اُس کی آواز بڑی دقت سے سنی تھی۔ وہ بہت مدھم آواز میں بول رہی تھی یوں جیسے وہ یہ سب کہنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ دہرانا بھی نہیں چاہتی تھی۔

"ہم بھی نہیں جاسکتے؟" قلبِ مومن اُلجھا۔

"تم نہیں۔ شاید میں چلی جاؤں۔" اُس نے ماں کو کہتے سنا، وہ یک دم خوف کے عالم میں اُٹھ کر ماں سے لپٹا تھا۔ حسنِ جہاں سے نفرت کرنے کے باوجود، ناراض اور خفا ہونے کے باوجود۔

Digitized by Google

''میں آپ کو کبھی جانے نہیں دوں گا۔'' وہ حسنِ جہاں سے لپٹ کر کہتا جا رہا تھا۔
''تم دادا کے پاس چلے جاؤ مومن۔'' وہ اُس سے کہہ رہی تھی۔ مومن اُس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا مگر اندازہ کر سکتا تھا۔ وہ اس بار آنسو بہا رہی تھی' پانی نہیں۔
''نہیں، میں دادا کے پاس نہیں جاؤں گا، آپ کے ساتھ رہوں گا۔'' اُس نے ماں سے وعدہ کیا تھا یا شاید اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا۔

☆☆☆

''کوئی جواب آیا؟''
''نہیں۔''
''میں نے پہلے ہی کہا تھا۔''
''تم کو یقین ہے وہ خط اللہ کو مل گئے ہوں گے؟''
''ہاں مل تو گئے ہوں گے' اللہ کو سب مل جاتا ہے۔''
''کتنے خط بھیجے ہیں تم نے اللہ کو؟''
''تیس۔''
''یہ تو بہت سارے ہیں۔''
''اللہ کو جواب تو دینا چاہیے۔''
''ہاں ٹیچر کہتا تھا۔ اللہ سب کی سنتا ہے اور سب کو جواب بھی دیتا ہے۔'' مومن نے اس بار بے حد یقین سے کہا تھا۔ وہ اُس دن اسکول کے گراؤنڈ میں اپنے دو قریبی دوستوں کے ساتھ بیٹھا اپنا یہ راز شیئر کر رہا تھا جو وہ عام طور پر نہیں کرتا تھا اور وہ دونوں بچے بے حد پرجوش اور متاثر ہوئے تھے اُن خطوں کے بارے میں بات کر رہے تھے جو مومن نے اللہ کو بھیجے تھے۔
''تم لوگ کسی کو بتانا مت۔'' اُن سے بات کرتے کرتے مومن کو ہر بار کی طرح اُنہیں خبردار کرنا یاد تھا۔ دونوں نے بیک وقت نفی میں سر ہلا کر اُس سے راز نہ کھولنے کا وعدہ کیا تھا۔
''مومن اگر اللہ نے کبھی بھی جواب نہ دیا تو؟'' اُن دونوں بچوں میں سے ایک بچی ردا نے اُس سے پوچھا تھا۔
''وہ ضرور دیں گے۔'' مومن نے بے حد یقین اور اعتماد سے کہا تھا۔
''ہاں مومن! لیکن اگر جواب نہ آیا تو؟'' اس بار دوسرے بچے بلال نے بھی جیسے اُس بچی کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔
''پھر میں اللہ سے خفا ہو جاؤں گا۔'' مومن نے یک دم اپنا پلاسٹر میں لپٹا بازو گود میں رکھتے ہوئے کہا۔
''اور خفا ہو کر پھر تم کیا کرو گے؟'' ردا کو پھر تجسس ہوا۔ قلب مومن اُن کے لیے پراسرار چیز تھا۔
''میں دوبارہ اللہ کو کبھی خط نہیں لکھوں گا۔'' اُس نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ دونوں بچوں کو جیسے تسلی نہیں ہوئی۔
''بس؟'' ردا نے دوبارہ پوچھا۔
''ہاں اور میں نماز بھی نہیں پڑھوں گا۔ دعا بھی نہیں کروں گا۔'' مومن نے جیسے مزید بتایا۔
''بس؟'' اُن بچوں کی جیسے ابھی بھی تسلی نہیں ہو پا رہی تھی۔
''اور ہمیشہ جھوٹ بولوں گا اور بُرے کام کروں گا۔'' مومن نے اس بار پہلے سے بھی زیادہ سنجیدگی سے کہا۔
ردا اور بلال نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ردا نے بڑی ہمدردی سے اپنے لنچ باکس میں سے لنچ کھاتے ہوئے اُس سے کہا۔

Digitized by Google

''میں دُعا کروں گی، تمہارے لیٹر کا جواب ضرور ملے۔''

ردا نہ بھی کہتی تو بھی مومن کو یقین تھا، اُسے اللہ تعالیٰ خط کا جواب ضرور دیں گے۔ وہ دیر کر سکتے ہیں لیکن اُسے نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔

☆☆☆

''آپ نے پہلے کبھی میری برتھ ڈے اس طرح سیلیبریٹ نہیں کی۔'' غبارے پکڑے مومن ہنستا کھلکھلاتا حسنِ جہاں کے پاس آیا تھا جو پول سائیڈ پر ہونے والی مومن کی اُس برتھ ڈے پارٹی کے سارے انتظامات کو خود دیکھ رہی تھی اور مومن حیران تھا لیکن حیران سے زیادہ خوش تھا۔

درخت سے گرنے والے حادثے کے بعد اچانک ہی حسنِ جہاں اُسے زیادہ توجہ دینے لگی تھی اور مومن کو لگتا تھا جیسے اُس کی ممی واپس مل گئی ہیں۔ وہی والی ممی جو ترکی میں تھیں۔

''ہاں، بس اس بار دل چاہا، تمہاری برتھ ڈے بڑی دھوم دھام سے مناؤں تاکہ تمہاری مجھ سے ناراضی ختم ہو جائے۔'' حسنِ جہاں نے اُسے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا تھا۔ مومن نے پرفیوم کی تیز خوشبو محسوس کی۔ اُس کا دل چاہا وہ حسنِ جہاں سے کہے اُسے اپنی ماں کی خوشبو چاہیے۔ جب وہ ترکی میں پرفیوم نہیں لگاتی تھی اور وہ اُس کو اپنے ساتھ لپٹاتی تھی تو مومن کو حسنِ جہاں کے وجود سے اُٹھنے والی خوشبو عجیب انداز میں محسوس ہوتی تھی۔ اُس کے نرم گرم وجود سے پھوٹتی ہوئی حسنِ جہاں کی اپنی خوشبو جسے مومن لاکھوں خوشبوؤں میں بھی پہچان سکتا تھا۔

''تمہارے دوست کب آ رہے ہیں؟'' حسنِ جہاں نے اُسے ساتھ لپٹاتے ہوئے پوچھا۔

''پتا نہیں، میں ویٹ کر رہا ہوں۔'' مومن نے اسی طرح اُس سے لپٹے لپٹے کہا۔ بڑے عرصہ کے بعد وہ اس طرح اُس کے ساتھ تھی اور کوئی نہیں تھا۔ سلطان بھی نہیں جو ہر وقت حسنِ جہاں کا سایہ بنا رہتا تھا۔

''سنو مومن!'' وہ اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ ''اپنے دوستوں کے سامنے میرا نام۔'' مومن نے روانی میں اُس کی بات کاٹی۔

''جی نام لوں گا، آپ کو حسنِ جہاں کہوں گا ممی نہیں کہوں گا مجھے یاد ہے، نانی نے جو بھی کہا تھا۔'' اُس نے ممتاز کا پڑھایا ہوا سبق دہرایا تھا۔

''نہیں مومن! میرا نام مت لینا مجھے ممی کہنا۔'' مومن نے یک دم حیران ہو کر اُس سے لپٹے لپٹے سر اُٹھا کر حسنِ جہاں کو دیکھا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ پہلی بار مومن کو اُس کا میک اپ بھی اچھا لگا تھا۔ وہ اُس میک اپ زدہ چہرے میں بھی اپنی ماں کو پہچان پا رہا تھا۔

''مومن۔'' وہ ردا کی آواز پر یک دم پلٹا تھا۔ وہ اپنے پیرنٹس کے ساتھ پول کی دوسری سائیڈ پر کھڑی ہاتھ ہلا رہی تھی۔ مومن نے یک دم حسنِ جہاں کا بازو کھینچتے ہوئے کہا۔

''میرے دوست آ گئے۔ آئیں میں آپ کو ملواؤں۔'' وہ حسنِ جہاں کو جیسے بے حد خوشی اور جوش کے عالم میں کھینچتے ہوئے پول کی دوسری سائیڈ پر لے گیا تھا جہاں ردا اپنے ماں باپ کے ساتھ کھڑی تھی اور اُس کے ماں باپ کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ حسنِ جہاں کو دیکھتے ہی غائب ہوئی تھی۔

''ہمیں پتا ہی نہیں تھا کہ قلبِ مومن آپ کا بیٹا ہے۔'' انہوں نے ابتدائی علیک سلیک کے بعد کھڑے کھڑے حسنِ جہاں سے کہا۔

''مومن کے پاپا سے بھی ملوائیں۔'' مومن نے ردا کی ممی کو کہتے سنا اور اُس نے حسنِ جہاں کا چہرہ دیکھا جس پر بادل آئے تھے۔ گہرے، کالے بادل اور اُن بادلوں نے اُس خوشی اور حسنِ جہاں کی مسکراہٹ کو سب سے پہلے نگلا تھا۔ مومن نے پلٹ کر ردا کی ممی اور بابا کو دیکھا، وہ اُنہیں اپنے بابا کے بارے میں بتانا چاہتا تھا سب

Digitized by Google

کچھ۔ اُن کی کیلی گرافی کے بارے میں اُن کے رقص کے بارے میں اور اُس محبت کے بارے میں جو وہ مومن سے کرتے تھے اور مومن کی ممی سے بھی۔ لیکن وہ بتا نہیں سکا۔ ردا کی ممی اور بابا اُس کی طرف متوجہ نہیں تھے۔ وہ بچہ تھا۔ اُن کو بڑوں سے جواب چاہیے تھا اور بڑوں کے پاس اس وقت جو بھی جواب تھا، وہ اُنہیں جھوٹ لگا تھا۔

☆☆☆

وہ مومن کی زندگی کی سب سے یادگار سالگرہ تھی۔ اُس سالگرہ پر اُس کے سب دوست آئے تھے اور اُسے بہت سارے تحفے ملے تھے۔ اتنے تحفے کہ اُس کا کمرہ بھر گیا تھا اور ان میں سے بہت سارے تحفے وہ تھے جو حسن جہاں نے اُسے دیے تھے اور ممی اُس شام سارا وقت مومن کے ساتھ رہی تھیں۔ اُس کے دوستوں کے ساتھ کھیلتی رہی تھیں۔ وہ قلب مومن کے لیے ایک خوابوں جیسا دن تھا۔ خوبصورت خوابوں جیسا۔ وہ زندگی ویسی ہی گزارنا چاہتا تھا جیسی وہ ایک شام تھی۔

اگلا دن اُس کی زندگی کے بھیانک دنوں میں سے ایک تھا۔ اسکول میں اُسے اپنے کلاس فیلوز اور دوستوں کے رویے میں کچھ عجیب تبدیلی محسوس ہوئی تھی۔ اُن کے انداز میں ایک عجیب سی ٹھنڈک تھی یا شاید حقارت۔ وہ بچہ تھا، لہجے پہچان سکتا تھا۔ لیبل نہیں لگا سکتا تھا۔ کیونکہ اُس کے پاس اس عمر میں وہ لیبل نہیں تھے جو صرف بڑوں کو تجربہ اور زندگی دیتی ہے اور جس کے بل بوتے پر وہ کسی کی زندگی بھی داغ دار کر سکتے تھے۔

"میں کب سے تم دونوں کو ڈھونڈ رہا ہوں، مجھے چھوڑ کر یہاں لنچ کرنے آگئے تم۔" وہ لنچ بریک میں ردا اور بلال دونوں کو ڈھونڈتا رہا تھا اور بالآخر اُس نے اُنہیں گراؤنڈ کی ایک بینچ پر دیکھ ہی لیا تھا۔ وہ اُن دونوں کے درمیان بینچ پر بڑے گھمنڈ سے آکر بیٹھا تھا اور اُس نے اپنا لنچ باکس کھولا تھا اور تبھی اُس نے دائیں بائیں بیٹھے بلال اور ردا کو بینچ سے کھڑے ہوتے دیکھا۔ مومن نے حیرانی سے اُنہیں دیکھا۔

"اب ہم بھی تمہارے ساتھ لنچ نہیں کریں گے۔" ردا نے کچھ خفگی سے اُس سے کہا تھا۔ "کیوں؟" وہ حیران ہوا۔

"بلکہ بات بھی نہیں کریں گے۔"

"ساتھ بھی نہیں بیٹھیں گے۔"

اُس کے سوال کا جواب نہیں ملا تھا البتہ اُن دونوں نے کسی میکانیکی انداز میں جملے دہرانے شروع کیے تھے۔

وہ اُن کا منہ دیکھنے لگا تھا۔ لنچ کرنا وہ بھول گیا تھا۔ "کیوں؟"

"کیونکہ تم جھوٹ بولتے ہو۔ تمہارے کوئی بابا نہیں ہیں۔" ردا نے اُسی انداز میں کہا تھا۔

"And your mom is a bad woman." (تمہاری ماں بری عورت ہیں)۔

بلال نے بے حد حقارت سے کہا۔ مومن کا چہرہ سرخ ہوا۔

"No she is not....." (نہیں وہ ایسی نہیں ہیں)۔

"Yes she is..." بلال نے اُسی انداز میں کہا۔ "میری ممی نے بتایا ہے کہ تمہاری ممی ڈانسر ہے اور بُری عورت ہے۔"

ردا نے اُس کے سامنے کھڑے کھڑے ہاتھ کے اشارے سے اُسے بے حد غصے سے بتایا تھا۔ قلب مومن کو یک دم لگا وہ اُن دونوں کے سامنے چیونٹی بن گیا تھا۔ کل شام کا ہاتھی نہیں رہا تھا۔ حقیر، معمولی ہو گیا تھا۔ اُس نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ اُس کے حلق سے آواز نہیں نکلی۔

"اللہ تو کبھی تمہارے خطوں کے جواب نہیں دے گا کیونکہ تمہاری ممی ایک بُری عورت ہے۔" ردا نے جاتے جاتے اُس سے کہا تھا۔

Digitized by Google

قلبِ مومن کانپنے لگا تھا یوں جیسے اُسے بخار ہوگیا تھا یا اُس نے کوئی بھوت دیکھ لیا تھا۔ اُس کے دوست اب اُسے چھوڑ کر جا رہے تھے اور اُسے لگ رہا تھا، اُسے ساری دُنیا نے چھوڑ دیا تھا اور یہ سب اُس کی ممی کی وجہ سے ہوا تھا۔ حسنِ جہاں کی وجہ سے۔ اُس کے ڈانس کرنے کی وجہ سے۔ اُسے حسنِ جہاں سے شدید نفرت محسوس ہوئی تھی۔

☆☆☆

''مجھے دادا کے پاس جانا ہے، مجھے آپ کے پاس نہیں رہنا۔ مجھے آپ کے گفٹس بھی نہیں چاہئیں۔ آپ بھی نہیں چاہئیں۔''

''آئی ہیٹ یو ممی! یو آر آ بیڈ وومن۔''

اُس دن گھر آ کر وہ بلک بلک کر رو رہا تھا۔ اُس نے کمرے میں پڑا ہوا اپنا ہر تحفہ، ہر کھلونا توڑ دیا تھا۔ حسنِ جہاں نے اُسے سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔ وہ مکے اور لاتیں چلانے لگا تھا یوں جیسے وہ اپنا سارا غصہ، سارا زہر ماں کو دے دینا چاہتا تھا۔ حسنِ جہاں نے بالآخر اُسے چھوڑ دیا تھا۔ وہ عدالت میں کھڑی کسی مجرم کی طرح قلبِ مومن کی عدالت میں کھڑی اُسے دیکھتی رہی۔

''ممی! آئی ہیٹ یو۔''

''ممی! آئی ہیٹ یو۔''

وہ روتا بلکتا کہتا جا رہا تھا۔

''مجھے دادا کے پاس جانا ہے۔ مجھے ترکی جانا ہے۔''

حسنِ جہاں نے اُس کے سامنے سر جھکا لیا تھا۔ پیار اُس کی قسمت میں ہی نہیں تھا، نہ ہی اُس کے ہاتھ کی لکیروں میں، طٰہٰ کا تھا تو کیسے مل جاتا، قلبِ مومن کا تھا تو کیسے رہ جاتا۔

☆☆☆

کیا غم گسار آواز تھی! کیا مہربان وجود تھا! کیا وہم و گمان سے پرے کا معجزہ تھا۔ فیصل تھا وہ جو ثریا سے اندر کمرے میں بیٹھا باتیں کر رہا تھا اور اُس کی آواز تھی جس کو سچ ماننے پر وہ تیار نہیں تھی اور اب دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی اُسے ہونقوں کی طرح دیکھتی وہ جیسے اُسی کالج گراؤنڈ میں آن کھڑی ہوئی تھی جہاں وہ دونوں روز ملتے تھے اور اُس کے آنے پر وہ روز اسی طرح کھڑا ہوتا تھا جس طرح اس وقت کھڑا ہو گیا تھا۔

''السلام علیکم۔'' اس نے کہا۔

مومنہ کو اچانک یاد آیا، یہ فیصل کے بجائے اُسے کہنا چاہیے تھا۔ باہر سے وہ اندر آئی تھی۔ ''وعلیکم السلام۔'' مدھم آواز میں اُس پر نظریں جمائے وہ بولی تھی۔

''میں نے کہا تھا نا مومنہ تمہیں دیکھ کر خوش ہو جائے گی۔ بیٹا بیٹھو ذرا میں فیصل کے لیے چائے لے آؤں۔''

ثریا نے اُس کا چہرہ دیکھا پھر فیصل کا اور پھر وہ اُس سین میں سے نکل گئی تھی۔ اسٹیج کی ایک سمجھ دار اداکارہ کی طرح۔

وہ دونوں ایک دوسرے کو خاموشی کے عالم میں اور بے وقوفی کی کیفیت میں دیکھتے رہے۔ جذباتی ہوئے بغیر۔ پرانے دوستوں کی طرح۔ جو لفظوں سے زیادہ خاموشی کو پڑھتے ہیں اور لفظوں کے درمیان آنے والے خاموشی کے وقتوں کا انتظار کرتے ہیں کیونکہ جو اُن میں کہا جاتا ہے، وہ لفظوں میں کہنے کی ہمت نہیں ہوتی۔

''اتفاق سے پتا چلا مجھے جہانگیر کے بارے میں۔ اتفاقاً بات ہوئی تو۔ بڑا افسوس ہوا مجھے۔۔ میں سمجھتا تھا وہ ٹھیک ہو رہا تھا۔'' وہ بالآخر بولا تھا۔ ٹراؤزرز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے۔ نظریں اُس پر جمائے۔

''ہاں۔ ہم بھی یہی سمجھ رہے تھے۔ بیٹھو۔'' مومنہ کو یقین نہیں آیا وہ اُس سے جذباتی ہوئے بغیر کیسے بات کر

Digitized by Google

پارہی تھی۔ وہ واپس مڑ کر اُسی کرسی پر بیٹھ گیا تھا جہاں پہلے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر اُس کرسی پر بیٹھ گئی تھی جہاں ثریا بیٹھی ہوئی تھی۔

خاموشی کا ایک اور لمبا وقفہ آیا پھر اُس نے کہا۔ "مجھے یقین نہیں تھا، تم آؤ گے۔"

"اتنا کمزور تعلق تو نہیں تھا ہمارا کہ دُکھ سکھ میں بھی نہ مل پاتے۔" اُس نے تامل کیے بغیر کہا تھا۔ مومنہ نے سر جھکا لیا۔

اُس کی آواز کی حلاوٹ اُسے توڑنے لگی تھی۔ ہمیشہ کی طرح۔ اور مہربانی اُسے پگھلانے لگی تھی۔

اُس کا دل چاہا تھا وہ اُس کے وجود میں چھپ جائے۔ ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے۔

"بہت بدل گئی ہو تم۔ چار ساڑھے چار سال بعد دیکھ رہا ہوں تمہیں۔"

وہ پتا نہیں کیا پڑھ رہا تھا اُس کے چہرے پر۔ آنکھیں تو اُس نے جھکا لی تھیں۔

"ہاں، بہت بدل گئی ہوں۔ کیونکہ زندگی بدل گئی ہے۔ تم سناؤ۔" مومنہ نے ہنسنے کی کوشش کی پھر ترک کردی۔ اُسے یاد آیا وہ اُس کا چہرہ پڑھ لیتا تھا اور اُس کے ماسک کے پیچھے بھی جو دکھتا تھا وہ بھی۔

"امریکہ سے آگیا ہوں میں۔ ڈگری مکمل ہوگئی ہے۔ اب یہاں بابا کے ساتھ اُن کی فیکٹری سنبھالنا شروع کی ہے......اور تم......آنٹی نے بتایا، تم ایکٹنگ چھوڑ رہی ہو۔"

وہ اُس کی باتیں سنتے ہوئے آخری جملے پر چونکی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتی۔ ایک ٹرے میں چائے کے کپ رکھے ثریا اندر آئی تھی۔

"ہاں بیٹا! پہلے تو جہانگیر کی وجہ سے مجبوری تھی لیکن اب تو کوئی مجبوری نہیں ہے۔ اب اسے اپنے گھر کا کریں گے اور کام ختم۔ تم چائے پیو۔" ثریا نے اُسے کچھ کہنے نہیں دیا تھا۔ فیصل کی بات کا جواب خود ہی دیا تھا اور ساتھ چائے کا کپ بھی اُس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ مومنہ اُلجھی نظروں سے ماں کا چہرہ دیکھتی رہی۔ پتا نہیں وہ کیا تھا جو وہ چھپانا چاہ رہی تھیں اور کیا تھا جو وہ اُسے جتا رہی تھیں۔ وہ پہلی بار اُن کے گھر آیا تھا مگر وہ غائبانہ طور پر اس گھر میں کئی سالوں سے موجود تھا اور مومنہ اور فیصل کے تعلق کی نوعیت بھی اس گھر کے سب لوگوں کو پتا تھی۔

وہ چائے پیتے ہوئے فیصل کا چہرہ دیکھتی رہی۔ وہ یوں ثریا سے باتوں میں مشغول تھا جیسے ہمیشہ سے اُن سے ملتا رہا ہو۔ وہ اُسے جہانگیر کے قصے سُنا رہی تھی۔ اور وہ بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔ مومنہ سلطان اُس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اُس سے وہ سوال کرنا چاہتی تھی جو کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ اُس کی منگنی ہو چکی تھی اور وہ اُس سے اُس کی منگیتر کا حال پوچھنا چاہتی تھی۔

"میں اب چلتا ہوں، کافی دیر ہوگئی۔" فیصل نے یک دم اپنی رسٹ واچ دیکھتے ہوئے جیسے چونک کر کہا تھا۔

"بیٹا! دوبارہ ضرور آنا۔" ثریا نے کھڑے ہوتے ہوئے اُس سے کہا۔

"دوبارہ آؤں گا اور جلدی آؤں گا۔" اُس نے ثریا کے اصرار کا جواب مومنہ کو دیکھتے ہوئے دیا تھا۔ مومنہ مسکرا دی تھی۔ اُسے اب انتظار کرنے کی عادت نہیں رہی تھی اور وہ یہ عادت دوبارہ سیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ نہ انتظار، نہ خوش فہم امیدیں۔ نہ جھوٹے خواب۔ وہ ان میں سے کسی کا بوجھ اُٹھانے میں اب دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔

"آپ نے اس سے یہ کیوں کہا کہ میں ایکٹنگ چھوڑ رہی ہوں۔" فیصل کے گھر سے نکلتے ہی اُس نے دروازہ بند کر کے ثریا سے پوچھا تھا، اُس کا جھوٹ جیسے اُس کے ذہن میں اٹکا ہوا تھا۔

"تمہارا دل تو کبھی بھی نہیں تھا ایکٹنگ میں، ہمیشہ تو کہتی تھیں کہ نہیں کرنا چاہتیں یہ کام اور اب تو جہانگیر بھی نہیں ہے تو مجبوری بھی نہیں ہے۔" ثریا نے ایسے عجیب سے انداز میں اپنے جھوٹ کی توجیہہ دی تھی کہ وہ اُن کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی تھی۔

Google

''اماں قرضہ ہے ہمارے سر پر۔ اور مجھے کوئی اور کام نہیں آتا۔'' اُس نے جیسے ماں کو یاد دلایا، وہ اُس کے پیچھے چلتی ہوئی برآمدے میں آئی تھی اور ثریا کمرے میں داخل ہونے سے پہلے یک دم پلٹی تھی۔

''شاید فیصل رشتہ لے آئے۔'' ثریا کے لہجے کی آس مومنہ کو کانچ کی طرح چبھی۔

''اماں۔'' وہ اُس آس کو توڑنے کے لیے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر ثریا نے اُس سے پہلے ہی کہا۔

''میں نے بات کی ہے اُس سے۔'' مومنہ دنگ رہ گئی۔

''آپ نے کیا بات کی ہے اُس سے؟ وہ کیا سمجھ رہا ہوگا۔ اماں اُس کی منگنی ہو چکی ہے۔''

بہت سی کیفیات سے وہ بیک وقت گزری تھی۔ شرم، افسوس، خفگی اور اپنے دیر سے گھر پہنچنے کا پچھتاوا۔ وقت پر آتی تو ثریا کے فیصل کے ساتھ یہ سوال و جواب روک لیتی۔

''منگنی ٹوٹ گئی ہے اُس کی۔ لڑکی امریکہ سے پاکستان سیٹل ہونا نہیں چاہتی۔ اُس نے بتایا تھا مجھے۔ ماں کو تو تب بھی بھیجا تھا اُس نے۔ لیکن ہم خود غرض بن گئے تھے جہانگیر کی وجہ سے، ورنہ تم اپنے گھر کی ہوتیں۔''

ثریا کو چند سال پہلے فیصل کی ماں کا گھر آنا یاد آیا تھا۔

''ہاں لایا تھا ماں کو۔ لیکن انہوں نے ہمارے خاندان کے بارے میں جان کر انکار کر دیا تھا۔ میرے اور اُس کے درمیان جہانگیر اور آپ کی خود غرضی نہیں آئی تھی، نصیب آیا تھا اماں۔'' مومنہ کو چھ سال پہلے فیصل کی ماں کا اُن کے گھر آنا یاد آیا تھا۔ تب وہ اسی محلے کے ایک دوسرے گھر میں رہتے تھے لیکن اس سے بہتر گھر میں اور تب فیصل صرف اپنی ماں کو دروازے پر چھوڑ کر چلا گیا تھا، اندر نہیں آیا تھا اور اُس کی ماں نے ایک گھنٹہ میں صرف مومنہ نہیں ثریا اور سلطان کے خاندان کی جڑیں تک کھنگال لی تھیں۔ وہ بہت اچھی، ملنسار، خوش گفتار اور خوش اخلاق خاتون تھیں مگر ''خاندانی'' تھیں اور خاندانی ہونے ہی کو اہمیت دیتی تھیں۔ وہ اچھی طرح سے اُن سے مل کر گئی تھیں اور اُن کے جانے کے بعد ثریا اور سلطان کو بیک وقت فکر لاحق ہوئی تھی کہ یہ رشتہ اگر ہو گیا تو پھر جہانگیر کے علاج کا کیا ہوگا اور انہوں نے مومنہ کو یہ بتا بھی دیا تھا کہ جہانگیر کو اس حالت میں چھوڑ کر وہ اگر اپنا گھر بسانے کا سوچے گی تو یہ خود غرضی ہوگی۔

مومنہ ان سے یہ نہیں کہہ سکی کہ رشتہ بھیجنا فیصل کی خواہش تھی اُس کی نہیں۔ وہ اُسے جہانگیر یاد نہ بھی دلاتے تو بھی وہ اُسے یاد تھا۔ وہ اُسے چھوڑ کر اپنی زندگی کا مر کے بھی نہیں سوچتی۔ مگر فیصل کی والدہ کے آنے نے جیسے سب کچھ خود ہی آسان کر دیا تھا۔ فیصل نے ہچکچاتے ہوئے اُسے اپنی ماں کے اعتراضات بتائے تھے اور مومنہ نے اُس کی بات کاٹ کر بڑی ہمت سے اُسے اپنے ماں باپ کا انکار سنا دیا تھا۔

محبت کا پردہ رکھنے سے زیادہ اُس پر پردہ ڈالنا ضروری تھا اور وہ اُس نے ڈال دیا تھا۔ دونوں اُس کے بعد کبھی نہیں ملے تھے اور آج اتنے سالوں بعد ملے تھے تو ثریا جیسے اُس کہانی کو وہیں سے شروع کرنا چاہتی تھی اور مومنہ ماں کو بتانا چاہتی تھی کہ زندگی میں فلیش بیک آ بھی جائے تو کہانی وہیں سے شروع نہیں ہوتی جہاں فلم میں چھوڑی جاتی ہے۔ زندگی میں وقت ہوتا ہے جس کو کوئی ڈائریکٹر باندھ نہیں سکتا۔

''نصیب کا کیا ہے مومنہ! وہ تو بدلا جا سکتا ہے۔'' ثریا نے اُسے آہ بھر کے کہا تھا۔ اُس نے فلم میں یہ لائن بولی ہوتی تو سینما میں تالیاں ملتیں اُسے۔ مومنہ نے اعتراف کیا تھا دل میں۔

''میں نے بات کی ہے اُس سے۔ تم بھی بات کرو اُس سے۔'' ثریا نے اُس سے کہا تھا۔

''نہیں اماں! میں بات نہیں کروں گی اُس سے۔ آپ کو بھی نہیں کرنی چاہیے تھی۔''

''وہ تجھ سے محبت کرتا ہے۔ محبت میں تو انا نہیں ہوتی۔'' ثریا نے اُس سے کہا تھا۔

''محبت میں انا نہیں ہوتی لیکن خودداری ہوتی ہے۔ میرے اور اُس کے درمیان سات سمندر ہیں۔ میں وہ

Digitized by Google

سوہنی ہوں جس کا گھڑا کچا نہیں ٹوٹا ہوا ہے۔ وہ وہ مہینوال ہے جو مجھے بچانے کے لیے خود کو نہیں ڈبوئے گا۔ ہمارا پیار بس اتنا ہی ہے۔ داستان کبھی نہیں بنے گا۔"

مومنہ سلطان نے ثریا سے کہا تھا اور پھر آنکھیں چراتی دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ ثریا کے سامنے روتی تو وہ پھر جھوٹی آس دلاتی اور مومنہ سلطان کو اب پیار کی آس بھی نہیں رکھنی تھی بس اپنی زندگی کا کچھ کرنا تھا۔

☆☆☆

"تمہیں یقین ہے ناوہ مجھے لیڈ میں کاسٹ کرنے والا ہے؟"

مومن کے اسٹوڈیو میں ہونے والی پریس کانفرنس میں شرکت سے چند منٹ پہلے اپنی گاڑی سے اتر کر اسٹوڈیو کے ہال کی طرف جاتے ہوئے ضوفی نے نیہا سے پوچھا تھا۔ وہ جیسے کسی عجیب سے خدشے کا شکار ہو گیا تھا۔

"سو فی صد یقین ہے۔" نیہا نے اپنے ایوننگ گاؤن پر نمایاں ہونے والی ایک سلوٹ کو جیسے ہاتھ سے سیدھا کیا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے ہال کے دروازے تک آئے تھے جہاں کھڑے ایک ملازم نے بڑی مستعدی سے دروازہ کھولا تھا۔

ہال میں موجود تمام نشستیں تقریباً بھر چکی تھیں۔ میڈیا سے تعلق رکھنے والے لوگ اور اس ایونٹ کو کور کرنے والی میڈیا ٹیمز اپنے اپنے کیمرہ مینوں اور فوٹو گرافرز کے ساتھ اندر ٹولیوں میں کھڑی تھیں اور جرنلسٹس وہاں نظر آنے والے اسٹارز سے گپ شپ میں مصروف تھے۔ وہ تقریباً سو کے قریب لوگوں کا اجتماع تھا اور قلبِ مومن فی الحال وہاں موجود نہیں تھا۔ ہال کے ایک سرے پر ایک کم اونچائی کے اسٹیج پر ایک لمبا کاؤنٹر اور اس کے پیچھے دس بارہ کرسیاں تھیں جو اس وقت خالی تھیں اور اس کاؤنٹر نما میز پر رکھے کچھ مائیکس کو چند ٹیکنیشن سیٹ کرنے میں مصروف تھے۔

نیہا بے حد انداز اور ادا سے ضوفی کے ساتھ اندر داخل ہوئی تھی اور اندر داخل ہوتے ہی ٹینا اور داؤد نے اسے دیکھ لیا تھا جو بیک وقت ان دونوں کی طرف لپکے تھے اور ان کے اس انداز پر نیہا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی اور اس نے جتانے والے انداز میں ضوفی کے کانوں میں سرگوشی کی۔

"دیکھ لو۔" ضوفی کا چہرہ بھی چمک اٹھا تھا۔ وہ چند ہی لمحوں میں اس تقریب کا "دولہا" بننے والا تھا۔ اس نے اپنے خون کو جیسے پارہ بنتے محسوس کیا تھا۔

"آپ لوگوں کی فرنٹ سیٹس ہیں۔ ہم انتظار کر رہے تھے آپ دونوں کا۔"

ٹینا نے پاس آتے ہی رسمی ہیلو ہائے کے بعد نیہا سے کہا تھا اور پھر وہ دونوں ان دونوں کو ساتھ لیتے ہوئے فرنٹ سیٹ کی طرف جانے لگے تھے اور بالکل اسی وقت نیہا نے ہال کے ایک کونے میں کھڑی صوفیہ درانی کو دیکھا اور اسے جیسے کرنٹ لگا تھا۔ وہ سگریٹ پیتے ہوئے ایک جرنلسٹ کے ساتھ گپ شپ کر رہی تھی۔ نیہا نے ہال میں نظر دوڑائی۔ اسے قلبِ مومن نظر نہیں آیا۔

"مومن کہاں ہے؟" اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے ٹینا سے پوچھا۔ "وہ بس آنے والے ہیں۔ برانڈز کے کچھ لوگوں کے ساتھ اندر آفس میں ہیں۔"

ٹینا اور داؤد ان دونوں کو بٹھا کر سیکنڈز میں غائب ہوئے تھے۔

"تمہارا موڈ کیوں آف ہو گیا ہے؟" ضوفی نے نیہا کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کو دیکھ لیا تھا۔

"اس نے صوفیہ درانی کو کیوں بلا رکھا ہے یہاں؟" نیہا مدھم آواز میں کاٹ کھانے والے انداز میں بولی تھی۔

ضوفی نے چونک کر اس طرف دیکھا جہاں وہ دیکھ رہی تھی۔ وہ صوفیہ کے لیے اس کی ناپسندیدگی سے واقف تھا۔

"کر لیا ہو گا انوائیٹ دوسروں کے ساتھ!" ضوفی نے کسی خاص تاثر کے بغیر کہا تھا۔

"اس کو پتا ہے مجھے زہر لگتی ہے وہ پھر بھی انوائیٹ کر لیا اسے۔"

Google

نیہا کی خفگی عروج پر تھی اور وہ اب متلاشی نظروں سے مومن کو ڈھونڈ رہی تھی اور ضوفی بار بار اُس کوٹ کو ٹھیک کرنے میں مصروف تھا جسے پہن کر وہ آیا ہوا تھا۔ وہ نروس تھا ایکسائیٹڈ ہونے کے ساتھ اور اُس کے انداز میں وہ نروس نیس جھلک رہی تھی۔ اُس کی توجہ اس وقت برابر بیٹھی نیہا کے گلے شکووں پر نہیں تھی۔

''بعد میں بُرا بھلا کہہ لینا یار اُسے۔ ابھی تو انجوائے کرو اس ایونٹ کو۔'' ضوفی نے اُس کے کان میں سرگوشی کی اور تب ہی اُن دونوں نے ہال کے عقب میں یک دم سرگوشیوں کا ایک طوفان سا اُٹھتا سنا۔ قلب مومن اب اندر داخل ہو رہا تھا اور اُس کی آمد کے ساتھ ہی ہر طرف سے کیمروں کی لائٹس چمکنے لگی تھیں۔ وہ چلتا ہوا ہال کے اگلے حصے میں فرنٹ سیٹس کے سامنے سے گزرنے لگا اور گزرتے ہوئے اُس نے نیہا اور ضوفی کو دیکھا اور بالکل اُن کے سامنے آ کر مسکراتے ہوئے رُکا۔ وہ دونوں کھڑے ہو کر اُس سے ملے تھے۔ نیہا نے اُس سے گلے لگتے ہوئے اُس کے کان میں سرگوشی کی۔

''تھینک یو اینڈ کانگریجولیشن۔'' مومن نے بھی جواباً سرگوشی کی۔

"Pleasure is always mine." اُس سے الگ ہوتے ہوئے وہ ضوفی سے ملا اور اُس سے کہا۔

''یو آر اسٹار ٹو ڈیز شو۔'' ضوفی کا چہرہ چمک اُٹھا اور کیمروں کے کچھ شٹر اُس پر فوکس ہوئے۔ مومن دونوں سے ہاتھ ملاتا اوپر اسٹیج پر چلا گیا تھا اور وہاں جا کر اُس نے اپنی سیٹ سنبھال لی اور اُس کے سیٹ سنبھالتے ہی سب نے اپنی سیٹس سنبھال لی تھیں۔

''آپ سب کا آج یہاں آنے کے لیے بہت شکریہ۔'' اُس نے مائیک سنبھالتے ہی کہنا شروع کیا۔ ''صنم میری چوتھی فلم ہے جسے میں اگلے دو مہینوں میں شوٹ پر لے جاؤں گا۔ اپنی پچھلی فلمز کی طرح اس بار بھی میں نے صرف ایک چینج کیا ہے پچھلی فلم کی کاسٹ میں۔'' وہ کہتے ہوئے رُکا اور اُس نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوئی نیہا اور ضوفی کو دیکھا جن کے دلوں کی دھڑکن بے اختیار تیز ہوئی تھی۔ ضوفی نے اپنا کوٹ ایک آخری بار ٹھیک کیا۔ تب ہی نشستوں میں سے کسی جرنلسٹ نے کہا تھا۔

''ہمیشہ کی طرح ہیروئن بدلیں گے اس بار بھی۔'' مومن اُس جملے پر مسکرایا اور اُس نے کہا۔ ''نہیں وارڈروب ڈیزائنر۔ اس بار میری فلم کی وارڈروب صوفیہ دُرانی کریں گی اور کاسٹ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ میں اب کاسٹ کو اسٹیج پر بلا رہا ہوں۔'' نیہا اور ضوفی نے بے یقینی سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ وہ ویسے وہاں بیٹھے بیٹھے برف بنے تھے۔ وہ کمرہ اب تالیوں سے گونج رہا تھا اور اسٹیج کے پیچھے سے باری باری فلم کی کاسٹ آ کر اسٹیج پر رکھی کرسیوں پر بیٹھ رہی تھی۔ نیہا نے مومن کو دیکھا۔ وہ اُس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ یوں جیسے وہ اُس کے لیے کوئی وجود ہی نہیں رکھتی تھی۔ وہ قلب مومن تھا، معاف نہیں کرتا تھا۔ لیکن بھول جاتا تھا۔ وہ اُسے بھول گیا تھا۔

☆☆☆

''تمہارا صاحب گھر پر ہے؟'' بیل بجنے پر شکور نے دروازہ کھولا تھا اور نیہا نے بڑی بدتمیزی سے اُس سے پوچھا تھا۔ شکور کو اُس کے انداز پر جیسے دھچکا لگا تھا۔

''مومن بھائی کا پوچھ رہی ہیں؟'' شکور کو ایک لمحہ کے لیے لگا وہ دادا کا پوچھ رہی تھی کیونکہ مومن کو ''صاحب'' کہتے تو اُس نے نیہا کو کبھی نہیں سنا تھا۔

''اور کس کا پوچھوں گی؟'' وہ کچھ اور بگڑی تھی۔

''جی جی...... وہ تو ہیں۔'' شکور نے بے ساختہ کہا اور دروازے سے ہٹ گیا۔ نیہا بجلی کی تیزی سے اندر گئی تھی۔ شکور کو بے اختیار گدگدی ہوئی۔ وہ اس گھر میں اسی چیز کو مس کرتا تھا جو اب ہونے جا رہی تھی۔ لڑائی......

مومن لاؤنج میں ٹہلتے ہوئے فون پر کسی سے ہنستے ہوئے بات کر رہا تھا۔ جب اُس نے نیہا کو اس انداز

Digitized by Google

میں اندر آتے دیکھا تھا۔
"میں تمہیں دس منٹ تک کال کرتا ہوں۔" اُس نے فون پر اپنے مخاطب سے کہا اور پھر دوسری طرف کی بات سننے کے بعد کہا۔
"نہیں دس منٹ ہی لگیں گے۔ایک مہمان ہے۔دس منٹ میں چلا جائے گا۔اوکے بائے۔"
اُس نے فون پر کسی دوسرے سے بات کرتے ہوئے بھی نیہا کو جیسے اُس کی اوقات جتائی تھی۔
"تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو؟" اُس کے فون بند کرتے ہی وہ اُس پر دھاڑی تھی۔وہ جواباً چڑانے والے انداز میں مسکرایا تھا۔
"مومن۔"
"کیا بگاڑ لیا تم نے مجھے فلم کے کریو سے نکال کر میرا۔مجھے فرق نہیں پڑا۔" اُس نے مومن کی مسکراہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا تھا۔
"پھر تو بہت اچھا ہے اِس کا مطلب ہے ہماری دوستی اسی طرح قائم رہے گی۔" مومن نے جیسے اُسے اور تپایا تھا۔
"تم ضوفی سے جیلس ہوئے ہو۔تم سے برداشت نہیں ہوا کہ میں اُس کے اتنا قریب ہوں۔اُس کے لیے یہ سب کر رہی ہوں۔تم بے حد مین اور ان سیکیور انسان ہو۔" وہ اب الزام تراشی پر اُتر آئی تھی۔
"کچھ اور؟" مومن اُسی طرح برف بنا ہوا تھا۔
"بڑا غرور ہے نا تمہیں اپنے آپ پر۔میں تمہارے زوال میں تمہیں دیکھنے آؤں گی۔" اُس نے تلخی سے کہا۔مومن ہنسا۔
"بڑے لمبے انتظار کے بعد ملاقات ہوگی پھر تو۔"
"میں کوشش کروں گی اتنا لمبا انتظار نہ کرنا پڑے۔" نیہا نے اُسے پتا نہیں کیا جتایا تھا۔اپنے ہاتھ کی انگلی سے اُس نے انگوٹھی نکالی اور اُسے پوری قوت سے اُس کے منہ پر دے مارا۔مومن بے اختیار پیچھے ہٹا تھا۔انگوٹھی فرش کے ٹائلوں پر گری۔اُچھلی پھر گری اور پھر چکر کاٹنے لگی۔مومن نے باہر جاتی ہوئی نیہا کو دیکھا جس کا وجود بھی اُس وقت اسی طرح بھنور بنا ہوا تھا مگر اُسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ بھنور قلب مومن کے لیے گرداب بننے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔

☆☆☆

"کہانی پہاڑوں پر رات کے ایک خوب صورت سین سے شروع ہوتی ہے۔چاندنی رات ہے۔درخت ٹھنڈی ہوا میں جھوم رہے ہیں اور۔" مومن نے اختر کو اسکرین پلے کی وضاحت کے درمیان ٹوکا تھا۔
"عباس نے چھ بجے آنے کو کہا تھا اور اب ساڑھے چھ ہوگئے ہیں۔" مومن نے دیوار پر لگے وال کلاک پر نظر دوڑاتے ہوئے بلند آواز میں داؤد سے کہا تھا۔اختر صاحب جو اس فلم کے رائٹر تھے اور اس وقت جب وہ سب لوگ ریڈنگ سیشن میں بیٹھے ہوئے تھے وہ "سماں باندھنے" کی کوشش میں مصروف تھے اور اُس کوشش کو مومن نے ضائع کر دیا تھا۔
"سگنل پر کہیں پھنسا ہوا ہے ٹریفک میں۔میری کچھ دیر پہلے بات ہوئی ہے۔" ٹینا نے جلدی سے بیچ میں مداخلت کرتے ہوئے کہا تھا۔
"ٹھیک ہے،آپ کہانی سنانا شروع کریں۔وہ آتا ہے تو اُس کو دوبارہ وہ حصہ سنا دیں گے جو اُس نے نہیں سنا۔" مومن نے اختر صاحب کو اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔
"جی بہتر تو میں دوبارہ وہیں سے شروع کرتا ہوں۔" اختر صاحب نے لمحہ بھی ضائع نہیں کیا تھا وہ چالیس

Digitized by Google

پینتالیس سال کے تھے لیکن اپنی گفتگو اور رکھ رکھاؤ سے ہمیشہ اپنے آپ کو کچھ زیادہ ہی بڑی عمر کا ثابت کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔

''ہیروئن چاندنی رات میں ایک پہاڑ پر رقص کر رہی ہے۔ سفید گاؤن میں پریوں کی طرح۔ آسمان پر چاند ستارے ہیں، اُس پہاڑ پر پھیلا سبزہ چاند کی روشنی میں مخمل کی طرح چمک رہا ہے اور اُس مخمل پر ہیروئن کے خوبصورت دودھیا رنگت کے پاؤں تھرک رہے ہیں۔'' اختر منظر کشی کرنے کی کوشش میں جیسے ایک ایک لفظ کی عکاسی اپنے ہاتھوں اور جسم کی حرکات سے کر رہے تھے اور انتہائی مضحکہ خیز نظر آ رہے تھے اور ہر جملے کے بعد وہ داد و تحسین کے لیے مومن کی طرف دیکھتے تھے جس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ خاموشی سے کہانی سن رہا تھا۔

''اف کیا اوپننگ ہے اختر۔ تباہی سین ہے۔ میں تو ابھی سے وہ گاؤن، رقص، رات اور اپنے پیروں کی مومنٹس کو وژلائز کر رہی ہوں۔'' قلب مومن سے کچھ فاصلے پر بیٹھی شیلی نے جیسے بے اختیار ہو کر اختر کو داد دی تھی اور اختر کا چہرہ چمک اُٹھا تھا۔ اپنے چشمہ کو ٹھیک کرتے ہوئے اُس نے ایک بار پھر مومن کو دیکھا اُس کی طرف سے کسی ستائشی جملے کی توقع میں۔ وہ اب بھی ویسے ہی سنجیدہ بیٹھا ہوا تھا۔ شیلی کی داد پر بھی اُس نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔

''یہاں ہمارا ٹائٹل سونگ آ رہا ہوگا اور ساتھ کریڈٹس چل رہے ہوں گے۔ ہیروئن کے قدموں کی ہر حرکت پر اور ہر بیٹ پر۔'' اختر پھر اپنے کاغذات کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

''میوزک کون کر رہا ہے اس بار؟'' شیلی کو یک دم پوچھنے کا خیال آیا۔

''شجاع حیدر سے ہی کروا رہے ہیں۔'' مومن نے اُسے جواب دیا اور پھر ساتھ ہی اختر سے پوچھا۔ ''تو یہ ہے ہمارا اوپننگ سیکوئنس؟''

اختر نے خوشی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''جی مومن صاحب۔''

''بکواس ہے۔'' دو لفظوں میں مومن نے جیسے اختر صاحب کی مہینوں کی محنت پر پانی پھیرا۔

''ہیں؟'' اختر کو جیسے یقین نہیں آیا۔ اُس نے اپنے چشمہ کو ایک بار پھر ٹھیک کیا اور اپنے رائٹنگ پیڈ پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

''اچھا؟''

''ایگزیکٹلی، میرا ابھی یہی پوائنٹ تھا کوئی نیا پن ہی نہیں ہے۔'' شیلی نے گرگٹ بننے میں لحہ بھی نہیں لگایا تھا۔ اختر صاحب کا درد کچھ اور بڑھا۔

''مجھے کہانی کو شہر میں کھولنا ہے۔ یہ پہاڑوں میں کہاں لے گئے آپ ہیروئن کو؟'' مومن نے اختر سے کہا اور شیلی نے لقمہ دیا۔

''ڈیٹس دا پوائنٹ۔ شہر تو ریلیونٹ ہے پہاڑ تو ریلیونٹ ہی نہیں اور پھر چاندنی رات گاؤن، ڈانس۔ so cliched۔'' شیلی کے جملوں نے اختر صاحب کی حالت کچھ اور غیر کی۔

''ڈانسر ہے ہیروئن تو میں نے بالکل فیری ٹیل والے انداز میں اوپننگ دی ہے۔۔'' مومن نے اختر صاحب کی بات کاٹی۔

''اور مجھے فیری ٹیلز سے نفرت ہے۔''

''بالکل اختر صاحب فیری ٹیلز میں کہاں چلے گئے آپ۔ یوتھ کو دکھانی ہے فلم۔ بچوں کو تھوڑی دکھانی ہے۔'' شیلی مومن کے ہر جملے کی تائید عادتاً کر رہی تھی۔ فلم انڈسٹری میں ڈائریکٹر ہمیشہ ''صحیح'' ہوتا ہے اور رائٹر ہمیشہ کم عقل۔

''کلب میں کھولیں سین کو۔ روشنی ڈانس فلور پر دو لڑکوں کے ساتھ ڈانس کر رہی ہے اور اُس میں سے ایک

Digitized by Google

لڑکا اُسے گلے لگانے کی کوشش کرتا ہے تو دوسرا لڑکا پہلے کو تھپڑ مارتا ہے۔'' مومن نے چند سیکنڈز میں اوپننگ سیکوئنس اُن کے سامنے رکھ دیا تھا۔

''فنٹاسٹک' بریلینٹ۔ یہ ہوتی ہے اوپننگ اختر صاحب۔ تو مومن روشنی تو ڈانس کرتی رہے گی نا؟'' شیلی نے ایک ہی سانس میں مومن کو داد دی اور پھر پوچھا۔

''ہاں۔ پہلا لڑکا دوسرے کو جواباً مکا مارے گا اور پھر یکدم پسٹل نکال لے گا۔'' مومن نے اپنی بات جاری رکھی۔

شیلی نے اُسے ایک بار پھر ٹوکا۔ ''اور دوسرے کو گولی مار دے گا؟'' وہ اب داد طلب نظروں سے مومن کو دیکھ رہی تھی۔

''نہیں روشنی کو گولی مار دے گا۔'' مومن نے اُسی انداز میں کہا۔ شیلی بھونچکا رہ گئی۔ وہ اوپننگ سین میں ہی ہیروئن کو گولی مروا رہا تھا اور بدقسمتی کی بات یہ تھی کہ ہیروئن وہ خود تھی۔

''لائٹ آؤٹ۔ کلب میں ہنگامہ۔ کریڈیٹس چلنا شروع۔ ٹائٹل سونگ۔'' مومن نے ایک ہی جملے میں اوپننگ سیکوئنس نپٹایا۔ شیلی اب تک خود کو سنبھال چکی تھی۔

''سو پرامیر یسو۔ کمال کر دیا۔ پہلے ہی سین میں ایکشن، ایڈونچر، تھرل۔ مومن کی سگنیچر اوپننگ۔'' شیلی نے جھوم جھوم کر اُس کو داد دی۔ مومن اب اُسے سن بھی نہیں رہا تھا۔ وہ ہیروئنز اور ایکٹرز کی اس طرح کی لفاظی اور خوشامد کو پہچانتا تھا اور اُن سے بہت کم متاثر ہوتا تھا۔

''سمجھ گیا میں۔'' اختر نے کچھ بجھے بجھے انداز میں کہا۔

''روشنی کوئی اپسرا ٹائپ کی ڈانسر نہیں ہے اختر۔ کلب میں ماڈرن ہپ ہاپ ڈانس کرنے والی لڑکی ہے تو دیوی مت بنا ئیں اُسے۔ ڈانس کرواتے ہوئے اُس کے ہر سین میں مجھے تھرل چاہیے۔ کلب ڈانسر والی تھرل وہ جب جب اسکرین پر آئے اسکرین کو آگ لگا دے۔ سیٹیاں بجوا دے۔'' مومن روشنی کا کردار اور رول وضاحت سے پیش کر رہا تھا اور اختر رائٹنگ پیڈ پر نوٹس لینے میں مصروف تھا۔

''اب سمجھ گیا سر۔ میرے ذہن میں اپنی انڈسٹری کی پرانی ہیروئنز کی طرح کا امیج تھا روشنی کا۔ بالکل حسنِ جہاں کی طرح کا کردار بنانا چاہتا تھا میں۔ مگر اب بدلتا ہوں اُسے۔'' روانی سے بات کرتے ہوئے اختر کے اُس ایک جملے میں لیے جانے والے نام پر قلبِ مومن جیسے کرنٹ کھا کر سیدھا ہوا تھا۔

''کون حسنِ جہاں؟'' شیلی پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔ وہاں کوئی بھی اس وقت قلبِ مومن کی طرف متوجہ نہیں تھا ورنہ اُس کے چہرے کا پھیکا پڑتا رنگ اُن سب کی نظروں میں آجاتا۔

''پاکستان فلم انڈسٹری کی سب سے بڑی ڈانسر ہیروئن۔'' اختر نے اُسی روانی میں جواب دیا۔

''میں نے کبھی نام نہیں سُنا۔'' شیلی نے کچھ سوچ کر کہا۔ اس سے پہلے کہ اختر کچھ کہتا۔ قلبِ مومن یک دم صوفہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس نے تقریباً چلاتے ہوئے اختر سے کہا۔

''حسنِ جہاں نہیں دکھانی مجھے اپنی فلم اور اس رول میں!! سمجھے؟''

کمرے میں یک دم خاموشی چھائی تھی۔ مومن نے میز پر پڑا سگریٹ لائٹر اور سگریٹ کی ڈبیا اُٹھائی اور وہ باتھ روم میں چلا گیا۔

اُس کے وہاں سے جاتے ہی سب سے پہلے جیسے شیلی کے حواس بحال ہوئے تھے۔ آواز کو حتی المقدور ہلکی رکھتے ہوئے اُس نے ٹینا اور داؤد سے کہا۔ ''اسے کیا ہوا ہے؟''

''میرا خیال ہے، عباس نہیں پہنچا ابھی تک تو اُسی کی وجہ سے اپ سیٹ ہو رہے ہیں۔'' ٹینا نے جیسے صورت حال سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔

Digitized by Google

اندر باتھ روم میں قلبِ مومن اب لائٹر سے سگریٹ جلا رہا تھا۔ سگریٹ جلاتے ہوئے اُس نے اپنے ہاتھوں کی کپکپاہٹ دیکھی۔ وہ غصہ کے اثرات تھے جواب بھی اُس کے وجود کے اندر کسی جوار بھاٹا کی طرح اٹھ رہے تھے۔ سنک کا پانی کھولے اُس کے شور میں اپنے اندر کے شور کو دبانے کی کوشش میں بے حال وہ اب بھی اندر کمرے میں ہونے والی گفتگو سن پا رہا تھا۔

''اختر صاحب! یہ حسنِ جہاں ہے کون؟ ذرا دکھائیں تو مجھے۔'' اُس نے شیلی کو کہتے سنا اور مومن کا غصہ بڑھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا، اُن میں سے کوئی بھی حسنِ جہاں کا نام لیتا۔۔ کوئی بھی حسنِ جہاں کو دیکھتا۔

''داؤد ذرا گوگل پر سرچ کر کے دکھاؤ اُنہیں۔ ڈیوا تھی وہ ڈیوا پاکستان فلم انڈسٹری پر حکومت کرنے والی ڈیوا۔'' اُس نے اختر کو کہتے سُنا۔

مومن نے ہونٹوں میں پھنسے سگریٹ کو انگلیوں سے پکڑ کر اضطراب کے عالم میں تین چار گہرے گہرے کش لیے۔ دھواں اندر گیا مگر غم باہر نہیں نکلا۔ نہ ہی غصہ۔ دونوں اندر کہیں چھپ کر بیٹھ گئے تھے یوں جیسے اُس کے سامنے آنے سے ڈرتے ہوں۔

''اوہ مائی گاڈ! واٹ آ بیوٹی۔'' اُس نے شیلی کی حیرت زدہ تحسین آمیز آواز سنی۔ ''کہاں ہوتی ہیں یہ آج کل؟'' وہ یقیناً داؤد یا ٹینا کے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر حسنِ جہاں کو دیکھ رہی تھی اور پوچھ رہی تھی اور مومن جل رہا تھا ہاتھ میں پکڑے سگریٹ کی طرح۔ وہ حسنِ جہاں کو اُن کی آنکھوں سے دور کر دینا چاہتا تھا۔

''ان کے ساتھ ٹریجڈی ہو گئی تھی، ایک بہت بڑی۔'' اُس نے اختر کو ایک آہ بھر کے کہتے سنا۔ قلبِ مومن کی کنپٹیاں اب تھرتھرانے لگی تھیں۔ اُس کی ساری نسیں جیسے اُس کے وجود سے باہر آنا چاہ رہی تھیں۔ سگریٹ اب انگلیوں کی پوروں کو جلا رہا تھا۔

''کیا ٹریجڈی؟'' شیلی نے کہا تھا اور قلبِ مومن دھڑام سے باتھ روم کا دروازہ کھول کر واپس کمرے میں آیا تھا۔

''یہ عباس ابھی تک نہیں آیا۔ یہ پروفیشن ازم ہے اس کا۔ ایک فلم ہٹ ہو گئی تو خود کو اسٹار سمجھ بیٹھا ہے۔'' وہ باہر آتے ہی دھاڑا تھا اور وہاں داؤد کے لیپ ٹاپ کے گرد اکٹھے ہوئے لوگوں کو ایک بار پھر سانپ سونگھ گیا تھا۔

''باس! میں ابھی فون کرتا ہوں اُسے۔'' داؤد نے گھبرا کر فون نکالتے ہوئے کہا تھا۔ باقی بھیڑ بھی بوکھلائے انداز میں چھٹی تھی۔

''اب وہ آئے تو بیٹھا رہے۔ میں اس کے باپ کا نوکر نہیں ہوں۔ جا رہا ہوں میں۔'' مومن رُکے بغیر اپنی میز سے اپنا لیپ ٹاپ اور فون اُٹھاتے ہوئے کمرے سے نکل گیا تھا اُن سب کو اسی ہکا بکا انداز میں چھوڑ کر۔

''کھانا لگاؤں؟'' شکور نے مومن کو دیکھتے ہی کہا تھا۔

''نہیں۔'' وہ بغیر رُکے اندر آیا تھا۔

''کچھ اور چاہیے؟'' شکور اُس کے پیچھے لاؤنج میں آیا۔

''کچھ نہیں چاہیے۔'' اُس نے اُسی روکھے انداز میں کہا۔ وہ اُس وقت صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ وہاں سے غائب ہو جائے اور شکور کو غائب ہونے کا موقع مل گیا تھا۔

قلبِ مومن اُس کے جانے کے انتظار میں تھا۔ اس کے جاتے ہی وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

اسٹور روم کی لائٹ آن کرتے ہوئے بھی وہ جانتا تھا، وہاں اُسے کس چیز کی تلاش تھی۔ اسٹور روم میں دیواروں کے ساتھ ہر سال دادا کی اُسے تحفے میں دی ہوئی خطاطی اُسی طرح پیکڈ ایک کے ساتھ ایک ٹکی پڑی تھیں۔ وہ چند لمحے وہاں پڑے سامان کو دیکھتا رہا پھر اُس نے وہاں پڑی میز کی سب سے اوپر والی دراز کھولی تھی

Khawateen Digest December 2018

Digitized by Google

اور اُس میں سے وہ فائل نکالی تھی جو سب سے اوپر پڑی ہوئی تھی۔
واپس لاؤنج کے صوفہ پر بیٹھ کر اُس نے اُس فائل کو سامنے میز پر رکھ لیا تھا۔ فائل کا کور کھولنے سے بھی پہلے اُسے پتا تھا، وہ کیا دیکھنے جا رہا تھا۔ وہ رنگین اُردو اخبار کا تراشا جس میں حسنِ جہاں کی موت پر ایک فیچر تھا اور اُس فیچر کی ہیڈ لائن تھی۔
''قتل یا خودکشی؟ حسنِ جہاں کی موت کا معمہ آج تک حل نہیں ہو سکا۔ یا پھر حسنِ جہاں آج بھی زندہ ہے اور زندہ ہے تو کہاں ہے؟''
مومن ایک بار پھر اُس اخباری تراشے کو لے کر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس فائل میں وہ کئی سالوں سے حسنِ جہاں کے بارے میں ملنے والی ہر خبر اکٹھی کر رہا تھا اور کس لیے کر رہا تھا وہ یہ نہیں جانتا تھا۔ پر ہر دفعہ درد سے بے حال ہونے پر کسی کسی رات کو وہ ان سب اخباری تراشوں کو اپنے سامنے بچھا کر بیٹھ جاتا تھا یوں جیسے اُن خبروں کی بھول بھلیوں میں وہ کوئی راستہ، کوئی پتا ڈھونڈ رہا تھا۔ نہ راستہ نظر آ رہا تھا۔ نہ کوئی پتا وہاں تھا۔

☆☆☆

''نہیں۔ پر نکالنے کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے، ایسے کیسے نکال سکتے ہیں وہ؟ کام سے مطمئن نہیں تو دس بار لکھ کر دینے کو تیار ہوں میں۔''
اختر صاحب کے طوطے، کبوتر سب اُڑ چکے تھے اور وہ داؤد کے سامنے بیٹھے بے حد بے چارگی سے وضاحتیں کرتے اور مانگتے جا رہے تھے۔ داؤد نے اُنہیں کچھ دیر پہلے فلم کے اسکرپٹ سے علیحدگی کا بتایا تھا اور اب ٹینا اور داؤد دونوں کو اُن پر ترس آ رہا تھا کیونکہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ اختر صاحب کو قلبِ مومن کے اس فیصلے کی کیا توجیہہ پیش کرتے۔
''اختر بھائی! مومن بھائی سے ملاقات کرواتا ہوں میں آپ کی، وہ ترکی سے واپس آتے ہیں تو...... ابھی تو ہم دونوں بھی کل ترکی جا رہے ہیں۔'' داؤد کی بات پر اختر کے غم میں جیسے اور اضافہ ہوا۔ ترکی تو اُس نے بھی جانا تھا ساتھ ریکی کرنے کے لیے۔
''آپ قسم کھا کر کہیں، کسی اور رائٹر کو تو نہیں لے جا رہے ساتھ۔'' اختر نے روکھے انداز میں کہا اور داؤد نے لمحہ برابر بھی انتظار کیے بغیر قسم کھائی۔ اختر صاحب کو جیسے کچھ قرار آیا تھا۔ وہ بمشکل آفس سے گئے تھے اور اُن کے رخصت ہوتے ہی ٹینا نے داؤد سے کہا۔ ''کیوں ہٹایا اُن کو فلم سے؟ آخر ہوا کیا ہے؟ اختلافات تو پہلے بھی ہوتے رہتے ہیں اسکرپٹ وغیرہ پر۔۔۔ پھر اس بار مومن کو کیا ہوا؟'' وہ ایک کے بعد ایک سوال کر رہی تھی۔
''مجھے صرف ایک چیز پریشان کر رہی ہے۔ اس بار فلم لکھے گا کون؟'' داؤد نے اپنی پریشانی بتائی تھی۔

☆☆☆

''مجھے بھی لے جائیں ساتھ۔ ترکی ہی گھوم آتا۔'' شکور کی حسرت اپنے عروج پر تھی۔ وہ مومن کا بیگ پیک کر رہا تھا اور مومن وارڈ روب سے اپنے کپڑے نکال نکال کر اُسے دے رہا تھا۔
''تم سے تو کہا تھا میں نے، مستقل چلے جاؤ دادا کے پاس۔ اُنہیں بھی سہولت ہو جائے گی۔ تمہارا بھی شوق پورا ہو جائے گا۔'' مومن نے ایک بلیزر ہینگر سے اُتارتے ہوئے بیڈ پر رکھا۔
''مستقل جانے کو تو نہیں کہا میں نے۔ آپ کے پاس تو دل لگا رہتا ہے میرا۔ داداجی کے پاس دل کہاں لگتا ہے میرا۔ وہاں نہ پارٹیاں، نہ لڑکیاں، نہ چہلیاں۔'' اُس نے ٹھنڈی آہ بھر کے کہا پھر مومن کو اپنے آپ کو گھورتے دیکھ کر جلدی سے بولا۔
''سامان پیک کر دیا، وزن کر لوں ذرا۔'' وہ اُس کا بیگ گھسیٹتے ہوئے باہر لے گیا۔ مومن نے وارڈ روب

Khawateen Digest December 2018
Google

بندی ہی تھی کہ اُس کا سیل فون بجنے لگا، وہ ایک جرنلسٹ تھی۔
''اوہ ہائے مومن! تم مل گئے ورنہ ٹینا تو کہہ رہی تھی۔ تم ترکی کے لیے نکل رہے ہو فلم کی ریکی کے لیے آج رات۔'' کال ریسیو کرتے ہی صدف نے تیزی سے کہا۔
''ہاں بس دو گھنٹے کے بعد نکل جاؤں گا۔''
''بس پھر زیادہ وقت نہیں لوں گی تمہارا۔ کمنٹس دے دو اپنے۔'' اُس جرنلسٹ نے جلدی سے کہا۔
''کس چیز پر؟'' وہ اُلجھا۔
''نیہا نے ضوفی کے ساتھ اپنی منگنی اناؤنس کی ہے۔۔۔ پکچرز شیئر کی ہیں فیس بک پر کچھ دیر پہلے تو بس اسی کے بارے میں۔''
Best of luck to them, they (بیسٹ آف لک۔ وہ ایک دوسرے کے لائق ہیں)
deserved each other."
ایک لحہ کے تامل کے بغیر مومن نے کہا تھا۔
''یہی لکھ دوں؟'' جرنلسٹ نے کُریدا۔ ''ہاں۔''
''تمہارے ساتھ بھی تو کوئی چکر تھا نیہا کا۔ اُس کا کیا ہوا؟'' جرنلسٹ بالآخر اُس سوال پر آگئی جس کے لیے وہ کال کر رہی تھی۔
''وہ بس چکر ہی تھا اور میں اب چکروں سے الرجک ہو گیا ہوں۔''
اُس نے بے ساختہ ۔ کہا تھا۔ جرنلسٹ ہنسی۔
''اوکے۔ ہیو آ سیف فلائٹ۔'' اُس نے فون بند کر دیا۔ مومن چند لمحے بند فون کو دیکھتا رہا، وہ اگر محبت تھی تو اُسے کچھ ہوا کیوں نہیں تھا، دُکھ نہ ہوتا، غصہ ہی آتا۔ لیکن اس سرد مہری کی کیفیت کو وہ بوجھ نہیں پایا تھا۔ قلبِ مومن کو اپنے دل سے خوف آیا تھا اُس لحہ۔ وہ واقعی بڑا ظالم تھا، کسی کو نکالتا تھا تو ٹھوکر مار کر ہی نکال دیتا تھا۔

☆☆☆

''کب جا رہی ہو امریکہ؟'' اقصیٰ نے کھانا کھاتے ہوئے اُس سے پوچھا تھا۔ مومنہ ایک ہفتہ لاہور میں فلم کی شوٹنگ کا پہلا اسپیل کروا کر ایک دن ہی پہلے واپس آئی تھی۔ اور اب دونوں اُس ریسٹورنٹ میں بیٹھی کھانا کھا رہی تھیں۔
''چھ تاریخ کو۔'' مومنہ نے کھانا کھاتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی اُسے یاد دلایا۔ ''بل میں دوں گی آج۔''
اقصیٰ بے اختیار مسکرائی۔ ''میرے پاس تھے بھی نہیں پیسے۔ تم ویسے بھی اب ہالی ووڈ اسٹار ہو تمہیں ہی دینے چاہئیں۔''
اُس نے مومنہ کو چھیڑا تھا۔ وہ مسکرادی۔
''چند سینز ہی ہیں میرے فلم میں۔ وہ کسی کو یاد بھی نہیں رہنے، ہاں مگر فلم کے معاوضے سے میرا بہت سا قرضہ اُتر جائے گا۔'' اُس نے اقصیٰ سے کہا تھا۔ اقصیٰ نے تبصرہ نہیں کیا۔
''فیصل کی کوئی خبر؟'' اُس نے یک دم پوچھا۔ مومنہ حیران رہ گئی۔
''فیصل کہاں سے یاد آ گیا تمہیں؟''
''بس آ گیا یاد...... دوبارہ نہیں آیا؟...... کوئی فون...... کوئی بات چیت...... آنٹی نے بتایا تھا، اُس کی منگنی ختم ہو گئی۔'' مومنہ نے اُس کی زبان کی چلتی ہوئی ٹرین کو روکا۔
''نہیں، دوبارہ نہیں آیا...... کوئی فون نہیں...... کوئی بات نہیں...... ایک منگنی ٹوٹی ہے پھر ہو جائے گی۔''

Digitized by Google

اقصیٰ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''شاید تمہارے ساتھ......''

مومنہ نے اُسے دیکھا پھر مسکرائی۔ ''مجھے معجزوں پر یقین نہیں رہا اور پیار میں تو بالکل بھی نہیں۔'' ''حالانکہ معجزے صرف پیار ہی میں ہوتے ہیں۔'' اُس نے اقصیٰ کو کہتے سنا تھا۔

''جہانگیر کی قبر پر جاؤں گی آج...... اتنے دن سے موقع ہی نہیں ملا، آگے بھی مصروف ہوں۔'' اُس نے بات بدل دی تھی جیسے اقصیٰ کو بتایا تھا کہ اُسے اس موضوع پر بات نہیں کرنی۔

☆☆☆

اُس نے سوندھی ہوا میں گہری سانس لیتے ہوئے جیسے اُس ہوا کو اپنے اندر اُتارنے کی کوشش کی۔ وہاں کچھ دیر پہلے جیسے بارش ہوئی تھی جو اب تھم گئی تھی لیکن راستے کی مٹی نم تھی اور اُس پر پڑے پتے بھی اور لکڑی کا وہ کاٹیج بھی جس کی طرف وہ جا رہا تھا۔

اُس خالی راستے پر اپنا ٹرالی بیگ کھینچتے ہوئے، دوسرے ہاتھ سے اپنی جیکٹ بازو پر ڈالے، وہ جیسے اپنے ماضی کو یاد کر رہا تھا۔ وہاں گزارے ہوئے کئی سال۔

وہ اس بار وہاں لمبے عرصہ کے بعد آیا تھا۔ لکڑی کے اُس کاٹیج کے سامنے جا کر وہ رُکا تھا جو اس ڈھلوانی راستہ کے ایک کونے میں ہمیشہ کی طرح خاموش اور اکیلا کھڑا تھا۔ بارش کے قطرے اب بھی کاٹیج کی چھتوں کے کونوں سے پھسلتے نیچے ٹپک رہے تھے۔ اپنا بیگ اُٹھائے وہ برآمدے کی لکڑی کی سیڑھیوں پر چڑھا تھا جو اُس کے قدموں کے بوجھ کے نیچے چُرمرائی تھیں۔ بالکل سامنے لکڑی کے دروازے پر لوہے کا وہ کنڈا اب بھی ویسے ہی موجود تھا جسے بجانے پر دروازہ کھلتا تھا مگر قلبِ مومن جانتا تھا وہ دروازہ ویسے ہی کھلا ہوا تھا۔ عبدالعلی کو عادت نہیں تھی دروازہ بند کرنے کی۔ دروازے پر ہاتھ رکھے وہ دروازے کو دھکیلتے دھکیلتے رُکا۔ پھر دروازہ دھکیلتے ہوئے اپنا بیگ لے کر اندر آ گیا۔

اندر سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا شاید کئی دہائیوں سے تھا۔ خطاطی کے شہ پاروں سے بھرے ہوئے در و دیوار، جگہ جگہ پڑے ہوئے چھوٹے بڑے ایزل۔ وہ شاید وہ کمرہ تھا جہاں پر عبدالعلی اپنے پاس آنے والے نوجوان طلبہ کو خطاطی سکھاتے تھے۔ مختلف اسٹائل آف کیلی گرافی اور وہیں ایک دیوار پر لگی بہت ساری کیلی گرافیز اُس نے پہچانی تھیں وہ اُس کے ہاتھ کی بنی ہوئی تھیں۔ اُس کے بچپن کی ناپختہ خطاطی کے نمونے اور پھر نوجوانی کی پختہ لکیریں۔ قلبِ مومن نے بے اختیار اُس دیوار سے نظریں چرائیں۔ وہ دیوار ہمیشہ اسی طرح اُسے اپنی طرف کھینچتی تھی اور وہ اسی طرح اپنے آپ کو اُس سے دور کرتا تھا۔

کمروں سے ہوتا ہوا وہ بے قدموں وہ گھر کے عقبی حصہ میں آ گیا تھا۔ وہاں لان میں اُس نے عبدالعلی کو کیاریوں سے جڑی بوٹیاں نکالتے دیکھا۔ وہ پنجوں کے بل بیٹھے کام کر رہے تھے اور وہ برآمدہ جہاں مومن کھڑا تھا اُس طرف اُن کی پشت تھی۔ مومن اسی بے آواز طریقے سے چلتے ہوئے اُن کے عقب میں آیا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا اُس نے عبدالعلی کو کہتے سُنا۔

''سوچا تمہارے آنے سے پہلے یہ کام بھی نپٹا لوں ورنہ تم کہو گے مجھے تمہارے لیے وقت نہیں ملتا۔''

وہ کہتے ہوئے کھڑے ہو کر پلٹے تھے اور مومن ہنس پڑا تھا۔ عبدالعلی کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اُس نے کہا۔

''آپ کو ہر بار میرے آنے کا پتا کیسے چل جاتا ہے؟'' اُن سے گلے لگتے ہوئے اُس نے پوچھا۔

''تمہاری خوشبو سے۔'' اُسے ساتھ لگاتے اُسے چومتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔

''یہ پرفیوم کی خوشبو ہے دادا۔'' اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔

Google

''تمہارے وجود کی بھی ہے...... خیریت سے پہنچ گئے؟'' عبدالعلی کہتے ہوئے اُس سے الگ ہوئے۔ ''ہاں پہنچ گیا، ٹیم تو کل استنبول پہنچے گی...... میں نے سوچا میں ایک دو دن آپ کے ساتھ گزار آؤں...... بہت عرصہ ہو گیا یہاں آئے۔'' مومن نے اُن کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ وہ اب اندر برآمدے کی طرف جا رہے تھے۔

''سامان رکھ لو پھر کھانا کھاتے ہیں۔ بھوک لگی ہو گی تمہیں۔'' انہوں نے اندرونی کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

''آپ کو انتظار تھا میرا؟'' مومن کُریدے بغیر نہیں رہ سکا۔

''وہ تو ہمیشہ ہی رہتا ہے۔'' وہ مسکرائے اور اندر چلے گئے وہ اُن کے پیچھے گیا۔

وہ اُس کا کمرہ تھا اب بھی ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ ایک دیوار پر اُس کے باپ کی ایک بہت بڑی تصویر جس میں وہ وجد کے عالم میں رقصاں درویش کے سفید لباس میں رقص کے انداز میں بازو پھیلائے ہوئے تھے۔ کمرے کی دیواروں پر اُس کی اور طٰہٰ کی اور بھی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ چھوٹے بڑے پرانے فریمز میں۔

''بالکل تمہارا چہرہ ہے۔'' عبدالعلی نے کمرے میں داخل ہو کر طٰہٰ کی تصویر دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ایک ہلکی بڑبڑاہٹ میں پھر پلٹ کر مومن سے تائید چاہی۔ ''ہے نا؟''

وہ اُن کی بات کا جواب دینے کے بجائے دیوار پر اُس تصویر کے برابر کھڑا ہو گیا اور اُس نے کہا۔ ''آپ بتائیں۔''

عبدالعلی آگے بڑھے اور اُس کا چہرہ اپنی نرم انگلیوں سے ٹٹولتے ہوئے بڑبڑانے لگے۔ ''ہاں سب کچھ ویسا ہی ہے۔''

''سب کچھ کیا؟'' مومن نے کُریدا۔

''آنکھیں، ناک، ہونٹ اور ضد۔'' وہ اُن کی بات پر بے اختیار ہنسا۔ ''اچھا اُن میں بھی تھی ضد؟'' اُس نے دلچسپی سے پوچھا تھا۔ عبدالعلی نے مسکراتے ہوئے زمین پر پڑا اُس کا بیگ اُٹھایا اور اسے باتھ روم کے دروازے کے پاس پڑی ایک میز پر رکھتے ہوئے بولے۔ ''مجھ میں بھی تھی ضد۔''

''آپ میں...... میں نہیں مانتا دادا۔'' مومن نے بے اختیار کہا۔ وہ اب کمرے کے بیچوں بیچ کھڑا اُنہیں دیکھ رہا تھا۔ عبدالعلی نے اُسے دیکھا، اُنہیں اُس پر طٰہٰ کا شائبہ ہوا۔ انہوں نے نظریں چرائیں۔ ''تمہارا باپ بھی بڑے سوال کیا کرتا تھا مجھ سے۔'' پتا نہیں کیا یاد آیا تھا عبدالعلی کو۔

''اچھا کیا پوچھتے تھے؟'' مومن نے دلچسپی سے پوچھا۔ ''وہی سوال کرتا تھا جو تمہارے تھے۔'' عبدالعلی نے مسکرا کر اُس سے کہا تھا۔

''آپ اُنہیں ڈانس سے منع کرتے ہوں گے یہ نہیں چاہتے ہوں گے کہ whirling درویش بنیں اور وہ ضد کرتے ہوں گے۔'' مومن نے خود ہی اندازہ لگایا۔

''نہیں، اس رقص سے تو منع کیا ہی نہیں تھا میں نے اُسے۔ وہ کیلی گرافی کرتا تھا، ہاتھ سے رنگ بکھیرتا تھا کینوس پر بھی تو اللہ کا نام لکھتا تھا...... اس سے کیا روکتا میں...... کیوں روکتا میں......؟ روکا تو بس کسی اور چیز سے تھا میں نے۔'' اُن کی آنکھوں اور آواز میں اُداسی جھلکی تھی۔

''کس چیز سے؟'' مومن سوال کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

''تم معاف نہیں کرو گے مجھے مومن...... نہ سوال کرو یہ۔'' اُس نے جیسے عبدالعلی کا کوئی کھرنڈ کُرید اتھا۔

''وہاں رات کو کیلی گرافی کرتے کرتے جھومنے لگتا...... پھر وہاں ناچتا رہتا...... مولانا رومی کے مصرعے پڑھتا...... کبھی اللہ کے ناموں کی تسبیح شروع کر دیتا۔ میں پوچھتا تمہیں کیا ہو رہا ہے...... کہتا تھا پتا نہیں کیا ہو رہا

Digitized by Google

ہے...... کوئی مجھے بلا رہا ہے...... کوئی ہے جسے میں بیان نہیں کر پاتا...... لیکن اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرا وجود جھومنے لگتا ہے......''

وہ جیسے مومن سے بات کرتے ہوئے اُس کمرے میں طٰہٰ کو ناچتے دیکھ رہے تھے۔ فرش پر چکر کاٹتے اُس کے پیر...... یہاں سے وہاں جاتے ہوئے۔ مومن کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا کہہ رہے تھے، کس کی بات کر رہے تھے۔

''انسان کی محبت نچوا سکتی ہے دادا...... اللہ کی محبت کیسے نچوا سکتی ہے...... یہ سمجھ میں نہیں آتا۔'' اُس نے کہا تھا اور عبدالعلی ہنسنے لگے تھے۔ پھر ہنستے ہی چلے گئے تھے۔ یہاں تک کہ اُن کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی تھی۔

''پھر تم انتظار کرو قلبِ مومن...... یہ راز بھی کھلے گا تم پر۔'' انہوں نے بڑے عجیب سے لہجے میں اُس سے کہا تھا۔ وہ اُن کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اُس نے مدھم آواز میں کہا۔

''آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا دادا۔''

''کس سوال کا؟'' عبدالعلی نے پوچھا تھا۔

''آپ نے اُنہیں کس کام سے روکا تھا؟'' ایک لمبی خاموشی آئی تھی۔ قلبِ مومن اور عبدالعلی ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے پھر قلبِ مومن نے عبدالعلی کو بڑبڑاتے سُنا۔

''حسنِ جہاں سے شادی سے۔'' اس بار قلبِ مومن کے پاس کوئی سوال باقی نہیں بچا تھا۔

☆☆☆

''فیصل آیا ہے اپنی امی کے ساتھ۔'' ثریا کی آواز میں ایسی خوشی اُس نے جہانگیر کے بعد پہلی بار سنی تھی، وہ اُس وقت فون پر اپنے ایجنٹ سے اپنے ٹکٹ کی بکنگ کی تفصیلات سنتے ہوئے کمرے میں ٹہل رہی تھی جب ثریا لپکتی جھپکتی کمرے میں آئی اور اُسے یہ خبر سُنا کر یہ کہہ کر چلی گئی تھی۔ ''جلدی سے کپڑے بدل کر آ جانا...... تمہارے ابا بھی ہیں۔ مجھے لگتا ہے خوش خبری لے کر آئے ہیں۔ مٹھائی لائے ہیں۔''

مومنہ کو نہ اُن کی بات ٹھیک سے سمجھ میں آئی تھی نہ ہی دوسری طرف ایجنٹ کی بات۔

''آپ مجھے کچھ دیر میں کال کریں۔'' مومنہ نے ایجنٹ سے معذرت کرتے ہوئے کال بند کی تھی اور پھر فون بند کر کے اُس نے جیسے یاد کرنے کی کوشش کی کہ ثریا کیا کہہ کر گئی تھی۔

''بڑا افسوس ہوا مجھے بھی جہانگیر کا سن کر، اللہ اُس کی مغفرت فرمائے اور آپ سب کو صبر عطا فرمائے...... یہ موقع تو نہیں تھا کہ میں ایسی بات کروں لیکن فیصل کی بڑی خواہش تھی کہ ہم آپ سے مومنہ کے لیے بات کرتے۔'' دروازے میں داخل ہونے سے بہت پہلے مومنہ نے فیصل کی امی کی آواز سن لی تھی اور وہ عجیب بے یقینی کی کیفیت میں وہاں ٹھٹکی تھی۔

''ہماری بڑی خوش قسمتی ہوگی اگر ہمیں فیصل جیسا بیٹا مل جائے...... یوں لگے گا جیسے جہانگیر کی کمی پوری ہو جائے گی۔'' خوشی سے کھنکتی یہ آواز سلطان کی تھی۔

مومنہ عجیب سی کیفیت میں اندر آئی تھی۔ اندر کمرے میں فیصل کی والدہ پسینے میں شرابور بیٹھی تھیں اور ثریا اُنہیں پنکھا جھلنے میں مصروف تھی کیونکہ لائٹ گئی ہوئی تھی۔ فیصل کی سفید ڈریس شرٹ بھی اس وقت پسینے سے نچڑی اُس کے جسم سے چپکی ہوئی تھی۔

''یہ لیں، مومنہ بھی آ گئی۔'' ثریا نے اُسے دیکھتے ہی چہکتے ہوئے کہا۔

''السلام علیکم۔'' اُس نے گڑبڑا کر سلام کیا تھا۔ فیصل کی امی اُٹھ کر اُس سے ملیں۔ اُس کو گلے لگایا، گال پر پیار کیا۔

''فیصل نے مجھے آپ کے آنے کا بتایا ہی نہیں۔'' مومنہ نے اُن کے پاس بیٹھتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا۔

Google

''اچھا...... کیوں فیصل؟'' فیصل کی والدہ کو اُس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا لیکن انہوں نے یہی ظاہر کیا تھا کہ اُنہیں یقین آگیا تھا۔

''بس میں نے سرپرائز دینا تھا تمہیں۔'' فیصل نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ اُسے مسکرا کر دیکھا۔

''میں بوتلیں لے کر آتا ہوں...... اتنی دیر کردی جھومر نے۔'' سلطان کو یک دم خیال آیا تھا مہمان ابھی تک پانی کے بغیر بیٹھے تھے۔

''کولڈ ڈرنکس کی کوئی ضرورت نہیں...... آپ انہیں منع کردیں۔'' فیصل کی امی نے جاتے ہوئے سلطان کو دیکھ کر ثریا سے کہا اور ساتھ ساتھ اپنے دوپٹے کے پلو سے خود کو ہوا دینے لگی تھیں۔

''نہیں نہیں، لانے دیں اُنہیں...... اتنی گرمی میں آئے بیٹھے ہیں آپ لوگ...... بس یہ بیڑا غرق ہو، کے الیکٹرک والوں کا...... وقت بے وقت بجلی غائب کردیتے ہیں۔'' ثریا نے سلطان کو نہیں روکا تھا۔

''عادت ہی نہیں رہی اب ائرکنڈیشنز کے بغیر کہیں بیٹھنے کی۔''

فیصل کی امی کے انداز میں نخوت نہیں تھی۔ وہ کچھ جتا بھی نہیں رہی تھیں اور مومنہ کو کوئی توہین بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اُن کے گھر اپنی مرضی سے آئے تھے۔ مومنہ سلطان کو کوئی طلب تھی نہ توقع وہ جیسے عجیب سکون میں تھی۔ زندگی میں ایسی قناعت بھی کبھی عطا ہوتی ہے۔

''تم کیا کر رہی ہو آج کل۔'' اُنہیں اچانک مومنہ سے پوچھنا یاد آیا۔ مومنہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر اُس سے پہلے ثریا بول اُٹھی۔

''آج کل تو کچھ بھی نہیں...... فلم کی آفر تھی مگر چھوڑ دی اُس نے۔'' ثریا جیسے کسی مجرم کی صفائیاں دے رہی تھی، مومنہ نے حیران ہو کر ماں کو دیکھا۔

''فلمیں تو ہوتی ہی واہیات ہیں یہاں...... اچھا کیا چھوڑ دیا...... اُن میں کام کر کے کیا کرنا۔'' فیصل کی امی نے بے اختیار کہا۔

''ہالی وڈ کی فلم تھی۔'' ثریا چھپاتے چھپاتے بھی بیٹی کی اچیومنٹ جتا گئی۔

''پھر تو اور بھی واہیات ہوگی۔'' فیصل کی والدہ کے جواب نے سب پر جیسے خاموشی طاری کردی تھی۔

''ممی! یہ دیکھیں، یہ خطاطی مومنہ کی ہے۔'' فیصل نے دیوار پر لگی ایک خطاطی دیکھ کر ماں کو اُس کی طرف متوجہ کیا۔

''اچھا۔ یہ بھی کر لیتی ہے۔'' اُس کی ماں کو جیسے پہلی اچھی چیز نظر آئی مومنہ سلطان کے فائن آرٹس کے پروفائل میں۔

''جب چھوٹی تھی نا تو اپنے ابا کا میک اپ باکس کھول کر لپ اسٹک نکال کر گھر کی ساری دیواروں پر یہی بناتی رہتی تھی۔ اسے بڑا شوق تھا آرٹسٹ بننے کا۔'' ثریا نے فخریہ انداز میں مومنہ سلطان کی ایک اور خصوصیت گنوائی۔ فیصل کی والدہ اسی طرح دوپٹے کے پلو سے اپنے آپ کو ہوا دیتی رہیں۔ کراچی کی گرمی نے اُن کے سارے سوال و جواب بُھلا کر رکھ دیے تھے۔

باہر گلی میں دروازے پر کھڑے سلطان نے بڑی خفگی سے جھومر سے وہ پلاسٹک کا شاپر پکڑا تھا جس میں وہ چار کولڈ ڈرنکس ڈالے شاپر جھلاتا ہلاتا تیزی سے آیا تھا۔

''کب سے بھیجا ہوا ہے تجھے جھومر! اور تو گھنٹہ لگا کر آئی ہے۔'' سلطان کہے بغیر نہیں رہ سکا۔

''گھنٹہ کہاں...... پینتالیس منٹ ہوئے ہوں گے زیادہ سے زیادہ۔'' جھومر کو اس دروغ گوئی پر غصہ آیا تھا۔

''وہ کریم کریانے والا تو دے ہی نہیں رہا تھا کیونکہ تیرا لمبا اُدھار ہے وہاں...... پر جب میں نے مومنہ

Digitized by Google

باجی کے رشتے کا بتایا تو دے دیں اُس نے بوتلیں مگر گرم آگ...... فریزر خراب تھا اُس کا...... میں آگے برف پکڑنے چلا گیا کہ تو نے اگلا کام یہ بتانا تھا...... اور تو میرا گھنٹہ گن رہا ہے۔" جھومر نے کلائی میں چڑھایا برف والا دوسرا شاپر بھی سلطان کو تھمایا۔

"چل بڑی مہربانی تیری۔" سلطان نے شاپر پکڑتے تیزی سے اندر جاتے ہوئے کہا۔ "فنکشن میں نے ہی کرنا ہے مومنہ باجی کا...... ابھی سے بتا رہی ہوں...... اور ولیمہ پر بھی جاؤں گی لڑکے والوں کے گھر تمہارے ساتھ۔" جھومر نے جاتے جاتے بالوں اور دوپٹے کو جھٹک کر آواز دی تھی۔

"ہاں ہاں...... تجھے کیسے پیچھے چھوڑ کر جائیں گے۔" سلطان نے ہنستے ہوئے کہا تھا اور سلطان اور جھومر کے درمیان ہونے والی یہ ساری گفتگو اندر کمرے میں بیٹھی فیصل کی امی نے پنکھا جھلتے ہوئے اپنے پسینہ خشک کرنے کی کوششوں کے دوران سنی تھی۔

"میں بس ذرا رسم کرنا چاہ رہی تھی...... اگلی بار انگوٹھی لائیں گے تو ساتھ ہی طے کرلیں گے شادی کی تاریخ۔" انہوں نے پرس کھول کر اُس کے اندر کچھ ڈھونڈنا شروع کیا۔

وہ بازار کی برف کے ساتھ اُس کولڈ ڈرنک کو پینے کا رسک نہیں لے سکتی تھیں جو شاید وہاں جعلی ہی ہوتی۔ بیٹے کی شادی وہاں طے کر کے جتنا بڑا رسک انہوں نے لینا تھا لے لیا تھا اب دوسرا رسک لینے پر وہ تیار نہیں تھیں۔ سلطان تب تک ٹرے میں بوتلیں اور گلاسوں میں برف ڈالے لنگڑاتا ہوا اندر آ گیا تھا۔ ٹرے اُس کے ہاتھ سے فیصل نے پکڑ کر میز پر رکھی تھی اور اس سے پہلے کہ سلطان یا ثریا، فیصل اور اُس کی ماں کو بوتلیں آفر کرتے، فیصل کی امی نے پانچ پانچ ہزار کے دو نوٹ مومنہ کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے اُس کی ہتھیلی بند کی تھی۔

"یہ لو بیٹا! بہت مبارک ہو...... اکلوتا بیٹا ہے میرا فیصل...... اُسے انکار نہیں کر سکتی تھی...... اس لیے میں ہی جھک گئی، اب اللہ کرے سب اچھا رہے۔" انہوں نے مومنہ کے ماتھے پر پیار کیا اور ساتھ ہی اپنے رنج اور افسوس کا اظہار بھی۔

"آپ کو مبارک ہو بہت بہت...... سب اچھا ہی رہے گا ان شاء اللہ۔" اپنی آنکھوں میں آئی نمی دوپٹے سے رگڑتے ہوئے ثریا نے کہا۔ وہ ضرورت مند تھے۔ ضرورت مند لفظ اور لہجے نہیں پکڑتے۔

"ارے منہ تو میٹھا کرواؤں میں سب کا ذرا باہر سے مٹھائی لا کر...... میں بھی کیسی بے وقوف ہوں، آرام سے بیٹھی ہو۔" ثریا یک دم اُٹھ کر باہر گئی تھی اور مومنہ ہونقوں کے انداز میں وہ دس ہزار ہاتھ میں پکڑے بیٹھی رہی۔

برآمدے میں آ کر ثریا رکی تھی۔ دوپٹہ آنکھوں پر رکھ کر اُس نے جیسے ایک سسکی بھری اور بڑبڑائی۔

"جہانگیر کچھ دن اور ٹھہر جاتا۔" آنسو بے قابو ہو کر اُس کی آنکھوں سے چھلکے مگر اُس نے دوپٹے سے آنکھیں رگڑتے ہوئے مٹھائی کا ٹوکرا کھولنا شروع کر دیا۔ جہانگیر کے لیے بہت رو چکی تھی۔ وہ اب مومنہ کے لیے ہنسنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

پیاز چھیلتی مومنہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور زندگی میں پہلی بار اُسے پیاز کی قدر و قیمت معلوم ہوئی تھی۔ وہ اُس کی آنکھوں کے سوکھے چشموں کو نم کر گئے تھے۔

"کیا ضرورت ہے خوامخواہ میں پیاز چھیلنے بیٹھنے کی...... بس بند کر یہ ہانڈی چولہا...... میں خود کرلوں گی آج سے سب کچھ۔" ثریا نے آ کر اُس سے سبزی کاٹنے کی چھری اور برتن لیا تھا۔ فیصل اور اُس کی والدہ کو گھر سے نکلے کچھ دیر ہی ہوئی تھی اور وہ کھانا بنانے کے لیے باورچی خانہ نما اُس چھوٹی سی جگہ میں آ گئی تھی جو انہوں نے برآمدے کے ایک کونے میں ہی چولہا رکھ کر بنائی ہوئی تھی۔

Google

"اماں! ابھی سے مایوں بٹھائیں گی کیا...... ابھی تو 'ہاں' کر کے گئے ہیں وہ لوگ۔" اُس نے ماں کا مذاق اُڑایا تھا۔

"ہاں ہاں، ابھی سے مایوں بٹھاؤں گی۔ جا کر آنکھیں صاف کر...... کیسے سرخ ہو رہی ہیں۔"

ثریا سے اُس کی آنکھوں کا پانی جیسے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ مومنہ نے چوکی پر بیٹھے بیٹھے دوپٹے سے آنکھیں رگڑیں۔ جو کچھ ابھی کچھ دیر پہلے ہوا تھا وہ اب بھی اُسے کسی خواب کی مانند ہی لگ رہا تھا۔ مٹھائی کا ادھ کھلا ٹوکرا جو آدھا تقریباً خالی تھا اور اُس کے قریب پڑی وہ مٹھائی کی پلیٹ جس میں سے فیصل کی امی نے اُس کو مٹھائی کھلائی تھی۔ وہ سب کچھ برآمدے میں ہی باورچی خانہ کے چولہے کے پاس پڑے تھے۔ کولڈ ڈرنکس بھی اُسی ٹرے میں رکھی ہوئی تھیں اور گلاسوں میں پڑی ہوئی برف اب پانی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اور ان سب چیزوں کے بیچوں بیچ مومنہ سلطان اُس چوکی پر اپنے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے یوں بیٹھی ہوئی تھی جیسے وہ ابھی ابھی ان سب چیزوں کے ساتھ پتھر سے گوشت پوست کے جیتے جاگتے وجود میں تبدیل ہوئی ہو۔ وہ سناٹا جو جہانگیر نے اُس گھر پر طاری کیا تھا۔ وہ فیصل نے جیسے توڑ دیا تھا۔

"معجزے صرف پیار میں ہوتے ہیں۔" مومنہ کو اقصیٰ کی بات یاد آئی اور وہ بات سے بھی زیادہ۔

"اقصیٰ کو تو بتا دے فون پر۔" ثریا کو بھی اقصیٰ اُسی لمحے یاد آئی تھی جیسے کوئی ٹیلی پیتھی ہوئی تھی۔

"فون بند تھا اُس کا اماں۔ شوٹ پر ہے وہ۔" مومنہ نے جواباً کہا۔ تب ہی سلطان ایک خالی ٹرے پکڑے بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوا تھا۔

"یہ پکڑ، پورے محلے میں بانٹ آیا مٹھائی۔ مبارکیں دے رہے تھے سب۔" مومنہ نے سلطان کے کھلے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

"خیر مبارک۔" ثریا نے ہنستے ہوئے جواباً کہا تھا۔

"وہ جھومر کے لیے رس گلے اور گلاب جامن الگ سے نکال دینا...... لڈو لینے سے صاف انکار کر دیا اُس نے ...... شام کو آئے گی وہ اپنا حصہ لینے۔" سلطان نے اُسی طرح ہنستے ہنستے بتایا۔

"ہاں ہاں لے لے سارے رس گلے...... اُس سے رس گلے اچھے ہیں کیا؟" ثریا ہنسی تھی۔

"اتنی لمبی گاڑی تھی ان لوگوں کی ...... محلے والوں کو تو پہلے ہی کرید لگ گئی تھی۔ پہلے تو سمجھ رہے تھے، کوئی پروڈیوسر آیا ہے۔" سلطان کرسی کھینچ کر برآمدے میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ماشاء اللہ، اللہ نے کیسا نصیب کھولا ہے میری مومنہ کا...... شہزادہ بیاہ لے جائے گا یہ لمبی گاڑی میں...... بڑے سے گھر میں رہے گی...... نظر نہ لگے۔" ثریا نے اُس کی بلائیں لیں۔ مومنہ مسکرا دی تھی۔ اُس کے خوابوں کی ریل گاڑی اتنی لمبی نہیں تھی جتنی سلطان اور ثریا کی تھی۔ اُس نے اُنہیں ٹوکا نہیں تھا۔ اُس گھر میں اتنے عرصہ بعد ایسی خوشی آئی تھی۔

"بیگم صاحبہ بن کر آیا کرے گی اب تو اپنی گاڑی میں ہم سے ملنے۔" سلطان نے بھی بڑے فخریہ انداز میں اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ابا! میں بس سے ہی آ جایا کروں گی۔" مومنہ نے یک دم کہا۔

"نہ نہ، گاڑی میں ہی آنا...... بہت کھا لیے بسوں اور ویگنوں کے دھکے...... اب اللہ دے رہا ہے تو ناقدری کیوں کرے گی؟" ثریا نے فوراً اُسے ٹوکا تھا۔

"اور پیدل آئے گی۔ کوئی پرس چھین کر بھاگ گیا تو...... اور دیکھ زیور وغیرہ پہن کر بالکل مت آنا یہاں۔" سلطان کو ایک اور خدشہ ہوا۔ مومنہ بے اختیار ہنسی۔

''کیا خیالی پلاؤ چل رہے ہیں ابا...... میں مومنہ سلطان ہوں...... ساری عمر گزاری ہے اس محلے میں...... کون چھینے گا میرا پرس؟''

''مومنہ سلطان سے نہیں چھینتے تھے۔ مومنہ فیصل سے چھین لیں گے...... بتا رہا ہوں تجھے، اپنی برادری کا پتا ہے مجھے۔'' سلطان نے اُسی سنجیدگی سے کہا اور تب ہی مومنہ کا فون بجنے لگا تھا۔

''فیصل کا فون آرہا ہے۔'' وہ فون لے کر یک دم اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''ہاں ہاں جا سن لے۔'' ثریا نے فوراً کہا۔ مومنہ فون لیے اندر کمرے میں چلی گئی۔

''کیسے چہرہ کھل گیا ہے پل بھر میں۔'' ثریا مسکرائی۔

''ماشاءاللہ بول۔'' سلطان نے ٹوکا۔

''دل میں بولا ہے میں نے۔'' ثریا نے بے ساختہ کہا۔

''دن پھرنے لگے ہیں ہمارے ثریا...... دیکھ۔'' سلطان نے اوپر چھت کو دیکھتے ہوئے آہ بھری تھی۔ ''اس کے انتظار میں ہی عمر گزاری تھی ہم نے...... اچھا وقت آگیا ہے۔''

سلطان بڑبڑایا مگر جو اُس کے لبوں پر نہیں آیا تھا۔ وہ ثریا کے کانوں تک پہنچ گیا تھا۔ اُس نے بھی جہانگیر کو یاد کیا تھا۔

☆☆☆

''تم سے کہا تھا نا، میں پھر آؤں گا۔'' فیصل نے اُس کی آواز سنتے ہی کہا تھا۔ مومنہ ہنس پڑی۔

''یہ سب کیسے ہوا؟'' اس کے پاس آج سوال کے لیے بھی صحیح لفظ نہیں تھے۔

''بس دیکھو ہو گیا...... میری محبت کی صداقت۔'' وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''یقین آیا؟''

''کر رہی ہوں۔''

''کل ملیں؟ لنچ یا ڈنر؟'' اُس نے فوراً کہا تھا۔

''لنچ۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ بس پھر کل ہی ملتے ہیں۔ تم سے کچھ بہت ضروری باتیں بھی کرنی ہیں اور تمہاری رنگ کا سائز بھی چاہیے مجھے...... ممی آج بھول گئی تھیں۔'' فیصل ایسا ہی تھا۔ اُسے بہت کچھ اکٹھا یاد آرہا تھا۔

''چڑیل کمینی...... بیٹھے بٹھائے اتنا بڑا کارنامہ اور مجھ سے رازداریاں۔'' اُس نے فون ابھی بند ہی کیا تھا جب اقصیٰ اُسی طرح شور مچاتی اندر داخل ہوئی تھی اور آکر اُس سے لپٹی تھی۔

''تمہیں پتا کیسے چلا؟'' مومنہ ہنسنے لگی تھی۔

''انکل کا فون آیا تھا مجھے...... شوٹ چھوڑ کر آگئی ہوں...... آئی ایم سو ہیپی فار یو۔'' وہ پرجوش انداز میں اُسے جھنجھوڑتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''ذرا دیکھو اپنا چہرہ کیسے چمک رہا ہے۔'' وہ اُسے کھینچتے ہوئے کمرے میں لگے آئینے کے سامنے لے گئی تھی۔ ''دیکھو دیکھو، کیا یہ تم ہو؟'' وہ اُسے چھیڑتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

مومنہ نے اُس سے بازو چھڑایا اور ہنستے ہوئے آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

''بس کرو اب۔'' وہ اب بلش ہو رہی تھی۔

''شادی وغیرہ کا کیا سلسلہ ہے؟'' اقصیٰ نے فوراً پوچھا تھا۔

''جلد ہی کرنا چاہتے ہیں وہ شاید ایک آدھ مہینے میں۔'' اُس نے جواباً بتایا۔

''مگر ابھی تو تمہیں امریکہ جا کر اپنی فلم کی شوٹنگ مکمل کروانی ہے۔'' اقصیٰ کو فوراً یاد آیا۔

URDU TURF
A HOME OF ENTERTAINMENT

Google

''ہاں ظاہر ہے فلم کے تو بعد ہی ہوگا...... میں ویسے بھی مل رہی ہوں فیصل سے کل...... تو پتا چل جائے گا کہ کب شیڈول ہوگی۔'' مومنہ نے بتایا۔

''اوہو ملاقاتیں بھی شروع۔'' اقصیٰ نے چھیڑا۔

''اچھا اچھا تنگ مت کرو مجھے...... داؤد کیسا ہے؟ اُس کو بتایا؟'' مومنہ نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

''وہ تو ترکی چلا گیا ہے مومن کی فلم کی ریکی کرنے...... رات کو فون کروں گی تو بتاؤں گی۔'' اقصیٰ نے فوراً کہا۔

''آج مومن کا نام مت لو میرے سامنے۔'' مومنہ نے بے اختیار کہا۔ ''میں داؤد کا بُرا نہیں چاہتی مگر تم دیکھ لینا، اقصیٰ! یہ فلم نہیں بنے گی...... بنے گی تو فلاپ ہوگی...... اُسے اتنا نقصان ہوگا کہ اُس نے جو کمایا سب گنوائے گا...... میں نے زندگی میں کسی کو بددعا نہیں دی لیکن قلبِ مومن کے لیے میرے دل سے آج بھی بددعاؤں کے علاوہ کچھ نہیں نکلتا۔''

اقصیٰ اُس کے سامنے کچھ کہہ نہیں سکی۔ وہ خوشی کے اس لمحے میں کیا سوچ کر آتش فشاں بنی تھی۔ وہ جانتی تھی۔

''سب بھول جاؤ...... سب پیچھے رہ گیا۔'' اقصیٰ نے اُسے بہلایا تھا۔

''یہ ایک فلم میں وقت پر سائن کر لیتی تو آج جہانگیر......'' وہ کہتے کہتے رُکی تھی...... آگے کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ خاندان جہانگیر کو مکمل بھول جانے میں ابھی کئی دہائیاں لیتا۔

☆☆☆

''مومن بھائی! ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔'' وہ رات کو سونے کے لیے لیٹنے لگا تھا جب اچانک داؤد کا فون آیا تھا۔ قلبِ مومن کو پہلا خیال فلم کی ریکی سے متعلق آیا تھا۔

''کیا ہوا؟'' اُس نے کچھ متفکر ہو کر پوچھا۔

''آپ نے سوشل میڈیا پر جا کر اپنی تصویریں دیکھیں؟'' داؤد نے کچھ جھجکتے جھجکتے کہا۔

''کون سی تصویریں؟'' وہ اُلجھا۔ ''وہ کسی نے آپ کی کچھ پکچرز لیک کر دی ہیں سوشل میڈیا پر...... کچھ پرسنل قسم کی...... تو وہ وائرل ہو گئی ہیں۔''

مومن ہکا بکا ہو گیا تھا۔ ''میں دیکھتا ہوں...... بس یہی مسئلہ تھا؟''

''نہیں، وہ اختر بھائی نے لیگل نوٹس بھیجا ہے آفس کے ایڈریس پر۔'' داؤد نے بالآخر وہ مسئلہ بتایا جس کے لیے اُس نے فون کیا تھا۔

''لیگل نوٹس، کس لیے؟'' وہ حیران ہوا۔ ''ایک کروڑ مانگ رہے ہیں ڈیمجز میں صنم کے اسکرپٹ سے علیحدہ کیے جانے پر۔''

مومن کے ہونٹ بھنچ گئے۔ ''اُس کا دماغ خراب ہو گیا ہے...... ایک کروڑ اُس نے کبھی خواب میں بھی دیکھا ہے؟'' وہ بے ساختہ خفا ہوا تھا۔

''مجھے لگتا ہے اس سب کے پیچھے کوئی ہے...... مجھے یہ ڈر ہے اختر بھائی بھی سوشل میڈیا پر نہ چلے جائیں۔'' داؤد نے نیہا کا نام لیے بغیر جیسے اُسے خبردار کیا۔

''میں جانتا ہوں کون ہے اس سب کے پیچھے۔ اور جو ہے اُس کو بھی دیکھ لوں گا۔''

مومن نے کہتے ہوئے فون بند کیا اور لیپ ٹاپ پر اُس نے وہ لنکس کھول لیے جو داؤد نے اُسے بھیجے تھے۔ تصویروں پر نظر پڑتے ہی جیسے اُس کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا تھا۔ وہ اُس کی ساحل پر کچھ ماڈلز کے ساتھ تصویریں تھیں اور وہ تصویریں نیہا کے علاوہ کوئی اور اُس کے فون سے نہیں نکال سکتا تھا۔ وہ تصویریں فیس

Digitized by Google

بک اور ٹوئٹر پر مختلف فلم اور ٹی وی کے پیجز نے شیئر کر رکھی تھیں اور اُن تصویروں کے نیچے دیکھنے والوں کی آراء تھیں۔ تھرڈ کمنٹس میں قلبِ مومن اور اُن ماڈلز کو ہر طرح کی گالیاں دی جا رہی تھیں۔ قلبِ مومن نے چند کمنٹس پڑھنے کے بعد مزید کمنٹس پڑھنے بند کر دیے تھے۔ وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ اس وقت اگر وہ پاکستان میں ہوتا تو اُس کی ان ساتھی ماڈلز کی طرف سے آنے والی کالز نے بھی اُس کی زندگی اجیرن کر دی ہوتی کیونکہ وہ پرسنل تصویریں تھیں اور اُن میں سے ہر ایک یقیناً یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ تصویریں قلبِ مومن نے شیئر کی تھیں اور اپنی ان گرل فرینڈز کے سامنے قلبِ مومن کو اب جس طرح کی صفائیاں اور وضاحتیں دینی تھیں۔ قلبِ مومن کو اُن کی سنگینی اور نزاکت کا اندازہ تھا، نیہا کے علاوہ یہ کام کوئی اور نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اُس کے فون تک صرف نیہا ہی کو رسائی تھی۔

اُس نے اگلی کال نیہا کو کی تھی مگر نیہا نے کال ریسیو نہیں کی تھی۔ قلبِ مومن جلتا بھنتا اُس کو بار بار کالز کرتا رہا۔ اُس کی کوئی کال اٹینڈ نہیں ہوئی تھی۔ اُس کے چھوڑے ہوئے کسی میسج کا جواب نہیں آیا تھا اس کے باوجود کہ وہ دیکھ لیے گئے تھے۔

☆☆☆

''تم کیا رات کو سوئے نہیں؟'' وہ اگلی صبح دادا کے کمرے میں آیا تو انہوں نے اس کا چہرہ دیکھتے ہی کہا تھا۔

''ہاں بس نیند نہیں آئی مجھے...... نئی جگہ پر نیند نہیں آتی مجھے۔'' مومن نے جیسے گول مول انداز میں جواب دیا تھا۔ اُس کا ذہن مسلسل اُلجھا ہوا تھا۔

''یہ نئی نہیں، یہ تو پرانی جگہ ہے۔'' دادا نے جیسے اُسے یاد دلایا۔ وہ جواب دینے کے بجائے اُس ایزل کے سامنے کھڑا ہو گیا جس پر رکھے کینوس پر وہ کچھ پینٹ کر رہے تھے۔

''اسے پہچانتے ہو؟'' دادا نے یک دم دیوار پر لگی ایک کیلی گرافی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُس سے کہا۔ مومن نے گردن موڑ کر اُس کیلی گرافی کو دیکھا۔ ایک چھوٹے سے کینوس پر صرف اللہ کا لفظ لکھا ہوا تھا...... بہت خوبصورت رنگوں لیکن بے حد غیر ہموار لکیروں میں۔ وہ اُس کی اپنی خطاطی تھی۔ اُس کی پہلی خطاطی جب وہ دادا کے پاس آ گیا تھا۔ اُسے یاد آیا۔ اس گھر میں گزارا ہوا پہلا دن۔

''میں نے لکھ لیا۔'' قلبِ مومن نے فخریہ انداز میں عبدالعلی سے کہا تھا۔

''بہت خوب صورت لکھا۔'' انہوں نے اُسے داد دی تھی۔

''لیکن بس اللہ کا الف تھوڑا ٹیڑھا ہو گیا...... ہے نا دادا؟'' قلبِ مومن نے الف پر انگلی پھیرتے ہوئے جیسے کچھ تشویش سے اپنے دادا سے کہا تھا۔

''جب بار بار اللہ کا نام لکھتے رہو گے تو سب کچھ سیدھا ہو جائے گا...... الف بھی۔'' عبدالعلی نے اُس کے ہاتھ سے برش لے کر اس کے الف پر پھیرتے ہوئے اُسے جیسا سیدھا کرنے کی کوشش کی تھی مگر کیا نہیں تھا۔

ایک جھماکے کے ساتھ وہ سین ذہن پر لہرایا تھا اور اُسی طرح غائب ہو گیا تھا۔ قلبِ مومن نے انگلی الف پر پھیرتے ہوئے دادا سے کہا۔

''الف آج بھی ٹیڑھا ہے میرا۔''

''تم نے اللہ کا نام لکھنا بھی تو چھوڑ دیا ہے اب۔'' اُسے اپنے عقب میں عبدالعلی کی آواز آئی۔

''ہاں شاید میں مومن ہوں نا...... ساری غلطی ہمیشہ مومن ہی کی ہوتی ہے...... آئیں ناشتہ کرتے ہیں۔'' اُس نے عجیب سے انداز میں کہہ کر جیسے اپنی احساسِ ندامت اور احساسِ جرم کو جھٹکا تھا اور کمرے سے چلا گیا تھا۔

☆☆☆

وہ پہلی بار کسی ڈرامہ کی شوٹنگ کے لیے نہیں آج اپنے لیے تیار ہوئی تھی اور بار بار اُسے لگ رہا تھا جیسے بہت تیز میک اپ کر لیا تھا۔ کچھ زیادہ ہی بلو ڈرائی کر لیے تھے بال۔

ریسٹورنٹ میں لنچ کے لیے فیصل کے بالمقابل بیٹھی وہ پہلی بار نروس ہو رہی تھی۔ اُس کی مسکراہٹ اور نظروں سے۔ اپنے ہاتھوں میں پہنی ایک امیٹیشن انگوٹھی اُس نے چند لمحے پہلے فیصل کو تھمائی تھی اور وہ انگوٹھی ابھی تک فیصل کے ہاتھ میں تھی جو وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں اپنی انگلیوں میں گھما رہا تھا۔

''سب باتیں کر رہے ہوں گے آج...... سیٹ سے آئی ہوں اور پہلی بار اس طرح کسی مرد کے ساتھ سیٹ سے کہیں گئی ہوں۔'' مومنہ نے ہنستے ہوئے اُسے بتایا تھا۔ وہ ایک سیریل کے سیٹ پر اپنا کام وائنڈ اپ کروا رہی تھی جہاں سے فیصل نے اُسے پک کیا تھا۔

''اندازہ ہے مجھے، اس لیے تو نہیں چاہتا کہ تم اس انڈسٹری میں کام کرو۔'' فیصل یک دم سنجیدہ ہوا تھا۔

''میں سمجھی نہیں۔'' اُس کی مسکراہٹ بھی غائب ہو گئی تھی۔

''کیا؟'' فیصل اُس کے سوال پر حیران ہوا تھا۔

''کام نہ کرنے والی بات۔'' مومنہ نے کہا۔

''آنٹی نے کہا تھا، تم انڈسٹری چھوڑ رہی ہو اور اب کام نہیں کرو گی اسی لیے تو میں اپنے پیرنٹس کو منا پایا۔ آنٹی نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اور انکل بھی اس فیلڈ کو چھوڑ دیں گے۔'' فیصل نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ مومنہ اُس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

''انہوں نے کہا تھا کہ وہ اپنا کام چھوڑ دیں گے؟'' اُسے یقین نہیں آیا۔

''ہاں۔ کیا تم سے بات نہیں ہوئی اُن کی؟''

''نہیں۔'' مومنہ نے جواباً کہا۔

''کوئی بات نہیں، اب کر لیتے ہیں آج میں اسی مسئلے پر بات کرنا چاہتا تھا تم سے تاکہ کلیرٹی ہو جائے سب باتوں پر۔'' فیصل نے اطمینان سے کہا تھا۔

''آنٹی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اب گانا گانا چھوڑنا چاہتی ہیں اور انکل بھی اب میک اپ آرٹسٹ کے طور پر فلمز میں کام نہیں کریں گے۔''

مومنہ کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزرا تو اُس کے ماں باپ نے اپنا فن پہلی بار بیچ دیا تھا اُس کے مستقبل کے لیے۔ اُسے تکلیف ہوئی۔

''اور پھر وہ کیا کریں گے؟ کہاں سے کھائیں گے؟'' اس نے فیصل سے پوچھا۔

''میں سپورٹ کروں گا اُنہیں...... مجھے اندازہ تھا کہ وہ کام چھوڑیں گے تو اُنہیں مشکلات آئیں گی۔ جہانگیر کے علاج کی بات اور تھی لیکن گھر کا خرچ تو میں چلا سکتا ہوں، اُن دونوں کا۔'' اُسے فیصل کی اعلاظرفی اور نیت پر شبہ نہیں تھا پھر بھی وہ شرمسار ہوئی تھی۔

''فیصل یہ سب آسان نہیں ہے۔'' اُس نے اُسے ٹوکا۔

''میں بنا دوں گا۔'' وہ جواباً بولا۔

''تمہیں اندازہ نہیں ہے، پچھلے کئی سالوں سے جہانگیر کی وجہ سے ہم پر کتنا قرضہ جمع ہو گیا ہے۔''

''کتنا قرضہ ہے؟'' فیصل نے اُس کی بات کاٹ دی تھی۔

''آٹھ دس لاکھ شاید اس سے بھی زیادہ...... چھوٹی چھوٹی رقمیں ہیں مگر بہت لوگوں کو پیسے واپس کرنے ہیں

Digitized by Google

ہم نے۔"

"میں ادا کروں گا وہ سارا قرضہ...... آٹھ لاکھ...... دس لاکھ جتنا بھی ہے...... تم بس یہ کام چھوڑ دو۔" فیصل نے دوٹوک انداز میں اُس سے کہا۔

"تم کیوں دو فیصل؟ آخر تم کیوں دو؟" وہ جذباتی ہوئی تھی۔ "میرا بھائی تھا وہ، میں نے لوگوں کے سامنے اُس کے لیے ہاتھ پھیلایا تھا۔ پھر اب دوسروں کا احسان اور خیرات لے کر اُس کا قرض کیوں اُتاروں میں؟"

فیصل اُس کے جملے پر جیسے ہرٹ ہوا۔ "میں تمہیں خیرات دوں گا؟"

"مجھے خیرات ہی لگ رہی ہے۔"

"نہیں ہے خیرات...... نہ ہی احسان ہے......"

"میرے ہاتھ دیکھو...... کیا تمہیں لگتا ہے، یہ ہاتھ کما نہیں سکتے؟ قرض ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے؟ پھر میں تم سے کیوں لوں؟"

مومنہ نے اسے اپنے ہاتھ دکھائے تھے۔ اُس نے ایک نظر اُس کے ہاتھوں پر ڈالی پھر بے ساختہ کہا۔

"لیکن تم ہاتھوں سے نہیں کماتیں مومنہ۔" مومنہ کو جھٹکا لگا۔

"پھر کیسے کماتی ہوں میں؟"

"چہرہ اور جسم دکھا کر۔" فیصل نے روانی میں کہا اور بات کہنے کے بعد اُسے جیسے پچھتاوا ہوا، مومنہ کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ فیصل نے یک دم اپنی آواز کو نرم کیا۔

"ابھی تم ٹی وی کر رہی ہو پھر تم فلم کرو گی...... مرد کیسے دیکھتا ہے اسکرین پر نظر آنے والی ایکٹریس کو...... تمہیں مجھ سے بہتر پتا ہے۔ میں اتنا لبرل نہیں ہوں کہ کبوتر بن کر آنکھیں بند کر لوں۔ میں تمہاری اور تمہارے ماں باپ کی ذمہ داری اُٹھا سکتا ہوں...... دل و جان سے اُٹھاؤں گا...... پیار میں احسان نہیں ہوتا۔ حق ہوتا ہے...... مومنہ! کچھ تو بولو۔" اُس نے بات کرتے کرتے مومنہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر جیسے اُسے متوجہ کیا تھا۔

"کیا بولوں؟ تم نے کچھ بولنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا مجھے۔" اُس نے ہاتھ کھینچتے ہوئے رنج سے کہا تھا۔

"میں تمہیں ہرٹ نہیں کرنا چاہتا لیکن یہ سب کچھ صرف میں نہیں ساری دُنیا کہتی ہے اور کہتی رہے گی۔ تمہیں یاد نہیں، تم تو خود ایکٹنگ کو حرام سمجھتی تھیں، خود کہتی تھیں کہ مجبوری میں کر رہی ہو۔ اب تو کوئی مجبوری نہیں ہے۔"

"تمہارے پاؤں میرے جوتے میں نہیں ہیں اس لیے تمہیں میرے حالات کا اندازہ اور احساس نہیں ہے۔" وہ رنجیدگی سے بولی تھی۔

"لیکن مجھے ایک موقع دو۔ میں یہ سارا قرض ادا کر دوں گی...... تمہارے پاس آجاؤں گی پھر اُس کے بعد......"

"فلم نہیں مومنہ! میں تمہارا فلم میں کام کرنا قبول نہیں کر سکتا۔" فیصل نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"اور ٹی وی میں کئی سال چھوٹے موٹے رول کر کے بھی یہ قرض ادا نہیں کر پاؤں گی...... یہ ایک فلم میرا سارا قرض اُتار دے گی۔"

فیصل کچھ جھنجھلایا۔ "جب میں تیار ہوں تمہارے لیے سب کچھ کرنے کے لیے تو تم کیوں نہیں مان رہیں میری بات؟ یا میں یہ سمجھ لوں کہ تمہیں بھی شہرت کا چسکا لگ گیا ہے...... میرے پیرنٹس پہلے ہی کہتے ہیں کہ ایک بار ٹی وی پر آجانے والی گھر میں بیٹھ کر گھر داری نہیں کرے گی۔"

وہ اُس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی۔ فیری ٹیل کا شہزادہ اتنی زہر آلود باتیں تو نہیں کرتا۔ اُس نے سوچا تھا اور شہرت

Google

کا چسکہ کیا تھا جس کا طعنہ وہ اُسے دے رہا تھا۔ اُس نے سوچا تھا۔

''اس شہرت سے میں نے کچھ نہیں کمایا...... جہانگیر کے علاج کے پیسوں کے علاوہ، تم مجھے جانتے ہو پھر بھی یہ کہہ رہے ہو۔''

''میں نہیں کہتا یار...... میرے ماں باپ کہتے ہیں...... انہیں منا تو لیا ہے میں نے...... لیکن بڑا مشکل کام ہے یہ یار...... اس لیے کہہ رہا ہوں تم ہی بات مان لو میری...... ممی تمہاری فلم کا سن کر پھر بگڑی ہوئی ہیں...... پلیز مومنہ......'' فیصل نے اُس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ وہ چپ بیٹھی رہی تھی۔ وہ مشکل میں تھی اور فیصل کو یہ لگ رہا تھا وہ اُس سے بڑی مشکل میں تھا۔

''کھانا آ گیا...... کھانا کھاتے ہیں...... بس۔'' فیصل کو یک دم خیال آیا تھا۔ وہ اُس سے مستقبل کی اور بھی اچھی اچھی باتیں کرنے کے لیے اُسے باہر لایا تھا۔

مومنہ خاموش ہو گئی تھی۔ فیصل نے اُس مہنگے ریسٹورنٹ کی سب سے مہنگی ڈشز اُس کے لیے منگوائی تھیں اور کچھ دیر پہلے کہے گئے تلخ جملوں کی تلخی کو مٹانے کے لیے جیسے اب اُسے خود سرو کرنے لگا تھا۔ ساتھ اُس سے ہلکی پھلکی گپ شپ کرنے لگا تھا۔ وہ اُس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اُس کی باتیں سنتی رہی۔

''مجھے تمہاری یہ عادت ہمیشہ سے پسند ہے۔'' فیصل نے یک دم کہا۔

''کیا؟'' وہ چونکی۔

''تم بہت توجہ سے بات سنتی ہو۔ دوسری لڑکیوں کی طرح اپنی بات نہیں کہتیں۔'' وہ اُسے خوش کرنے کی کوشش کر رہا تھا یا واقعی سراہ رہا تھا۔ مومنہ کو اندازہ نہیں ہوا۔ اُس نے اپنی پلیٹ سے اگلا لقمہ لیا تھا۔ پھر ایک اور...... پھر ایک اور...... کبھی کبھار بھوک مر جانے پر بھی انسان زبردستی اُسے کھانے کی کوشش کرتا ہے، بس اپنی عزت نفس اور خودداری کے لیے۔ پریوں کی کہانی میں شہزادی کو شہزادے کے لیے اور کیا کیا سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔ اُس نے اسٹیک کے اُس ٹکڑے کو چند مشرومز کے ساتھ اپنے کانٹے میں پروتے ہوئے سوچا تھا۔

☆☆☆

وہ ایک شان دار لمبی سی گاڑی میں اپنے گھر کے دروازے سے کچھ فاصلے پر اُترنے لگی تو فیصل نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اُس کا ہاتھ تھاما۔

''تھینک یو۔'' مومنہ نے اُس کا چہرہ دیکھا۔

''کس لیے۔''

''اس فیصلے کے لیے...... میں سوچ رہا ہوں رنگ کا سائز لینے کے بجائے تمہیں ساتھ لے کر تمہاری مرضی کی رنگ دلواؤں۔'' اُس نے کہتے ہوئے اُس کی امیٹیشن رنگ واپس کر دی تھی۔ مومنہ نے اُس رنگ کو اپنی اُسی انگلی میں پہن لیا جس سے اُتار کر اُس نے اُسے فیصل کو دی تھی۔

''پھر ویک اینڈ پر لینے آتا ہوں تمہیں رنگ پسند کروانے کے لیے۔'' فیصل نے اُس سے کہا۔ مومنہ نے اُس کا چہرہ دیکھا۔ وہ محبت کا چہرہ تھا۔ اُس کی زندگی کی پہلی محبت کا۔ ساری پاکیزگی، ساری معصومیت، ساری جذباتیت والی محبت...... جیسے پوسٹ کارڈ پر ایک پرفیکٹ پکچر والی محبت...... وہ اُس محبت کو ویسے ہی رکھنا چاہتی تھی۔ وہ مسکرائی تھی۔

''خدا حافظ۔'' وہ کہتے ہوئے اُس کا ہاتھ تھپک کر گاڑی سے اُتر گئی۔ فیصل اُسے جاتا دیکھتا رہا...... ویسی ہی محبت سے...... محبت کا المیہ یہ ہوتا ہے کہ اُسے ایک دوسرے کو پہچاننا آتا ہے، پڑھنا نہیں۔

☆☆☆

Digitized by Google

"پہلے تو میں نے اُسے صرف فلم سے نکالا تھا۔ اب میں اُسے سڑک پر لے آؤں گا...... دو ٹکے کا رائٹر ہے وہ...... اوقات کیا ہے اُس کی؟ ...... میں نے بریک نہ دی ہوتی تو آج بھی دھکے کھا رہا ہوتا...... احسان فراموش، گھٹیا آدمی۔" قلبِ مومن فون پر پوری قوت سے دھاڑ رہا تھا اور فون پکڑے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں ٹہلتے ہوئے اُسے یہ اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ ٹینا کے ساتھ ہونے والی وہ فون کال عبدالعلی بھی سن رہے ہوں گے۔

"سارا پرابلم نیہا کی وجہ سے ہو رہا ہے ورنہ اختر کی اتنی جرأت نہیں تھی۔ اسے وکیل بھی نیہا نے کر کے دیا ہے۔ ورنہ اختر تو اب بھی بہت ڈرا ہوا ہے اور پیچ اپ کی بات کریں فوراً تیار ہو جائے گا۔"

"نیہا کو تو دیکھ لوں گا میں...... پبلسٹی کی بھوکی عورت...... پچاس بوائے فرینڈز ہوں گے اُس کے مجھ سے پہلے...... مجھے بھی بہت کچھ پتا ہے اُس کے بارے میں۔" وہ اُسی تلخ لہجے میں کہہ رہا تھا اور ساتھ ٹہل رہا تھا۔

"احسن کی فلم کا پریمیر ہو گیا۔ بہت بُرے ریویو ملے ہیں اُسے...... آپ نے سوشل میڈیا پر دیکھے...... فلاپ ہو گی وہ۔" ٹینا نے یک دم اُسے ضروری اپ ڈیٹ دی۔

غصے میں بھی مومن قہقہہ لگانا نہیں بھولا تھا۔ "زبردست۔ بڑی اچھی خبر دی تم نے۔ اپنی سوشل میڈیا ٹیم کو کہو، وہ بھی بُرے ریویو لکھے اُس کی فلم کے بارے میں...... دھجیاں اُڑا دے اُس کی فلم کی، تھرڈ کلاس ڈائریکٹر اپنے آپ کو قلبِ مومن کا اُستاد کہتا ہے۔"

مومن شاید اسی تضحیک آمیز انداز میں بات کرتا رہتا اگر وہ یک دم دادا کو نہ دیکھ لیتا جو اچانک اُس کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

"مجھے ای میل کر دو، میں جواب دیتا ہوں اُن کا۔" مومن نے ٹینا کو خدا حافظ کرتے ہوئے کہا۔ عبدالعلی کے دیکھنے کا انداز اُسے کھلا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہیں آپ؟" فون بند کرتے ہی اُس نے دادا سے کہا۔

"تمہیں۔"

"کیوں؟" وہ اُلجھا۔

"پہچان نہیں پا رہا۔"

"کیا؟" وہ حیران ہوا۔

"تمہیں...... یہ جو فون پر بات کر رہا تھا، کیا یہ وہ قلبِ مومن تھا جو چڑیا کو گود میں لیے ساری رات بیٹھا رہتا تھا۔" مومن چند لمحے بول نہیں سکا۔

"وہ بچپن تھا دادا۔" مومن نے نظریں چرائیں۔

"اور جو اپنی ماں کے آنسو دیکھ کر اللہ کو خط لکھنے لگتا تھا کہ وہ اُس کی ماں کو بھیج دے۔" انہوں نے بات جاری رکھی تھی۔

"وہ میرے خونی رشتے تھے دادا۔" وہ کہے بغیر نہیں رہ سکا۔

"اور جو راستے میں پڑے ہر پتھر کو اس لیے اُٹھاتا تھا کہ کسی دوسرے کو ٹھوکر نہ لگے۔"

"آپ کو کرتے دیکھتا تھا اس لیے کرتا تھا۔" وہ اب اُن سے نظریں چرانے لگا تھا۔

"وہ مومن جہاں بھی جاتا تھا لوگوں کی آنکھوں کا تارا بن جاتا تھا۔" دادا پتا نہیں اُسے کس کا چہرہ دکھانے لگے تھے۔

"لوگ آج بھی مجھ سے پیار کرتے ہیں دادا...... لاکھوں لوگ ٹوئٹر پر مجھے فالو کرتے ہیں۔ میری برتھ ڈے

URDU TUBE A HOME OF ENTERTAINMENT www.urdutubes.com
Google

پر مجھے کارڈز، پھول، تحفے بھیجتے ہیں۔ میں آج بھی اُن کی آنکھوں کا تارا ہوں۔ اُن کے دلوں میں بستا ہوں۔'' اُس نے دادا کو چیلنج کیا۔

''وہ جو لوگوں کے دلوں میں بستا تھا، اُس سے میں پوچھتا تھا کہ وہ اُن سب لوگوں کے نام لکھے جو اُس کے دشمن ہیں تو اُس کا صفحہ خالی رہ جاتا تھا۔'' مومن گم صم ہوا۔

''آپ مجھ سے کیا سننا چاہتے ہیں دادا؟'' اُس نے بالآخر زچ ہو کر کہا۔

''تم بدل گئے ہو مومن...... تم وہ قلبِ مومن نہیں رہے۔''

''غلط...... میں ایک بہترین انسان ہوں۔ آپ میرے سوشل سرکل میں آ کر میرے بارے میں پوچھیں۔ اس ایک فون کال سے مجھے جج نہ کریں۔'' وہ مدافعانہ انداز میں بولا تھا۔

''تم لوگوں کا رزق چھین سکتے ہو مومن؟ انہیں سڑکوں پر لانے کی طاقت رکھتے ہو؟'' عبدالعلی نے جیسے اُس کے الفاظ دہرائے۔

''جس کے بارے میں یہ بات کہی ہے، وہ احسان فراموش ہے۔ میں نے اُسے عزت دی اور وہ......''

دادا نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''عزت اور ذلت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے قلبِ مومن! تمہارے ہاتھ میں نہیں۔''

''آپ اس فلم انڈسٹری کو نہیں جانتے دادا! یہاں سب ایک دوسرے کے بارے میں یہی کہتے ہیں، ایسے ہی بات کرتے ہیں، ایسے ہی گالیاں دیتے ہیں، یہاں سب چلتا ہے۔'' مومن نے اب جیسے اُنہیں تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

''تو پھر اُس حمام سے نکل آؤ جس میں تم سب بے لباس ہو۔'' اُن کے اگلے جملے نے مومن کو مشتعل کر دیا تھا۔

''میرا حمام میرے پروفیشن کو کہہ رہے ہیں نا آپ؟''

''نہیں، اُس جسم کو کہہ رہا ہوں جس کی پرستش کروانے کے لیے تم اپنی زندگی ضائع کر رہے ہو۔ اور مل کیا رہا ہے؟ حسد، رقابت؟ بے عزتی، بے سکونی، ایوارڈز اور آسائشات کے ساتھ۔''

''آپ تو روح کا کام کرتے ہیں نا دادا! آپ سے تو کوئی حسد نہیں کرتا، کوئی دشمن نہیں ہے آپ کا۔'' وہ عبدالعلی پر اب طنز کرنے لگا تھا۔

''میرے کام میں روح ہوتی ہے مومن اور روح ماورا ہے اُن چیزوں سے جن میں تم اُلجھے پڑے ہو۔'' وہ اس بار آگ بگولہ ہوا۔

''میرے کام میں روح نہیں ہوتی، وہ صرف آپ کے کام میں ہوتی ہے۔ آپ سمجھتے ہیں میں روح کو نہیں سمجھتا؟ کاغذ پر لکھے بے جان کرداروں کو اسکرین پر پیش کر کے لوگوں کے دلوں میں اُتار دیتا ہوں اور میں روح کو نہیں سمجھتا۔''

''تمہارے ان بے جان کرداروں میں سے کس نے کس کی روح کو چھوا؟...... نہیں مومن! جو بھی کردار تم پیش کرتے ہو سب جسم ہیں۔ سب لمس مانگتے ہیں...... سب مادّی...... طلب ہے نفس کی...... اور اُن کا قصور نہیں ہے، تمہارا قصور ہے کیونکہ یہ کردار تمہارے ہاتھوں گھڑ رہے ہیں اور تمہیں صرف جسم کا پتا ہے، روح کا تو پتا ہی نہیں ہے۔''

جوتا نہیں، جوتے مارے تھے اُن کی نرم، میٹھی، مدھم آواز میں اور کوڑوں کی طرح اُس کی انا کو زخمی کر گئے تھے۔

"آپ کہتے ہیں نادادا! میں روح کو نہیں سمجھتا، صرف جسم کو جانتا ہوں، اُسی کی پرستش کرواسکتا ہوں...... تو دادا! اب میں آپ کو ایک ایسی فلم بنا کر دوں گا جو جسم کا لمس نہیں مانگے گی۔ روح کو چھوئے گی...... اللہ کی عبادت کروائے گی۔" عبدالعلی بے اختیار ہنسے تھے۔ یوں جیسے کوئی بڑا کسی بچے کی بچگانہ بات پر ہنستا ہو۔

"ٹھیک ہے مومن! اس بار تم ایک فلم بناؤ، روح میں اُتر جانے والے کرداروں کی۔ اللہ کی عبادت پر مجبور کر دینے والی...... روح کو چھونے والی...... اور جس دن تم اپنی فلم میں روح کی بات کرنے لگو گے یہ لاکھوں، کروڑوں کا مجمع جنہیں تم فین اور فالورز کہتے ہو یہ چھٹ جائے گا۔ یہ سب جنہیں تم دوست کہتے ہو، پرندوں کی طرح اُڑ جائیں گے۔"

عبدالعلی کی آواز میں عجیب سی کیفیت تھی۔

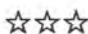
"ایسا نہیں ہوگا۔" مومن نے کہا۔

"تم آزما لو...... پھر جب تم اپنے آپ کو اکیلا پاؤ تو یہاں آجانا۔"

"میں آپ کے پاس صرف روح اور روحانیت پر ایک ہٹ فلم لے کر آؤں گا۔" قلبِ مومن نے جواباً کہا۔ "وہ فلم جو آپ کی خطاطی سے زیادہ قریب کرے گی لوگوں کو اللہ کے۔" قلبِ مومن نے چیلنج کیا۔

"تم جیت گئے تو میں کیلی گرافی چھوڑ دوں گا۔ میں جیت گیا تو تم آجانا میرے پاس اپنا اثاثہ سنبھالنے۔"

عبدالعلی نے مسکراتے ہوئے اُس کا چیلنج قبول کیا تھا۔ وہ اپنی اپنی فیلڈ کے دو پہلوان تھے اور اب دنگل کے لیے اکھاڑے میں اُتر آئے تھے۔



دروازہ بجانے پر ثریا باہر نکلی تھی اور فیصل کو دیکھ کر اُس کا چہرہ کھل گیا تھا۔

"ارے بیٹا! آؤ آؤ...... اندر آؤ۔" اُس نے دروازے سے ہٹتے ہوئے ساتھ اُس کے سلام کا جواب دیا۔

"نہیں آنٹی بس مومنہ کو لینے آیا ہوں، اُسے بھیج دیں۔" ثریا کے چہرے پر اُلجھن آئی۔

"مومنہ...... وہ تو کل امریکہ چلی گئی...... کیا تمہیں نہیں بتایا اُس نے۔"

فیصل جامد ہوا تھا۔ "نہیں......" اُس نے بمشکل کہا۔

"پر مجھے تو کہہ رہی تھی کہ تم آؤ گے ویک اینڈ پر تو تمہیں وہ لفافہ دے دوں۔" ثریا کچھ اور اُلجھی تھی۔

"کون سا لفافہ؟" فیصل بھی اُلجھا۔

"ایک منٹ۔" ثریا کہتے ہوئے برق رفتاری سے اندر گئی پھر اُسی رفتار سے واپس آگئی اور اُس نے ایک لفافہ فیصل کو تھما دیا۔

"ٹھیک ہے آنٹی...... میں چلتا ہوں۔" فیصل کو بات کرنے میں دقت ہو رہی تھی۔

"بیٹا! اندر تو آتے...... کچھ چائے وغیرہ۔" ثریا نے کہا۔

"نہیں آنٹی! پھر کبھی...... ابھی ممی کو کلینک پر بھی چھوڑنا ہے مجھے...... خدا حافظ۔"

وہ رُکے بغیر کہتا ہوا وہاں سے چل پڑا تھا۔ اپنی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہی اُس نے مومنہ کے خط کا جواب بھی سوچتے ہوئے لفافہ کھول لیا تھا۔ اُسے یقین تھا، اُس نے اپنے خط میں وضاحتیں دی ہوں گی اور فیصل کو کوئی وضاحت قبول نہیں کرنا تھی۔ لفافے کے اندر کوئی خط نہیں تھا۔ اُس کے اندر پانچ پانچ ہزار کے دو نوٹ تھے۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

Digitized by Google

قرۃ العین سکندر

دلِ مضطرب

وہ ایک پر شور اور مضطرب رات تھی۔ بار بار گرجتے والے بادل اور چمکتی ہوئی بجلی دل پر عجیب سی ہیبت طاری کر رہی تھی۔ موسلا دھار بارش کا بہتا پانی کانوں میں شور کر رہا تھا۔

دروازہ ہوا کے تھپیڑوں سے مسلسل ہل رہا تھا اور کھڑکیاں بج رہی تھیں۔ وہ حواس باختہ سی روشنی آپا کے کمرے کی طرف بڑھی۔ شہریار تو بہت تاخیر سے گھر آتے تھے اور اس ہولناک رات میں گھر میں



صرف دو ہی نفوس تھے۔ وہ اور روشنی آپا۔ وہ اپنے تمام حوصلے مجتمع کر کے کمرے سے باہر نکلی تھی۔

تب ہی اچانک تمام علاقہ تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ طوفانی بارش کے سبب برقی نظام معطل ہو چکا تھا۔ اسے اندھیرے سے بہت خوف آتا تھا۔ وہ اندازے سے سیدھے راستے کی جانب آگے بڑھتی چلی گئی تھی۔ پھر روشنی آپا کے کمرے کے سامنے پہنچ کر اس نے ان کے دروازے پر دستک دے ڈالی۔

''اب کیا مصیبت ہے؟''

روشنی آپا کی کرخت آواز اس رات کی ہولناکی سے بھی زیادہ ہولناک تھی۔ ندا فقط سوچ کر رہ گئی تھی۔

''آپا! مجھے بہت زیادہ ڈر لگ رہا ہے۔''

اس کی آواز میں بے بسی چھلک رہی تھی۔

''اندر آ جاؤ، دروازہ کھلا ہے۔''

قدرے توقف کے بعد انہوں نے اسے اندر آنے کی اجازت دے دی۔

وہ دروازے کا پٹ دھکیلتی اندر داخل ہو گئی تھی۔

ان کے کمرے میں موم بتی کی روشنی چہار سو پھیلی ہوئی تھی۔ روشنی آپا صوفے پر بیٹھی اس کی جانب ہی دیکھ رہی تھیں۔

''آؤ، یہاں بیٹھ جاؤ۔''

روشنی آپا نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ بھی صوفے کے کنارے پر ٹک گئی۔ اکیلے کمرے میں گرجتے بادلوں کی پرشور آواز دل دہلا رہی تھی۔ مگر اب روشنی آپا کی چبھتی نگاہیں اس کے سراپے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس کا سجا سنورا روپ دیکھ کر روشنی آپا کے چہرے پر ناگواری کا واضح تاثر ابھرا تھا۔

ندا کے اندازے کے مطابق تو روشنی آپا سو ہی چکی ہوں گی تب ہی وہ اپنے دل کی خوشی سے شہریار کے لیے پورے اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔

وہ بخوبی واقف تھی کہ روشنی آپا کا رویہ اس کے ساتھ تب مزید ناگواری لیے ہوتا تھا جب وہ خوب دل سے شہریار کے لیے تیار ہوتی۔ بسا اوقات وہ اسے لفظوں کی ایسی مار مارتی تھیں کہ وہ دل مسوس کر رہ جاتی ان کے سامنے اس نے تیار ہونا ہی ترک کر دیا تھا۔

مگر اس کی شادی کو ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ یہ آرزو دل میں سر ابھارتی تھی کہ وہ بھی سر شام اپنے محبوب شوہر کے لیے سجے سنورے اور اس کا شوہر اس کے اس سجے سنورے روپ کو سراہے۔

مگر روشنی آپا کا خوف روز اول سے ہی اس پر غالب آ چکا تھا۔ سدرا اور سارہ دونوں شادی شدہ اور اپنے گھروں میں شاد و آباد تھیں۔ محض روشنی آپا تھیں جن کی شادی نہیں ہو سکی تھی۔ شاید اس میں بھی کوئی اسرار پنہاں تھا۔ مگر شہریار سے پوچھنے پر بھی اس کو جواب نہیں مل سکا تھا۔ جب اس کی کرید، اصرار کا رنگ اختیار کر گئی تو شہریار نے اسے صاف منع کر دیا کہ وہ آج کے بعد کبھی بھی روشنی آپا کی شادی کی بابت سوال یا باز پرس نہیں کرے گی۔ اس لیے ندا نے بھی مصلحتاً خاموشی اختیار کر لی تھی۔ اس وقت کمرے میں وہ دونوں نفوس تھے مگر کمرے میں ہنوز گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ روشنی کے چہرے پر ناگواری کے ساتھ ساتھ ماتھے پر ان گنت شکنوں کا جال تھا۔

''رات کے اس پہر اتنی تیاری کس لیے؟ کیا اس بھیگی رات میں بھی تمہارا کہیں باہر جانے کا پروگرام ہے۔''

انہوں نے بے زار لہجے میں پوچھا تو وہ اپنے خیالات کی دنیا سے لوٹ آئی۔ قبل اس کے کہ وہ کوئی جواب یا عذر پیش کرتی دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ بارش کا زور بھی ٹوٹ چکا تھا۔ اس لیے اس گھمبیر خاموشی میں یہ شور زیادہ محسوس ہوا تھا۔ تب ہی بجلی بھی اچانک آ گئی۔

''جاؤ دروازہ کھولو شہریار کی دستک لگتی ہے۔''

Digitized by Google

روشنی آپا کے کہنے پر وہ سرعت سے دروازے کی طرف لپکی۔ دروازہ کھولنے پر شہریار بارش کی وجہ سے بھیگا ہوا دکھائی دیا تھا۔ اس کے کپڑے بھی گیلے ہو چکے تھے۔

"اندر آ جائیں۔" اس نے شہریار کے لیے راستہ بنایا۔ شہریار اس کے پیچھے پیچھے ہی اپنے کمرے تک آیا۔

"کپڑے تبدیل کر لیں۔" ندا نے الماری سے کپڑے نکال کر بیڈ پر رکھے۔

شہریار نے محبت پاش نگاہوں سے اپنی بیوی کو دیکھا۔ جو نک سک سے تیار اس کے دل کے نہاں خانے میں ہلچل مچا رہی تھی۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟" وہ بری طرح سے شرما گئی۔ شہریار کی نگاہوں کے حصار میں رہنا کس قدر خوش کن احساس تھا۔

"جلدی سے کپڑے تبدیل کر لیں۔ آپ کے انتظار میں، میں نے بھی کھانا نہیں کھایا ہے بہت زوروں کی بھوک لگ رہی ہے۔" ندا نے دانستہ طور پر اس کی توجہ دوسری جانب مبذول کروائی تھی۔

☆☆☆

گھر میں قرآن خوانی کے بعد عابدہ بیگم درس دے رہی تھیں۔ ہر مہینے روشنی آپا گھر میں میلاد شریف اور درس قرآن کی محفل کا اہتمام کیا کرتی تھیں۔ عابدہ آپا محلے کی ایک نہایت نیک اور پارسا خاتون تھیں۔ ان کے الفاظ سیدھا دل پر اثر انداز ہوتے تھے۔ تمام خواتین ہمہ تن گوش تھیں۔ اور پوری توجہ سے ان کی باتوں کو سن رہی تھیں۔ اور اثبات میں سر ہلا رہی تھیں۔ درس کے بعد عورتوں کی بھیڑ چھٹنے لگی۔ فقط وہ اور روشنی آپا ہی رہ گئے تھے۔

"آپا جان! کھانا تناول کر کے جائیے گا۔"

روشنی آپا کے لہجے میں عقیدت مندی تھی۔

"بیٹا! اتنی آزردہ کیوں دکھائی دیتی ہو۔" عابدہ بیگم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا تھا۔

"جاؤ، ندا آپا کے لیے چائے لے آؤ۔"

روشنی آپا نے کن انکھیوں سے پاس بیٹھی ندا پر نگاہ ڈالی تھی ان کا مقصد ندا کو یہاں سے اٹھانا تھا۔ ندا جلدی سے اٹھ گئی تھی۔ اتنے عرصے میں ندا ان کے اشارے اور باتوں کے مفہوم سمجھنے لگی تھی۔

"بس آپا کسی کروٹ دل کو چین نہیں ملتا۔ جیسے میں اس بھری دنیا میں وہ واحد بدنصیب ہوں جو نامراد ٹھہری ہوں۔ باقی سب کو تو جھولیاں بھر، بھر کر نوازا گیا ہے۔"

روشنی کے لب و لہجے میں دکھ گھلے ہوئے تھے

"توبہ توبہ کرو روشنی۔" عابدہ نے افسوس سے اسے دیکھا تھا۔

اچانک ان کے دل میں روشنی کے لیے ہمدردی آ گئی تھی۔

"کسی شے کی طلب بسا اوقات انسان کو ناشکرا بنا دیتی ہے۔ جب ہم اپنی آتی جاتی سانسوں کا شکر ادا نہیں کر سکتے ہیں تو پھر کسی ایک شے کے نہ ملنے پر تاعمر شکوہ کناں رہنا کیسا؟"

عابدہ کی باتوں نے کوئی اثر کیا یا نہیں کیا مگر وہ سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ ندا کچن میں کھڑی یہ ساری باتیں سن رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ ایسی کون سی دعا ہے روشنی آپا کی جو رد ہو گئی ہے۔ شام ڈھلتے ہوئے رات میں مدغم ہو رہی تھی۔ چرند پرند دن بھر کی طویل اڑان کے بعد اپنے آشیانوں میں واپس لوٹ رہے تھے۔ فکر معاش لیے چہرے بھی دن بھر کی تھکان کے بعد گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ روشنی نے کھڑکی کے پار اس منظر کو دیکھ کر گہری سانس لی۔ بے پایاں یادوں نے دل کے دریچے پر دستک دی تھی۔ آنکھوں میں ماضی بعید کا کوئی دلکش منظر دھندلایا تھا اور بھرپور نقش بن کر تمام ہستی پر چھا گیا تھا۔

☆☆☆

روشنی قبول صورت، روشن آنکھوں والی گندمی رنگت کی ایک لڑکی تھی۔ جس کے چہرے پر مدھر

Digitized by Google

مسکان بکھری رہتی تھی۔ وہ نیشنل کالج آف آرٹس سے فارغ التحصیل تھی۔ مگر فنون لطیفہ کا شوق اسے کشاں کشاں کالج کے درو بام کی طرف لے جاتا تھا۔ تب ہی ایک روز اس کی ملاقات احتشام سے ہوئی۔

احتشام نے ایک دو ملاقاتوں کے بعد ہی اظہار محبت کر ڈالا۔

روشنی کو لگا تھا کہ وہ ہواؤں میں اڑ رہی ہو۔ اپنی ذات بے حد بیش قیمت اور معتبر لگنے لگی تھی۔

اسے سادہ سی روشنی میں کیا بھایا تھا۔ جو اسے اپنا گرویدہ بنا گیا تھا۔

''خوابوں خیالوں میں بس آپ کا ہی چہرہ گردش کرتا رہتا ہے۔ یہ گلاب چہرہ حاصل زیست بن کر ہر بابِ زیست پر رقم ہو چکا ہے۔ ہر ورق ہر سطر پر آپ کا ہی نام درج ہے۔'' احتشام محبت سے مخمور لہجے میں کہتا تو وہ مان سے مسکراتی دیتی۔

احتشام نے اپنے جذبوں کی صداقت عیاں کرنے کے لیے اپنے والدین کو بھیجا تھا رشتے کی غرض سے۔ جو کچھ سوچ بچار کے بعد سند قبولیت کا درجہ پا گیا۔

چھوٹی سدرا کا رشتہ بھی طے تھا خاندان میں یوں دونوں کی ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ شادی سے ٹھیک ایک ماہ پہلے احتشام نے شادی کی تاریخ آگے بڑھانے کا کہہ دیا جس کی بہ ظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ رفعت بیگم نے بہت کریدا اپنے بیٹے سے مگر اس کی ایک ہی ضد تھی کہ فی الحال میں شادی کے لیے ذہنی طور پر آمادہ نہیں ہوں۔ مگر روشنی کے گھر کے چکر احتشام لگاتار لگا رہا تھا۔ ایک شام روشنی نے اپنی ـــــ انا کو بالائے طاق رکھ کر احتشام سے دوبدو بات کرنے کی ٹھان لی۔

احتشام سارہ کے پاس بیٹھا کسی بات پر اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور سارہ بحث کر رہی تھی۔ روشنی محو انتظار تھی کہ سارہ وہاں سے جائے تو وہ دوٹوک بات کرے۔

''سارہ! چائے بنا لاؤ دو کپ۔''

روشنی کا مقصد یہ تھا کہ وہ وہاں سے چلی جائے۔

''روشنی آپا میرا بالکل بھی موڈ نہیں ہے۔''

سارہ یوں بھی بہنوں میں چھوٹی تھی اور کچھ نخریلی طبیعت کی مالک تھی۔

''پھر مجھے لے چلیں گے نا اس ہفتے۔''

وہ روشنی کو سرے سے نظر انداز کیے احتشام سے محو گفتگو تھی۔

احتشام کی نگاہوں میں محبت کے لو دیتے جگنو جگمگا رہے تھے۔

چھن سے روشنی کے اندر کچھ ٹوٹا تھا۔ یہ چہرہ یہ رنگ انوکھے تو نہ تھے۔ کیا وہ ان رنگوں سے ناآشنا تھی۔ ہرگز نہیں......نہیں......

یہ رنگ تو وہ پہچانتی تھی۔ جو احتشام کے چہرے پر روشنی کو دیکھ کر رقصاں ہوا کرتے تھے۔ مگر آج معاملہ برعکس تھا۔ سارہ طمانیت سے ایک ادائے بے نیازی سے شہزادی کی مانند بیٹھی ہوئی تھی جبکہ روشنی پس منظر کا کوئی حصہ معلوم ہو رہی تھی۔

''سارہ! تم یہاں سے جاؤ مجھے احتشام سے کچھ بات کرنی ہے۔''

اچانک روشنی کے لہجہ میں سختی در آئی تھی۔

احتشام اور سارہ نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا تھا پھر احتشام کے سر خم کرنے اور اشارے پر سارہ وہاں سے اٹھ کر اندر چلی گئی تھی۔ یہ سارا منظر بھی روشنی کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہا تھا۔

''احتشام کیا میں شادی سے انکار کی وجہ جان سکتی ہوں؟''

روشنی کے لہجے میں طنز تھا۔

''روشنی میں اس ٹاپک پر مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتا امی پہلے ہی پوچھ پوچھ کر سر درد کر چکی ہیں۔'' احتشام کے لہجہ میں بے زاری ہی بے زاری تھی۔

Digitized by Google

"آپ کی بے زاری کی وجہ پوچھ سکتی ہوں۔"

روشنی کی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں۔ وہ ضبط کی انتہاؤں پر تھی۔ اس کی ذات کی کرچیاں بکھر کر ریزہ ریزہ ہو چکی تھیں۔

"دیکھو روشنی! برا نہ ماننا۔ میں فطرتاً حسن پرست واقع ہوا ہوں۔ نامعلوم کیوں مجھے پہلے پہل تم اچھی لگیں جبکہ تم واجبی شکل و صورت کی ایک عام سی لڑکی ہو۔ شاید تمہاری روشن آنکھیں مجھے اچھی لگتی تھیں۔ مگر جب سے سارہ کو دیکھا ہے۔ مجھے اپنے اس جلد بازی میں کیے گئے فیصلے پر اب پچھتاوا محسوس ہوتا ہے۔" احتشام کی بات پر اسے لگا جیسے وہ گہری کھائی میں گر چکی ہے۔ اس کا رنگ لٹھے کی مانند سفید ہو چکا تھا۔ نزع کی کیفیت اور کیا ہوگی۔ اسے لگ رہا تھا کہ جیسے اس وقت اس کی جان سلب ہو رہی ہے۔ آنسو قطرہ قطرہ گر کر اس کے دل کی زمین کو بھگو رہے تھے۔

پھر وہ بالکل خاموشی سے اس کی زندگی سے نکل گئی۔ اس نے نہ کوئی واویلا کیا۔ نہ ہی حرف شکایت زبان پر لائی۔ گھر والے اس کی جامد چپ کو اس کی شادی کا ملتوی ہونا سمجھ کر مطمئن تھے۔ نہیں جانتے تھے کہ وہ کس کرب سے دوچار ہے۔ وہ برابر سارہ کے لیے آتا رہتا تھا۔ پھر سدرا کی شادی ہوگئی۔

ایک حبس زدہ شام میں جب تہمینہ بیگم نماز کی ادائیگی کے بعد صحن میں آئیں تو احتشام اور سارہ کو ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے دیکھ کر ساکت رہ گئیں۔ احتشام جس انداز میں سارہ کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہا تھا وہ منظر اپنے آپ میں بالکل واضح تھا کہ احتشام کس قدر گر چکا ہے مگر سارہ وہ تو پرائی نہ تھی۔ وہ زلزلوں کی زد میں تھیں۔ بھونچال گھر میں ہی نہیں ان کی زندگی کو بھی تہہ و بالا کر گیا تھا۔ انہوں نے جا کر سارہ کے منہ پر تھپڑ رسید کیا۔

"نامراد اس دن کے لیے تجھے پیدا کیا تھا۔" وہ دکھ سے بولی تھیں۔

"کیوں امی! اس میں برائی کیا ہے آپا پسند کی شادی کریں تو جرم نہیں، میں کروں تو جرم۔ واہ!"

وہ دوبدو ماں سے بولی تھی۔ شہریار کا بھی غصے سے برا حال تھا جب روشنی نے یہ شور سنا تو وہ کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔

"امی میں چاہتی ہوں کہ سارہ کی احتشام سے شادی کر دی جائے یوں بھی آپ نے اجازت نہ دی تو یہ لوگ خود کورٹ میرج کر لیں گے۔ دوسری صورت میں بدنامی گھر کی دہلیز پر کھڑی ہے۔ یہ میں نے سن لیا تھا ان کے منہ سے۔"

روشنی کے چہرے پر کوئی ملال نہ تھا۔ سپاٹ چہرہ۔ سرد سا انداز تھا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو بیٹی!" تہمینہ بیگم نے دیکھا۔ ایک بیٹی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کر رہی ہے جبکہ دوسری شرمندہ کروانے پر تلی ہوئی ہے۔

اس بھیانک رات کی صبح بھی اتنی ہی دل سوز تھی۔ صبح تہمینہ بیگم کا جنازہ اٹھا تھا۔ ہارٹ اٹیک جان لیوا ثابت ہوا تھا۔

ہر آنکھ اشک بار تھی۔ امی کے چالیسویں کے بعد سارہ نے احتشام سے شادی کر لی۔ وہ اتنی منہ زور ہو چکی تھی کہ ماں کی موت بھی اس کی محبت میں رکاوٹ نہ بن سکی۔ یوں یہ باب ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

روشنی نے تاعمر شادی نہ کی یہاں تک کہ بالوں میں چاندی اتر آئی۔ وہ لب جو بات بے بات مسکراتے تھے وہاں ملال نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔

☆☆☆

شہریار نے شادی اپنی پسند سے کی تھی۔ ندا کی چہچہاتی آواز روشنی کو اپنی تضحیک لگا کرتی تھی۔ ایک جانب وہ اپنی دانست میں زیست کا دکھ بھرا باب ختم کر چکی تھی مگر ندا کا سجنا سنورنا اور شہریار کا سراہنا وہ یہ سب دیکھتیں تو حبس ان کے اندر بڑھنے لگتا۔ ندا نے دیکھا شام ڈھل رہی تھی مگر روشنی آپا آج اپنے کمرے سے نہ نکلیں۔ اس نے کمرے میں جھانک کر دیکھا روشنی آپا بیڈ پر لیٹی تھیں۔ ان کے ہاتھ ٹھنڈے

Digitized by Google

تھے، وہ بخار میں تپ رہی تھیں۔ بخار کی شدت کے باعث نیم غشی کی کیفیت سے دوچار تھیں۔ ندا نے ٹھنڈے پانی کی پٹیاں کیں اور شہریار کو فون کردیا۔ وہ ڈاکٹر کے ساتھ ہی گھر لوٹا تھا ڈاکٹر کے مطابق کوئی گہرا صدمہ اندر ہی اندر ستا رہا تھا۔ نروس بریک ڈاؤن یا ہارٹ اٹیک کا بھی خدشہ ظاہر کیا تھا۔ ندا نے ان کی بہت خدمت کی۔ شہریار نے آج اسے ساری بات بتادی تھی۔

☆☆☆

اتنے سال بعد بھی سارہ کی گود ہنوز خالی تھی۔ شاید یہ کوئی بددعا تھی۔ جو دونوں کا حصار کیے ہوئے تھی۔ ندا نے اپنی خدمت سے روشنی کا دل جیت لیا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ مکمل تندرست ہوگئیں۔ ان کی ندا سے گہری دوستی ہوگئی تھی۔ اپنائیت ہی اپنائیت تھی۔

ایک شام ندا نے کہا۔

"روشنی آپا! میں سب جانتی ہوں۔ آپ کے اضطراب کی وجہ کسی خواہش کی ناکامی نہیں ہے بلکہ قوت فیصلہ کی کمی ہے۔ آپ معاف کیوں نہیں کردیتیں تاکہ دل پرسکون ہوجائے۔"

"میں تو سب کو معاف کرچکی ہوں۔" انہوں نے سکون سے کہا تھا۔

"باہر سارہ آپی آئی ہیں۔" اب کے وہ جھجک کر بولی تھی۔

"جانتی ہوں، چلو مل لیتے ہیں اس سے بھی۔" ان کی آواز میں شکست پنہاں تھی۔ باہر سارہ اداس ملول بیٹھی ہوئی تھی۔

"آج اکیلی ہی آگئی ہو۔" ان کا کہنا تھا کہ سارہ شرمندہ سی آگے بڑھی تھی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

"مجھے معاف کردیں میں نے آپ کا دل دکھایا تھا اس کی سزا بھی مل گئی ہے۔ میں نے اپنا گھر بچانے کے لیے اتنے سال یہ سچ احتشام سے چھپایا تھا کہ میں بانجھ ہوں مگر کل نہ جانے کیسے اس کی نگاہ ان رپورٹس پر پڑ گئی تھی اور غصے میں اس نے مجھے طلاق دے دی۔" وہ سسک رہی تھی۔

"میں جانتی ہوں۔"

"آپ کو معلوم تھا؟" وہ حیرت زدہ تھی۔

"کیونکہ تمہیں طلاق دینے کے بعد احتشام کا فون آیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے تمہیں طلاق دے دی ہے۔ مزید یہ کہ وہ تمہارے ساتھ خوش نہیں تھا۔ مجھے کھودینے کے بعد اس کو ادراک ہوا تھا کہ درحقیقت سچی محبت تو اسے مجھ سے تھی۔ مگر وہ تمہاری چکنی چپڑی باتوں میں آگیا تھا۔ اب مجھے واپس اپنانا چاہتا ہے۔" اتنا کہہ کر روشنی چپ ہوگئیں۔

"تو آپ نے کیا کہا آپا؟" سارہ نے تیزی سے پوچھا تھا۔

"مجھے کیا کہنا چاہیے تھا سارہ!" روشنی آپا کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"سارہ! تم آج تک جان ہی نہیں سکیں کہ میں تم جیسی کٹھور نہیں ہوں۔ نہ ہی بے مروت ہوں۔ میں نے دل سے معاف کردیا تھا۔ دیکھ لی تم نے احتشام کی سچی محبت۔ مگر میں نے ضرور دیکھ لی ہے سارہ۔ اللہ پاک کی سچی محبت اور اس کا انصاف بھی۔ یقین کرو میرے دل میں احتشام کی حیثیت کسی اجنبی سے زیادہ نہیں ہے۔ تم یہاں رہ سکتی ہو۔ یوں بھی یہ تمہارا ابھی گھر ہے سارہ!" روشنی آپا کہہ کر اندر چلی گئیں مگر سارہ کا سر شرم سے جھک گیا تھا۔ اب اس کو تاعمر اسی اضطراب میں جینا تھا۔ ☆

مست مسیحا

قیمت -/400 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 - اردو بازار کراچی۔ فون نمبر: 32735021

نوشابہ زینت

انا اور محبت



وہ میری چھوٹی پھوپھو کی بیٹی تھی۔ معمولی شکل و صورت کی لیکن پُرکشش تھی۔ میرے ہی جیسی تھی۔ ظاہر ہے میری پھوپھو کی بیٹی تھی اور پھوپھو اپنے چچا زاد سے بیاہی تھیں۔ تو ہم حویلی میں رہنے والے سارے چچا زاد، پھوپھی زاد ملتے جلتے تھے۔ ہماری حویلی کافی بڑی تھی جو لڑکیوں سے ہی بھری تھی۔

دو میری پھوپھی اماں کی بیٹیاں، چار تایا ابا کی، ایک چاچا جی کی اور ایک میری اپنی بہن۔ میری دادی کہتی تھی کہ ہمارے ہاں بیٹوں کا بڑا کال ہے حالانکہ میری دادی کے تین بیٹے تھے اور دو بیٹیاں۔ جو خاندان میں بیاہی وہ تو ہمیں یعنی دادی کو دو بیٹیوں کا تحفہ دے کر جلد ہی چل بسی جبکہ دوسری اپنے گھر تھی خوش باش۔

تایا جی کا ایک بھی بیٹا نہ تھا پھر میرے ابا جی کا نمبر آتا تھا جن کا میں اکلوتا چشم و چراغ تھا اور پھر چاچا جی ان کا بھی ایک ہی سپوت تھا۔ ہم دو پوری جائیداد کے ــــــ وارث۔ دادا شکر گزار تھا کہ دو ہی مل گئے۔ جبکہ دادی آہیں بھرتی نہ تھکتیں۔

"جتھے انیاں کڑیاں ہویاں نے دو منڈے ہور ہو جاندے (جہاں اتنی لڑکیاں ہوئیں دو لڑکے اور ہو جاتے نا)"

ہم دونوں بڑے لاڈوں سے پلے۔ ابھی بھی دادا، دادی، چاچے، مامے، پھوپھیاں سب صدقے واری جاتے اور شاید اسی پیار نے ہمیں خاص طور پر مجھے بگاڑ دیا۔ میں اتنا سارا پیار، محبت پا چکا تھا کہ مجھے اب کسی کا مجھ سے محبت کرنا، میرا خیال کرنا اتنا متاثر یا متوجہ نہیں کرتا تھا۔ اب مجھے پروا نہیں تھی کہ کون مجھ سے محبت کرتا ہے کتنی کرتا ہے کیونکہ مجھے سب ہی بڑی محبت کرتے تھے۔

Digitized by Google

اس میں خاص کیا بات ہے۔ نجانے کیوں مجھے اپنا آپ دیوتاؤں جیسا لگتا جن کی آؤ بھگت میں پجاری کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ اور میں بھی گردن میں سر یا دیے دیوتاؤں کی طرح بغیر کسی تاثر کے غیر مرئی چیزیں کھوجتا رہتا۔

"دیکھو سجاول میں نے کتنے اچھے پکوڑے بنائے ہیں۔"

میں بارش سے نالاں رہتا تھا اب بھی جو رکی تھی تو حویلی کے ساتھ اصطبل میں بندھے اپنے سیاہ گھوڑے کی خبر لینے گیا تھا۔ جب مجھے اپنے پیچھے سے آواز آئی۔ اس کی آواز سنتے ہی میرے چہرے پر سخت قسم کی سنجیدگی چھا گئی اور چپ رہا۔ اس نے پروا نہ کی۔ بیٹھک سے تپائی لا کر اس پر پکوڑے چٹنی اور چائے رکھ کر چلی گئی۔

میں جانتا تھا کہ اس نے باہر جا کر میرے بارے میں کھڑوس شوخا اور پتا نہیں کیا کیا بولا ہوگا۔ کیونکہ میں یہ لفظ اپنی شان میں کئی دفعہ سن چکا تھا اور جس انداز سے وہ تنگ آ کر کہتی تھی نجانے کیوں ہر دفعہ میری انا کو تسکین پہنچتی۔

☆☆☆

میں سجاول شاہ ...... شاہوں کی حویلی کا دوسرا اکلوتا وارث سب کے ساتھ بات کرتا۔ اگلے کی باتوں کا جواب بھی دیتا۔ لیکن اس کے ساتھ سخت سنجیدہ ہو جاتا اور بہت کم اس کے سوالوں کے جواب دیتا۔ نجانے کیوں ایسا کر کے میری انا کو تسکین پہنچتی۔ پہلے ایسا نہیں تھا یہ تب سے ہوا تھا جب آج سے چار سال پہلے میں نے اس کی اور اپنی چچازاد کی باتیں سنیں جن میں اپنا نام آنے پر میں رک گیا۔

"یار تو نے کدھر پنگا لے لیا۔ وہ تو تجھے گھاس بھی نہ ڈالے گا۔ تو نہیں دیکھتی، وہ زمین پر کتنا اکڑ کے چلتا ہے جیسے آسمان سے اترا کوئی پری زاد نہ ہو تو۔ تیرے اور اس کمینے کے ستارے نہیں ملتے۔ تو اپنی راہ سیدھی رکھ نکال دے اسے ذہن سے ورنہ وہ تجھے رول دے گا زینب۔" سدرہ نے اس کے بازوؤں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"کیا یہ اتنا آسان ہے سدرہ! کہ جب دل کرے، کسی کو سوچ لو اور جب دل کرے جھٹک دو۔"

کچھ ایسی بے بسی تھی اس کے لہجے میں کہ سدرہ کو چپ کروا گئی اور میں ؟؟ میں تو یک دم کسی اونچے برج پر پہنچ گیا۔ نجانے کیسے احساسات ہو گئے کہ گردن جھکانے کا اب دل ہی نہ کرتا تھا۔ اس دن کے بعد میں نے واقعی اسے گھاس تک نہ ڈالی کہ کہیں وہ بھی اونچائی پر نہ پہنچ جائے۔

☆☆☆

کہتے ہیں عورت اپنی طرف اٹھنے والی ہر نظر کا مفہوم جان لیتی ہے۔ لیکن وہ میرے لیے ہمیشہ ایک پہیلی ہی رہا۔ ویسے تو اس نے کبھی نظر اٹھا کر مجھے دیکھا بھی نہیں تھا اگر دیکھ بھی لیتا تو نظر ہر قسم کے جذبے کی مفہوم سے بالکل خالی ہوتی۔ میں چونکہ اپنے الہاموں پر بڑا یقین رکھتی تھی تو مجھے یہی لگتا کہ سدرہ ٹھیک کہتی ہے، وہ میرا کبھی نہیں ہو سکتا، چار سال میں نے اس کی بغیر کسی وجہ کے بے اعتنائی جو کہ وہ شدت سے صرف مجھ ہی سے روا رکھے ہوئے تھا اسے برداشت کیا۔

سنا تھا یک طرفہ محبت وقت کے ساتھ بالآخر ختم ہی ہو جاتی ہے۔ لیکن میری محبت نجانے کیسی تھی۔ جو اس کی بڑھتی ہوئی بے اعتنائی کے باوجود اسی طرح قائم تھی ــــــــ لیکن اب میں نے اسے پہروں دیکھنا، سوچنا، اس کا خیال کرنا چھوڑ دیا تھا۔ دل بے شک محبت سے اب بھی لبریز تھا پر میں تھک چکی تھی۔ اس کے دیکھنے سے اب میں کوئی مفہوم ایجاد نہ کرتی تھی، بس اپنے آپ میں مگن رہتی اور میں اس کام میں بڑی حد تک کامیاب ہو چکی تھی، پہلے کی طرح اس کے آگے پیچھے نہیں رہتی تھی۔

بہت کم اس کا سامنا کرتی۔ اب میں اس شخص کے مطالعے کے بجائے کتابوں کا مطالعہ کرنے لگی تھی جو مجھے اخلاقی طور پر سنوار رہی تھیں، میں اس کی راہ میں رلنا نہیں چاہتی تھی۔

نجانے آج کل مجھ میں چڑچڑا پن کیوں پیدا ہو گیا تھا۔ حویلی میں میرا دل نہیں لگتا تھا۔ ماں بہنوں کی محبت سے مجھے وحشت ہوتی تھی۔ وہ اب بہت کم نظر آتی۔ اگر نظر آتی بھی تو اپنے کام میں مگن، منہمک، بالکل اردگرد سے لاپروا۔ میں نادانستہ ہی کھنکھارتا، کئی دفعہ اونچی آواز میں اپنی عادت کے برعکس باتیں کرتا کہ شاید وہ پہلے کی طرح وہ متوجہ ہو لیکن وہ تھی کہ جیسے اجنبی ہو۔ دن بدن میری بے چینی اور چڑچڑاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔

ایک دن میں گھر پر ہی تھا، اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑا جو حویلی کے پچھواڑے میں کھلتی تھی اس کو سوچ رہا تھا کہ اچانک میری نظر باہر صحن پر پڑی۔ جہاں وہ بیٹھی کوئی کتاب پڑھنے میں مگن تھی۔ بالوں پر دھوپ پڑنے کی وجہ سے ان کی رنگت بڑی خوب صورت لگ رہی تھی۔ دل چاہا کہ ایک بار انہیں چھو کر دیکھوں۔ منڈیر پر بیٹھا کوا بار بار کائیں، کائیں کر رہا تھا۔ جس کی آواز سے وہ بار بار بے چین ہوتی سر اٹھا کر "ہشش" کرتی اور پھر سے کتاب میں منہمک ہو جاتی۔ میں نجانے کیوں بڑی دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد میں نیچے گیا اور جا کر اس کے برابر بیٹھ گیا۔

اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور آنکھوں میں حیرانی نے ڈیرا جما لیا۔

"تم......" وہ کتاب بند کر کے حیرانی سے بولی۔

"ہوں۔" میں نے سامنے جامن کے ٹنڈ منڈ درخت کو دیکھتے ہوئے، ہوں کہنے پر اکتفا کیا۔

"اچھا تو تم کتابیں بھی پڑھتی ہو؟ میں نے ذرا سی گردن موڑ کر سرسری لہجہ اپنایا۔

"جی فارغ ہوتی ہوں تو پڑھ لیتی ہوں۔" وہ غالباً مخمصے کا شکار تھی کہ میں چار سالوں میں پہلی دفعہ کیوں اس سے مخاطب ہوا اور یہ واقعی سچ تھا میں نے چار سالوں میں اسے کبھی خود سے مخاطب نہ کیا تھا۔ اس نے میری بے اعتنائی چار سال سہی اور میں چار دن نہ سہہ سکا، عجیب بات تھی) تھوڑی دیر میں بیٹھا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا کہ میری انا تو اتنی سی کی اجازت بھی نہ دیتی تھی، یہ تو میں تھوڑا سا انا سے لڑ جھگڑ کر آیا تھا۔

مجھے یقین تھا، وہ پیچھے بیٹھی ان گنت سوچوں میں ڈوب چکی ہو گی آج؟ اتنے عرصے بعد کیوں؟ کیسے وغیرہ وغیرہ۔

اور پھر میں کبھی کبھی ایسے ہی اسے مخاطب کر لیتا اور نظر بھر کر دیکھ لیتا۔ ورنہ پہلے میں اسے اس وقت دیکھتا جب وہ بے خبر اپنے کام میں منہمک ہوتی۔ لیکن اب مقصد اسے اپنی طرف متوجہ کرنا تھا۔ مجھے نجانے کیوں اس طرح تسکین ملتی تھی کہ میں اسے خود سے باندھ کر رکھوں، کسی اور طرف متوجہ نہ ہونے دوں۔

☆☆☆

مجھے لگا تھا وہ بدلنے لگا ہے۔ شاید میری محبت میں اتنی طاقت آ گئی ہے کہ وہ بدل گیا ہے۔ میری خاموشی اور میرے غم کو سمجھنے لگا ہے۔ میری محبت کی صدا اس کے دل کے نہاں خانوں میں پہنچ گئی ہے اور اب آہستہ آہستہ وہ میری طرف مائل ہونے لگا ہے۔ لڑکیاں نجانے کیوں ہر عمر میں جھلیاں ہی رہتی ہیں۔ دو بول محبت کے ہر عمر میں ان کے ہر غم کا علاج ہوتے ہیں۔ ہر غلطی کا ازالہ۔ بس دو بول محبت کے اور ان کا دل پسیج گیا۔

لڑکے چاہے لڑکپن میں ہوں، جوانی میں یا چاہے بوڑھے ہو جائیں، وہ ہمیشہ پکے اور ڈھیٹھے ہوتے ہیں۔ جبکہ ہم لڑکیاں کسی کی ذرا سی توجہ سے ہی پگھل جاتی ہیں وہی حال میرا تھا۔ میرا اب یہی معمول تھا۔ اس سے محبت کرنا، اس کے لیے مختلف چیزیں بنانا، عقیدت سے اس کی ہر بات سننا جیسے وہ کوئی دیوتا ہو اور پھر...... کچھ ہی عرصے میں وہ رنگ بدل گیا۔ پہلے والا سجاول شاہ بن گیا جس کی پہچان بے حسی اور لاتعلقی تھی۔

میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ اب میں پھر سے اپنے آپ میں مگن ہو گیا تھا۔ یہ بھی عجیب بات تھی مجھے کسی اور سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا کہ کوئی مجھے کتنی

Digitized by Google

اہمیت دیتا تھا یا کتنی محبت کرتا تھا۔ وہ اکیلی اگر مجھے اہمیت دیتی تو مجھے اپنا آپ بہت بلند سا لگتا اگر وہ منہ موڑ لیتی تو مجھے اپنا آپ نہ ہونے کے برابر لگتا۔ حالانکہ مجھے چاہنے والوں کی کمی تو نہ تھی۔

میں نے زیادہ عرصہ غم نہ لیا۔ حالانکہ میرا دل چکنا چور ہو چکا تھا۔ اسے کیا ملا ایسے کر کے۔ وہ رات مجھے کھٹک گئی جس رات میں اس کے کمرے میں چائے کا پوچھنے گئی تو اس نے بڑے ہی سرد لہجے میں منع کیا تھا۔ اس رات نیند میری آنکھوں سے دور ہی رہی اور پھر وہ سارا ہی بدل گیا۔ کیا کوئی ایسے بھی بدلتا ہے۔

میں تو اس سے سوال کرنے کے قابل بھی نہ تھی۔ اس نے مجھے امید کے جگنو کبھی بھی نہ تھمائے میں اس کے لہجے کے رنگوں سے سارے مطالب خود ہی اخذ کرتی رہی جس کا مجھے یہ نتیجہ ملا۔ اس چیز نے مجھے جس قدر صدمے سے دوچار کیا، میں اس قدر ہی جلدی سنبھل گئی۔

☆☆☆

ایک دفعہ پھر پہلے والی صورت حال سے میں پھر چڑچڑا ہوا گیا۔ میں بار بار توجہ کی بھیک مانگنے اس کے پاس نہیں جا سکتا پھر سر جھٹکا، توجہ کی بھیک تو اسے چاہیے جو بظاہر مجھے نظر انداز کر رہی ہے۔ ”ڈرامے ہیں یہ سارے“ مجھے بار بار تاؤ آ رہا تھا پر میں بے بس تھا انا کے آگے۔ اس دوران اس کا ماسٹرز کا رزلٹ آ گیا۔

اس کے رشتے آنے لگے۔ گھر میں صرف دو لڑکیاں رہ سکتی تھیں۔ کیونکہ جن دو کے رشتے تھے ان کو دادا کسی صورت باہر نہ بھیجتے، نجانے وہ دو کون تھیں وہ سارا دن بولائی بولائی پھرتی میرے سامنے بات کرتی تو آواز میں نمی گھلی ہوتی اگر میں اس کی طرف دیکھنے کی زحمت کرتا تو پلکیں نمی لیے ہوتیں اور اب تو ہمہ وقت جھکی ہی رہتی تھیں اور میں ڈرامے سمجھ کر سر جھٹک دیتا تھا۔

حالانکہ جانتا تھا میں، وہ ڈرامے ہرگز نہ کر رہی تھی۔ نجانے کیوں اندر سے میرا دل چاہتا تھا کہ اس کا جو بھی رشتہ آئے بس پکا نہ ہو۔ خیر صرف چاہنے سے کیا ہوتا تھا، اس کے لیے آیا ایک امیر کبیر فیملی کا رشتہ فائنل ہو گیا۔ نجانے کیوں مجھے لگتا تھا، اسے صبر آ گیا وہ مطمئن ہو گئی ہو۔

میرا سارا اطمینان کہیں رخصت ہو گیا تھا۔ وہ پہلے جیسی پرسکون ہو گئی تھی، ہر وقت اپنے کام میں منہمک رہتی تھی۔ ساری کزنز اسے حمزہ علی خان کا نام لے کر چھیڑتیں اور وہ دھیرے سے مسکرا دیتی۔ اور میرے اندر جھکڑ سے چلنے لگتے۔ یہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ اس کا منگیتر بہت امیر تھا۔ اکیلا رہتا تھا۔ منگنی کے فوراً بعد شادی کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ میرا دل اور شدت سے چاہنے لگا کہ میں یہ شادی روک دوں۔ نہ ہونے دوں۔ جبکہ میری منہ زور انا جسے میں نے پہلے دن ہی بڑھاوا دیا تھا۔ وہ میرے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہو جاتی اور میں بے بس اس کی شادی کے انتظامات میں لگا رہتا۔

☆☆☆

مجھے لگتا تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن تو اپنا خول اتار ہی دے گا۔ جو بھی ہو مجھے یقین تھا کہ وہ بھی میری محبت میں مبتلا ہے نجانے اسے کیا چیز روکتی تھی۔ خیر مجھے لگتا تھا کہ وہ میری شادی کا سن کر ہی مجھ سے لڑنے چلا آئے گا اور اپنے وعدے اور امیدیں جو ان کہا تھا سب کچھ ان کی بابت سوال کرے گا مگر وہ پُرسکون ہی رہا۔

رب جانے اس نے اتنا مطمئن رہنا کہاں سے سیکھا تھا۔ حالانکہ اگر وہ شادی کے لیے میرا نام لیتا تو ہمارے درمیان کوئی ظالم سماج نہ تھا، اسی لیے وہ ظالم سماج کا کردار خود ادا کر رہا تھا۔

خیر مہندی کی رات مجھے یقین ہو گیا کہ ساری محبت جس میں میں نے اپنی عمر کا ایک حصہ تباہ کیا تھا وہ اکارت۔

یہ ساری توجہ، محبت اگر میں نے اپنے اوپر کی ہوتی تو مزید سنور جاتی۔ کیونکہ میں پہلے ایک سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ عام لڑکیوں کی طرح محبت میں نارسائی کے بعد خوب روئی۔ اس پتھر دل کے سنگ دل روتے

Google

پر......اور اس نادانی پر جو عمر بھر کرتی آئی۔ اس رات میں نے محبت کو مار کر (جسے قتل تو وہ پہلے ہی کر چکا تھا) وہیں حویلی کے پچھواڑے میں دفنا دیا۔ (جہاں میرا زیادہ وقت گزرتا تھا) اور محبت کی تازہ قبر پر بیٹھ کر خوب آنسو بہائے کہ یہ میرے اس محبت کے غم میں آخری آنسو تھے۔

جب بہت رونے کے بعد میں اٹھی تو دل ہر طرح کے احساس سے عاری تھا۔ اگلے دن میں نے نیا جنم لیا تھا جس میں کسی کی بھی محبت شامل نہ تھی۔ حتیٰ کہ کچھ گھنٹوں بعد نئے آنے والے ساتھی کی بھی نہیں۔

☆☆☆

مجھے اس کا شوہر دیکھنے کی کوئی خواہش نہ تھی۔ اس لیے جب بارات آئی تو دلہن کے بھائی کی حیثیت سے صرف میرے چچا زاد نے ہی استقبال کیا۔ میں دیگر انتظامات دیکھتا رہا۔ دل پر بھاری جبر کر رکھا تھا۔ اسے دلہن کے روپ میں بھی نہ دیکھا تھا۔ کہ دل پہلے ہی بہت مشکل سے سنبھل رہا تھا۔ نکاح کا وقت ہو چکا تھا کہ ایک نامانوس سا شور اٹھا۔ میں باہر سے اندر قناتوں تک آیا تو سارا خاندان اسٹیج پر دولہا کو گھیرے کھڑا تھا۔ میں دھڑکتا دل لیے وہاں تک پہنچا۔ تایا جی (زینب کے ابا) دادا جی سے مخاطب تھے۔

''ابا جی! آپ نے کیسے میری بیٹی کا نصیب ایک شادی شدہ مرد سے جوڑ دیا جس کا ایک بیٹا بھی ہے۔ آپ نے......'' تایا جی سے آگے کچھ بولا نہ گیا۔

''تمہیں پہلے جانچ پڑتال ہی نہ کرنے دی کہ میرے دوست کی فیملی ہے فکر نہ کرو۔ ماما جی یہ ٹھیک نہیں کیا آپ نے'' یہ چاچی تھیں۔

دادا حضور سمجھا رہے تھے کہ اتنا اچھا رشتہ میں صرف ایک بچے کی وجہ سے نہ ٹھکرا سکا جو کہ ہے بھی بن ماں کا حمزہ علی خان پڑھا لکھا ہے اتنا بڑا بزنس ہے کیا ہوا جو شادی شدہ ہے۔''

دادا پرانے خیالات کے مالک تھے۔ لیکن چاچا اور ابا حضور نہ مانے اور میرے ابا نے جلدی سے میرا نام لے دیا۔ جیسا کہ اکثر اس طرح کے موقعوں پر ہوتا تھا......اور میں میرا دل تو شاید کسی ایسی ہی صورت حال کا منتظر تھا کہ میری انا بھی سلامت رہے اور جو میں چاہتا ہوں، وہ بھی ہو جائے۔

ایسے میں جب بارات واپس جانے کے چکروں میں ہوا اور اس کے بعد کوئی بھی اس سے شادی نہ کرے گا۔ اس صورت حال میں میرے ہاں کرنے سے ایک تو مجھے میری محبت مل جائے گی (جس کا مجھے ابھی ہی ادراک ہوا تھا) دوسرا میں ساری زندگی اسے اپنے احسان تلے رکھوں گا اور میری انا کا سر بھی اونچا رہے گا۔ ابا کے اس فیصلے پر اس نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا اور میں نے بیزاری شکل بنا کر کف موڑے۔ حالانکہ اس سوگوار حسن کو دیکھتے رہنے پر دل اڑا ہوا تھا۔

''نہیں......'' ایک دم اس کی نم آواز ہال میں گونجی۔ میں نے جھکا سر اٹھا کر حیرت سے اسے دیکھا اور پھر وہ چلتی ہوئی تایا جی کے پاس آئی اور ان کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

''ابا! آج اگر میں ان کے ایک بیٹے کی وجہ سے انکار کر دوں جس کی عمر بھی ابھی ایک سال ہے...... اور اس کے علاوہ کوئی کسی قسم کی بھی خامی نہیں تو کیا خبر کل کو مجھے اس گناہ کی سزا ملے اور میں ساری عمر اس فیصلے پر پچھتاتی رہوں۔ آپ پلیز انکار نہ کریں۔''

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ مجھے لگا میں فنا ہو گیا ہوں۔ کسی قبر میں زندہ گاڑ دیا گیا ہوں۔ میں اسے روکنا چاہتا تھا لیکن اس لمحے بھی میرے قدم زنجیر ہو گئے جب وہ آنسو بھری آنکھیں مجھ پر ٹھہرائے ''قبول ہے'' کہہ رہی تھی اور میں ہمیشہ کے لیے ان آنسو بھری آنکھوں کا اسیر ہو گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو وہ رخصت ہو رہی تھی۔ سب سے ملنے کے بعد وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں نے بس اسے دیکھ کر منہ موڑ لیا۔

آج میں اپنے عروسی بیڈ پر بیٹھی سوچ رہی ہوں کہ میں نے اس سے اپنا پانچ سالوں کی اذیت کا بدلہ لے لیا۔ لیکن وہ تو آخری لمحے تک انا کا پابند ہی لگا مجھے۔ حالانکہ محبت میں انا کا عمل دخل نہیں ہونا چاہیے۔''

☆

Digitized by Google

مکمل ناول

سدرہ حیات

سب ہی کھوٹے سکے تھے

ماہرانہ انداز میں اپنے چہرے کے نقوش نکھارتی وہ مگن سی تھی۔ وہ ہر کام یکسوئی سے کرنے کی عادی تھی۔ پندرہ منٹ میں میک اپ کرلینے کے بعد وہ لباس تبدیل کرنے کی غرض سے ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ اگرچہ وہ کل ہی بزنس ٹور سے لوٹی تھی مگر اپنی تھکن کو پس پشت ڈالتی وہ اس کے ایک بار کہنے پر ہی مان گئی تھی۔ آج کوئی اسپیشل ڈنر تھا جس کے لیے وہ دل لگا کر تیار ہوئی تھی۔

اگلے تیس منٹ میں اپنی تیاری مکمل کرتی وہ قد آور آئینے میں اپنے آپ کو دیکھنے لگی۔ اس نے گہرے سیاہ رنگ کا پیپلم پہن رکھا تھا۔ جس پر سلور رنگ کے ریشم اور نگوں کا کام تھا۔ ساتھ میں سیاہ اسٹریٹ ٹراؤزر تھا۔ دوپٹہ بڑے اسٹائل سے کہنیوں پر رکھا ہوا تھا۔ بالوں کو سلیقے سے جوڑے میں باندھ رکھا تھا۔ اس کی دودھیا رنگت پر سیاہ رنگ بیڈرز گویا لشکارے مار رہا تھا۔ ساتھ میں پہنی ڈائمنڈ کی جیولری نے چار چاند لگادیے تھے۔ کمرے کی ہر شے جیسے اس کے روشنیاں بکھیرتے روپ کو سراہ رہی تھی۔

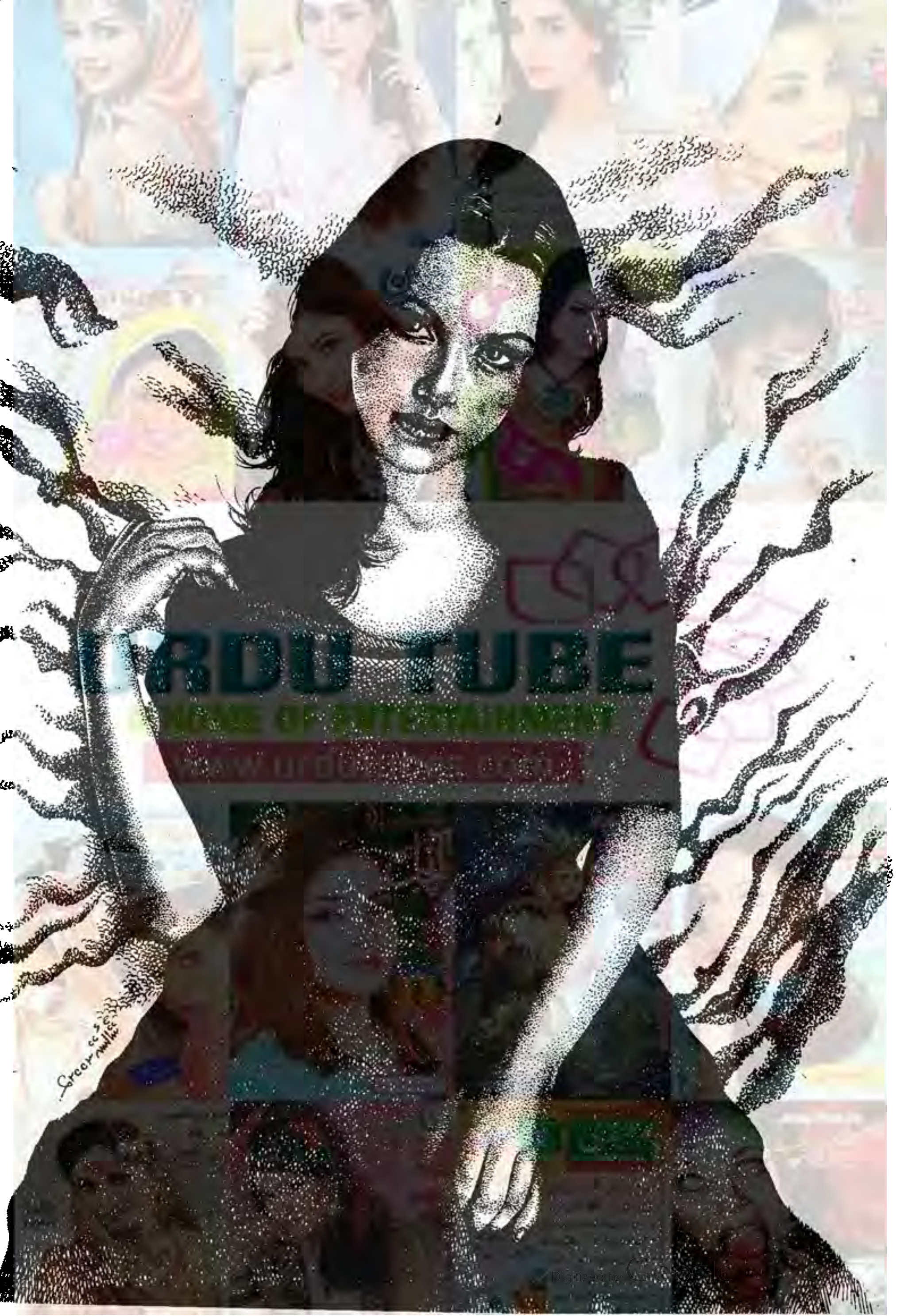
باہر سے آتی گاڑی کے ہارن کی آواز پر اس کے لبوں پر دل آویز مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆☆☆

موسم سرما کی اوائل راتیں اور ساتھ میں چلتی ٹھنڈی ہوائیں، رات کے اس وقت اسلام آباد کی سڑکوں پر پھرنا کسی امتحان سے کم نہیں تھا۔ بائیک کالونی کے باہر کھڑی کرکے وہ کب سے چک پھیریاں کھا رہا تھا۔ نیلی پتلون کے اوپر گہرے سرخ رنگ کی ہلکی سی جیکٹ پہن رکھی تھی جو موسم کی مناسبت سے ناکافی تھی مگر جتنی دیر سے وہ کالونی میں



Digitized by Google


RDU TUBE

خوار ہو رہا تھا۔ اسے موسم کی شدت تک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ تیز قدموں سے چلتے رہنے کی وجہ سے سانس پھول گیا تھا۔ سر پر رکھی پی کیپ عادتاً الٹی پہن رکھی تھی۔ موبائل کی آواز پر اس نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل نکالا، اسکرین پر نام دیکھ کر نہ چاہتے ہوئے بھی فون اٹھالیا۔

"تجھے پتا بھی ہے میں ڈیوٹی پر ہوں۔ اس وقت میں تیری کہانیاں نہیں سن سکتا۔ فون رکھ، ہوسکتا ہے کلائنٹ کا فون آجائے۔" سامنے گیٹ پر مطلوبہ نام پڑھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ بیل بجانے پر ایک خاتون نے دروازہ کھولا۔

"السلام علیکم! اٹیلیانو پیزا! آپ کی ڈلیوری تھی۔" اس نے پیشہ وارانہ مسکراہٹ چہرے پر پھیلائی، ساتھ ہی ہاتھ میں پکڑا شاپر آگے بڑھایا۔ خاتون نے خشمگیں نظروں سے اسے گھورا۔

"ہم نے کوئی پیزا نہیں منگوایا۔" اور کھٹاک سے دروازہ بند ہوگیا۔ وہ ہکا بکا کھڑا رہ گیا، اندر سے کسی بچے کی آواز آئی تھی۔

"ماما! آج تو پیزا کھالینے دیں، پلیز ماما! وہ باہر کھڑا ہے۔"

"ہر دوسرے دن تم لوگوں کو باہر سے کھانا کھانا ہوتا ہے۔" اندر سے آتی آوازیں سن کر اسے کچھ حوصلہ ہوا۔ کچھ دیر کے مذاکرات کے بعد دروازہ کھلا۔

"انکل پیزا دے دیں اس سے پہلے کہ ماما کا ارادہ بدل جائے۔" شرارتی مسکراہٹ والے بچے نے پیسے اس کی جانب بڑھائے۔

"بیٹا! پتا درست لکھوایا کریں اور فون بھی اٹھالیا کریں۔" مجبوراً ۔۔۔ پیشہ ورانہ مسکراہٹ سجائے وہ کہنا نہ بھولا۔

اگلے بیس منٹ اسے کالونی سے نکلنے میں لگ گئے۔ ابھی اسے بائیک کا بھی کچھ کرنا تھا جو آج دغا دے گئی تھی۔

☆☆☆

"فاران! بتا بھی دیں، ڈنر کس کی طرف سے ہے؟" اس کی جانب رخ موڑے بیٹھی وہ اسے گاڑی چلاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ جو سیاہ رنگ کے سوٹ میں بہت شان دار لگ رہا تھا۔ گاڑی کے ہیٹنگ سسٹم نے باہر کی خنکی کے احساس کو مٹا دیا تھا۔ اس کے دمکتے چہرے پر نگاہ ڈالتا وہ مسکرایا۔

"اظہر نے ڈنر دیا ہے، سرپرائز ہے۔ جا کر ہی معلوم ہوگا۔"

"ہوں، پھر تو یقیناً ان کی کوئی بڑی بزنس ڈیل فائنل ہوئی ہوگی۔" اظہر فاران کا قریبی دوست تھا جو اکثر اسی طرح کے ڈنر پلان کرتا تھا۔

اگلے آدھے گھنٹے میں وہ ہوٹل کی پارکنگ میں پہنچ چکے تھے۔ گاڑی لاک کر کے وہ ہم قدم چلتے اندر کی جانب بڑھے۔ ہال کی آرائش منفرد اور خوب صورت تھی، اس کے لبوں پر بے ساختہ توصیفی جملے آگئے۔

"واؤ، ایمپریسو۔" فاران محض مسکرادیا۔ پورا ہال ان کے دوستوں اور جاننے والوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کسی سے ملتی سامنے سے اظہر اور صلہ مسکراتے ہوئے قریب آئے۔

"ویلکم، پارٹی کے چیف گیسٹ تو اب آئے ہیں۔"

"آج کی پارٹی کچھ زیادہ ہی اسپیشل لگ رہی ہے۔ ارینجمنٹ بہت یونیک ہے۔" اس نے تعریف کی۔

"ہاہا، یعنی فاران پاس ہوگیا۔" اظہر کے بولنے پر اس نے ناسمجھی سے فاران کو دیکھا۔

"فاران!" جواباً وہ اس کا ہاتھ تھامے ٹیبل تک لے آیا جس پر بے شمار موم بتیاں جل رہی تھیں اور ان کے بیچ بڑا سا کیک ان کا منتظر تھا۔

"ہیپی فرسٹ ویڈنگ اینی ورسری۔" وہ اس کے کان کے پاس گنگنایا جو حیرت و خوشی کے ملے جلے تاثرات لیے کھڑی تھی۔ اسی وقت فاران نے ایک ٹیبل پر سے گلاس اٹھا کر اس پر چمچے سے آواز

Digitized by Google

پیدا کر کے سب کو متوجہ کیا۔

''لیڈیز اینڈ جنٹلمین! آج کی پارٹی میری اور انزا کی فرسٹ ویڈنگ اینی ورسری کی خوشی میں دی گئی ہے۔ آپ سب کا شکریہ، جو آج کی رات کو خوش گوار بنانے کے لیے اس پارٹی میں شریک ہوئے۔'' اونچی آواز میں بولتا وہ مسکرا کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔

''یہ دعوت اور جو کچھ میری زندگی میں ہے، وہ میری محبت، میری بیوی، میری انزا کے لیے ہے۔''

اپنا بازو اس کے کندھے پر پھیلائے اسے اپنے قریب کیا۔ تالیوں کی گونج پر اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ فاران کے سب کے سامنے پیار کے اظہار پر وہ ہمیشہ یوں ہی سرخ ہو جایا کرتی تھی۔

''ڈارلنگ! اچھا لگا سرپرائز؟'' اس کی کیفیت سے محظوظ ہوتا وہ بولا۔

''امیزنگ، ہر بار کی طرح۔''

''اور میرا گفٹ؟'' وہ کچھ اور اس کی جانب جھکا تو وہ خائف سی پیچھے ہوئی۔

''فاران! سب دیکھ رہے ہیں، اچھا نہیں لگتا۔'' وہ ایسی ہی تھی، اس معاملے میں اس کی خود اعتمادی کہیں جا سوتی۔

''اوکے۔'' فاران نے مسکراتے ہوئے کیک کاٹنے کے لیے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

اسے فاران کا سرپرائز دینے والا انداز بہت پسند تھا، وہ خود بھی اس کی زندگی میں کسی سرپرائز کی طرح آیا تھا۔ وہ اس کی سالگرہ کا دن تھا جب اس کی دوستیں لنچ کے بہانے اسی ریسٹورنٹ لے گئیں جہاں وہ اکثر جاتی رہتی تھیں۔ وہاں انہوں نے چھوٹی سی برتھ ڈے پارٹی ارینج کر رکھی تھی۔ وہ بہت خوش ہوئی تھی اور بھرپور انداز میں انجوائے بھی کر رہی تھی۔ وہ دوستوں کے ساتھ مگن تھی جب ویٹر نے اسے سرخ گلابوں کا خوب صورت سا بکے لا کر دیا۔ وہ حیران ہو کر ویٹر کی نشان دہی پر اس میز کی جانب دیکھنے لگی جہاں شان دار پرسنالٹی والا فاران سکندر بیٹھا تھا۔ اس سے نظریں ملنے پر وہ مسکرا دیا مگر وہ جواباً اپنی حیرت کو پیچھے دھکیلتی تیزی سے اٹھ کر اس کی میز تک گئی۔

''اس بکے کا کیا مطلب سمجھوں میں؟'' بکے اس کے سامنے پھینکتے، سینے پر بازو لپیٹے اسے گھورا۔ جوس کا آخری گھونٹ لیتا وہ اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔

''یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ ہیں، سرخ گلابوں کا مطلب تو سمجھتی ہوں گی۔''

''آپ کو یہ حق کس نے دیا کہ مجھے ایسا تحفہ دیں۔'' وہ مسکرایا۔ اس کی طرح، اس کی مسکراہٹ بھی سحر انگیز تھی۔

''میرے دل نے، جو اکثر آپ کو یہاں دیکھتا ہے۔ آج اس کی بے تابی حد سے بڑھ گئی تو مجھے یہ فرمائش ماننی پڑی۔'' اتنی بڑی بات کہہ کر وہ چلا گیا اور انزا دلاور کتنی دیر اپنی جگہ سے ہل نہیں سکی تھی۔ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی کہ ایک شخص اسے پسند کرنے لگا تھا۔ وہ تھی ہی اتنی خوب صورت کہ کوئی بھی اس کی چاہ کر سکتا تھا، لیکن اس کے انداز میں کچھ ایسا تھا کہ وہ ٹھٹک گئی تھی۔

ان کی دوسری ملاقات سڑک پر ہوئی تھی۔ یونیورسٹی سے واپسی پر اس کی گاڑی خراب ہوگئی، پاپا کے اصرار کے باوجود وہ ڈرائیور کو ساتھ نہیں لائی تھی اور اب بیچ سڑک پہ پریشان کھڑی تھی۔ فون کی بیٹری بھی ختم ہو چکی تھی، تب اچانک اس کی گاڑی قریب آ رکی اور نہ چاہتے ہوئے بھی انزا کو اس سے لفٹ لینی پڑی۔ اپنے ڈرائیور کو اس کی گاڑی کی بھی ذمہ داری دے کر وہ اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ اس دن وہ اس کی کافی کی آفر کو رد نہیں کر سکی تھی اور یوں ان کی دوستی و محبت کا آغاز ہوا تھا۔ جو جلد شادی کے فیصلہ کن موڑ تک پہنچ گیا۔ اس کے پاپا اس کی اتنی جلدی شادی کے حق میں نہیں تھے، وہ اسے باہر پڑھنے بھیجنا چاہتے تھے۔

فاران ان کو خاص پسند نہیں آیا تھا اور پھر اس کے خاندان میں کوئی نہیں تھا۔ وہ اکیلا تھا جس کی وجہ سے وہ اس رشتے کے خلاف تھے۔ وہ انزا سے چھ

Khawateen Digest December 2018
Digitized by Google

سال بڑا تھا۔ اگرچہ یہ فرق زیادہ نہیں تھا پر وہ ان ہی دو باتوں کو بنیاد بنا کر انکار کرتے رہے کہ کوئی ٹھوس وجہ بھی تو نہیں مل رہی تھی انکار کی۔ وہ اسٹیٹس میں بھی ان کے ہم پلہ تھا، اس کی ساکھ بھی اچھی تھی۔ بس انہیں وہ پسند نہیں آیا تھا، انہوں نے انزا کے سامنے اور بھی آپشنز رکھے تھے مگر وہ محبت میں کچھ اس طرح سے گھائل ہو چکی تھی کہ ان کی ناراضی کے باوجود فاران سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ جس پر وہ آج بھی اس سے ناراض تھے، اس سے ملتے رہنے کے باوجود وہ یہ بات فراموش نہ کر پاتے کہ اس نے ان کی ناپسندیدگی پر اپنی پسند کو فوقیت دی۔

☆☆☆

گھڑی میں ساڑھے دس کا وقت دیکھ کر وہ تلملاتے ہوئی اپنی نشست سے اٹھے، ہاتھ میں پکڑا اخبار تہ کر کے بغل میں دبایا۔ رخ اس کے کمرے کی جانب تھا، پہلے انہوں نے کمرے کے دروازے پر زور آزمائی کی مگر نتیجہ صفر۔ اب انہوں نے آگے بڑھ کر اس کی رضائی کھینچی پر وہ تو جیسے گدھے، گھوڑے بلکہ پورا اصطبل بیچ کر سو رہا تھا۔ ناقدانہ نگاہوں سے اسے گھورنے کے ساتھ اس کا کندھا ہلایا۔

''سونے دیں نا بی بی جان!'' رضائی کھینچتے اس نے کروٹ لی۔

''بی بی جان نہیں، یہ تمہارا باپ ہے۔'' کمال صاحب کی موجودگی کے احساس پر اس نے آنکھیں کھولیں تو انہیں سر پر کھڑا گھورتے پایا۔

''بابا! آپ کو پتا تو ہے ساری رات ڈیوٹی کرتا ہوں۔ اسی لیے تھوڑا لیٹ اٹھتا ہوں۔ چار بجے پھر ڈیوٹی کے لیے نکلنا ہوگا۔'' وہ خوامخواہ تفصیلات بتا رہا تھا جب کہ وہ اس کے معمولات سے واقف تھے۔

''آپا ناشتا بنا رہی ہیں، فوراً اٹھ جاؤ۔''

''آپ چلیں، میں تھوڑی دیر میں اٹھتا ہوں۔''

اس کا ارادہ بھانپتے وہ وہیں ایک کرسی پر جم گئے۔

''روز کا وتیرہ تو آپ کا یہی ہے، دن چڑھے اٹھنا اور ڈیوٹی پر چل دینا۔ پر آج برخوردار اتوار کا دن ہے اور قسمت سے میں گھر پر موجود ہوں۔ اب جب تک منہ ہاتھ دھو کر نہیں آؤ گے، یہیں بیٹھا رہوں گا۔'' وہ بات مکمل کرتے اخبار کھول کر بیٹھ گئے۔ انہیں جما دیکھ کر اسے اٹھتے ہی بنی۔ منہ ہاتھ دھو کر آیا تو وہ ہنوز موجود تھے۔

''بیٹھو۔'' انکار کی گنجائش نہیں تھی، وہ شرافت سے دوسری کرسی پر ٹک گیا۔

''یقیناً ناشتے کی ہیوی ڈوز دیں گے۔ بیٹا ولی آج تجھے دوبار ناشتا کرایا جائے گا۔ خیر منا اپنی۔''

دل ہی دل میں خود سے مخاطب وہ بظاہر پوری توجہ سے ان کے بولنے کا منتظر تھا۔

''کب تک چلے گی یہ پیزا ڈلیوری والی نوکری؟'' ان کا انداز چبھتا ہوا تھا۔

''اور کوئی نوکری ملتی بھی تو نہیں ہے۔''

''ظاہر ہے پہلے ہی نوکریوں کا کال پڑا ہے اور آپ ہیں بھی صرف بی اے پاس۔'' اس کے سر جھکانے پر وہ نرم پڑے۔

''چلو مانا کہ ہمارے حالات اجازت نہیں دیتے تھے کہ تم اپنی خواہش پوری کرتے، انجینئرنگ پڑھ پاتے۔ پر زندگی میں اور بہت سے راستے ہوتے ہیں اگر آپ تلاشنا چاہیں، اس طرح ایک ہی لکیر پیٹتے رہنا کہاں کی دانش مندی ہے۔''

''جی میں سوچ رہا ہوں اس بارے میں۔'' وہ بولا تو وہ اخبار تہ کرتے سیدھے ہوئے۔

''سوچ تو بیٹا جی آپ ایک سال سے رہے ہیں، پر میں نے آپ کو کتابیں اٹھاتے نہیں دیکھا۔ ناشتے کے بعد کتابیں جھاڑیں اور سی ایس ایس کی تیاری شروع کر دیں۔''

''بابا پلیز آج تھوڑی دیر سو لینے دیں۔ اب رات کی ڈیوٹی دے کر بندہ کہاں کتابوں میں سر کھپا سکتا ہے۔ آپ خود انصاف کریں۔'' اس کی تو گویا

Google

جان پر بن آئی۔
"کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے۔ شاباش جلدی سے ناشتے کے لیے چلو۔" اس کے چودہ طبق روشن کرتے وہ اطمینان سے اٹھ کر چل دیے اور وہ لاچاری سے پیچھے ہولیا۔ آج ان کے ارادے خاصے خطرناک معلوم ہو رہے تھے۔

☆☆☆

"اگر تم مجھے نہ ملیں تو میری سانسیں رک جائیں گی۔ عالی تم......"
"بس کردے اپنے یہ تھکے ہوئے ڈائیلاگز۔ کوئی کسی کے لیے نہیں مرتا، سب زندہ رہتے ہیں اور جتنے یہ ڈائیلاگز پرانے ہو چکے ہیں، یقین مان اب قارئین کے جذبات میں کسی قسم کا تہلکہ نہیں مچا سکتے۔"
"شکر ہے میرے قارئین تیرے جیسے نہیں ہیں۔" اس کے تجزیے پر مراد نے منہ پھلا لیا۔
"ہاں وہ خاصے سمجھ دار ہیں۔ اتنے آؤٹ ڈیٹڈ نہیں رہے۔"
"بول لے، جتنا بولنا ہے۔ جب میں بڑا ادیب بن جاؤں گا نا تب میری قدر آئے گی تجھے۔" مراد کی سنجیدگی سے کہی بات پر اس کی ہنسی بے ساختہ تھی۔
"ادیب نہیں، ادیبہ۔ مت بھول تو خواتین کے رسالوں میں اربیلا مراد کے نام سے لکھتا ہے۔"
"مجھے چھوڑ، تو بتا۔ انگارے کیوں چبا رہا ہے؟" اس کے اندر کی بے چینی کو تو وہ پہلے ہی بھانپ گیا تھا آخر اتنی پرانی دوستی تھی ان کی۔ اس کا موڈ دیکھ کر ہی تو وہ اسے اپنی تازہ تحریر کے سین سنا رہا تھا، جس کی اس نے درگت بنا ڈالی تھی۔
"وہی پرانا قصہ۔ بابا چاہتے ہیں میں اس بار سی ایس ایس کا امتحان دوں اور تجھے پتا ہے میری دلچسپی نہیں رہی پڑھائی کی طرف۔ نوکری بھی تو کر رہا ہوں نا، اس میں ہی کوئی ترقی کا چانس ہوتا تو بابا کم از کم مطمئن تو ہو جاتے۔" جوتے کی نوک سے زمین رگڑتا وہ اپنی پریشانی اسے بتا رہا تھا۔
"انکل ٹھیک کہتے ہیں اور اس میں کیا ترقی ہونی ہے۔"
"ہاں تو کچھ اور کر سکتے ہیں۔ وہ ہمارا امری والا آبائی گھر جس کے قبضے کا کیس چل رہا ہے، وہ ہمارے کام آ سکتا ہے۔ آخر مال روڈ پر ہے اسی کو کرائے پر چڑھا دیں، بہت منافع ہوگا۔" اس کے اپنے ہی پلانز تھے۔
"شیخ چلی کے جانشین! وہ تیری نہیں انکل کی پراپرٹی ہے اس لیے تو اس کے منافع کی فکر نہ کر۔"
ولی نے گہرا سانس لیا۔ وہ سچ ہی تو کہہ رہا تھا جب تک وہ بابا کی بات نہیں مانے گا، وہ اسے ہرگز اپنی من مانی نہیں کرنے دیں گے اور پھر کسے خبر تھی، قبضے والا کیس وہ جیت بھی پاتے یا نہیں۔


خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول
دستِ کوزہ گر
فوزیہ یاسمین
قیمت -/750 روپے
32735021

☆☆☆

منزی مندی آنکھوں سے گھڑی پر نگاہ ڈالتی وہ یکدم اٹھ بیٹھی۔ دو بج رہے تھے جب کہ وہ زیادہ سے زیادہ بارہ بجے تک سوتی تھی۔ بے اختیار اپنی دائیں جانب دیکھا، وہ یقیناً دفتر جا چکا تھا۔ روز وہ آٹھ بجے ساتھ ناشتا کرتے تھے اور اسے دفتر بھیج کر ہی وہ اپنی نیند پوری کرتی، جب وہ رات میں باہر ڈنر کر کے آتے، اگلی صبح وہ اس کو جگائے بغیر دفتر چلا جاتا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنی وجہ سے اسے پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ اس کی محبت پر وہ یوں ہی تو نہیں اترائی تھی، وہ تھا ہی اتنا خاص۔ اس کا خیال رکھنے کا اپنا ہی انداز تھا جو اسے بہت پسند تھا۔ اس کے متعلق سوچتی وہ چہرے پر بھرپور مسکراہٹ سجائے فریش ہونے کے لیے باتھ روم میں گھس گئی۔

ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھتے ناشتے کا انتظار کرتی وہ موبائل پر میسج دیکھنے لگی۔ صبح سے فاران کا کوئی میسج نہیں آیا تھا۔ حیران ہوتی وہ اسے کال ملانے لگی۔ فون بند جا رہا تھا یقیناً میٹنگ میں ہوگا۔ آج غیر ملکی وفد سے اس کی میٹنگ بھی تھی۔ یہ سب سوچتی وہ ناشتے کی جانب متوجہ ہوگئی۔

چار بجے اسے کلب کے لیے نکلنا تھا اور اب ساڑھے چار بج رہے تھے مگر وہ اسی حلیے میں بیٹھی تھی۔ ابھی تک اس کا فاران سے رابطہ نہیں ہو پایا تھا اور یہ بات اسے تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔ کچھ سوچ کر اس نے دفتر فون کیا۔

"جواد صاحب سے بات کرائیے میں مسز فاران سکندر بات کر رہی ہوں۔" لب کاٹتی وہ سنجیدگی سے بولی۔

"ہیلو جواد صاحب! میٹنگ ابھی تک ختم نہیں ہوئی؟ آپ ذرا پتا کریں۔"

"میم! میں کب سے آپ کے لینڈ لائن پر کال کر رہا ہوں مگر شاید وہ خراب ہے۔"

"جی۔ وہ کچھ دنوں سے خراب ہے۔ آپ فاران کا بتائیں، کہاں ہیں۔" بے چینی سے پوچھا۔ دل پتا نہیں کیوں عجیب سا ہو رہا تھا۔ جواب میں جواد صاحب نے جو خبر سنائی وہ دل دہلا دینے والی تھی۔

☆☆☆

"بی بی جان! جلدی سے کھانا لگائیں، بہت بھوک لگ رہی ہے۔" آج اس کی چھٹی تھی۔ سو شام ڈھلے گھر میں گھستے ہی شور مچانے لگا۔ مراد سے حال احوال پوچھتی بی بی جان مسکرائیں۔

"آج تم گھر پر ہو تو معلوم تھا، آتے ہی بھوک کا شور مچا دو گے۔"

"کیا بنایا ہے؟ خوشبو تو بہت اچھی آرہی ہے۔" سانس اندر کھینچتا وہ خوشبو سونگھتا ان کے پاس آیا۔

"تمہاری پسند کی بریانی بنائی ہے۔"

"واؤ، اب جلدی سے دے دیں بی بی جان۔" وہ سر ہلاتی اپنے گھٹنوں پر زور ڈالتی اٹھیں۔

"آپ کے گھٹنوں کا درد کیسا ہے؟" مراد نے ان کو مشکل سے اٹھتے دیکھ کر پوچھا۔

"تمہاری اماں نے جو تیل بھیجا تھا اس سے کافی افاقہ ہے، پر کچھ دنوں سے ختم ہے تو پھر سے درد اٹھنے لگا ہے۔"

"بتایا کیوں نہیں بی بی جان! اب ہم نکلیں گے کھانے کے بعد میں لے آؤں گا۔" ولی نے فکر مندی سے کہا۔ "بلکہ کھانا بھی ہم لگا لیتے ہیں، آپ بیٹھیں۔" اسے اٹھتا دیکھ کر انہوں نے روکا۔

"رہنے دو تم، میں نے ارمینا کو بلایا ہے کہ آ کر بریانی لے جائے۔ بچی کچن میں ہی ہے، کھانا لگا دے گی۔"

ان کے کہنے پر جہاں ولی کی نگاہیں بے اختیار کچن کی جانب اٹھیں، وہیں مراد معنی خیز انداز میں کھنکھارا۔

"اب تو سر کے بل کچن کا رخ کریں گے۔"

اس کی بڑبڑاہٹ پر ولی نے قطعاً کان نہ دھرے۔ ساری توجہ اب کچن سے نظر آتے اس کے رنگین آنچل پر تھی۔ بی بی جان کچن میں چلی گئیں تو وہ بھی کھانے کی میز پر آ بیٹھے۔

''بابا کب آئیں گے؟'' بی بی جان کو آتے دیکھ کر خیال آیا۔
''وکیل کے پاس گئے ہیں، پتا نہیں کتنی دیر لگ جائے۔'' سر ہلاتے اس نے قریب آتی ارینا کو دیکھا۔ میرون رنگ کے جوڑے میں وہ ہمیشہ کی طرح کھلی کھلی لگ رہی تھی۔ بریانی کی ڈش میز پر رکھتے مسکراتی نظر اس پر ڈالی ضرور مگر مخاطب بی بی جان کو کیا۔
''کھیر پک گئی تھی، میں نے چولہا بند کر دیا ہے اور وہ رسالہ بھی آپ کے کمرے میں رکھ آئی ہوں۔''
''اچھا اچھا۔ تم بیٹھو ہمارے ساتھ بھی تھوڑا سا کھالو۔'' ان کے دعوت دینے پر ولی بول اٹھا۔
''ایسا نہ کریں بی بی جان! ساری بریانی کھا جائے گی۔'' انداز چھیڑتا ہوا سا تھا۔
''جی نہیں، تمہاری طرح پیٹو نہیں ہوں۔'' ناراضی سے اسے گھورا۔
''ولی۔'' بی بی جان نے اسے تنبیہی نظروں سے دیکھا، حالانکہ وہ جانتی تھیں اس کے شرارتی مزاج کو۔
''آپ رسالہ پڑھ کر بتا دیجیے گا، میں نے بھی ابھی پورا نہیں پڑھا۔'' وہ دونوں رسالے پڑھنے کی شوقین تھیں، اس لیے ارینا ہر مہینے کا رسالہ انہیں دے جاتی۔ وہ لوگ نہ صرف ان کے پڑوسی تھے بلکہ وہ بی بی جان کے سسرالی رشتہ دار بھی تھے۔ بیوہ ہونے کے بعد جب وہ بھائی کے پاس آگئیں تو ان سے تعلقات کچھ اور بڑھ گئے۔
''ہاں وہ ایک نئی رائٹر کی کہانی بھی چھپی ہے نا، اربیلا مراد کی۔'' ولی کے جملے پر پانی پیتے مراد کو اچھو لگ گیا۔
''پڑھی تم نے؟'' وہ پوری طرح ارینا کی جانب متوجہ تھا، جانتا تھا کہ مراد اسے کس بری طرح گھور رہا ہے۔
''ہوں پڑھی تھی، پچھلی بار بھی۔ اچھی تھی، پر تمہیں کیسے پتا؟''
''میں جانتا ہوں نا اسے۔'' اب کی بار مراد نے اپنا پیر زور سے اس کے پیر مارنا چاہا۔ پر برا ہوا جو بی بی جان کے پیر پر جا لگا۔ ان کے منہ سے سسکاری نکلی تو وہ شرمندگی سے سر جھکا گیا۔
''تم کیسے جانتے ہو؟'' وہ تکلیف بھول کر پوچھنے لگیں۔
''مراد کے دوست کی بہن ہے۔'' شرارت سے اسے دیکھا۔
''چلو ہماری بھی ملاقات کروانا کبھی۔''
''جی مگر مجھ سے زیادہ تو ولی اسے جانتا ہے۔ اکثر اس کی ملاقات ہوتی رہتی ہے، بڑا امتاثر ہے اس کی شخصیت سے۔'' مراد نے بھی ادھار نہ رکھا۔ ارینا کی آنکھوں میں ابھرتا غصہ ولی کو کچھ غلط ہونے کا احساس دلا گیا۔
''نہیں، یہ مذاق کر رہا ہے۔''
''میں چلتی ہوں، بی بی جان!'' پیر پٹختی وہ تیزی سے نکلتی چلی گئی۔ ولی نے مراد کو گھورا جواب مزے لے کر بریانی کھا رہا تھا، حساب جو برابر کر لیا تھا۔

☆☆☆

فاران کے غائب ہونے کی خبر اس پر بجلی بن کر گری تھی۔ رو رو کر برا حال کر لیا تھا اس نے۔ سوچ سوچ کر دماغ ماؤف ہو رہا تھا کہ فاران کا ایسا کون سا دشمن نکل آیا تھا جو اسے نقصان پہنچا سکتا تھا۔ مگر جلد ہی اس الجھن کا سرا مل گیا جب اسے اغوا کاروں کی جانب سے فون موصول ہوا۔ اس کی ٹوٹتی ہمت کو گویا سہارا ملا، فاران کی زندگی کے لیے تو وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اس نے فوراً منیجر کو کال کی۔
''کیا ہوا جواد صاحب! بینک سے پیسے نکالنے میں کوئی مسئلہ تو نہیں ہے نا۔'' ان کی خاموشی سے وہ خائف ہوئی۔
''میم اس وقت چھ کروڑ بہت بڑی رقم ہے اور سچ تو یہ ہے کہ بینک میں ایک کروڑ سے زیادہ کی رقم نہیں ہے۔'' جواد صاحب کے انکشافات اسے مزید پریشان کیے دے رہے تھے۔
''کمپنی کچھ عرصے سے نقصان میں جا رہی ہے اور ابھی سر نے اپنی اینی ورسری پر اتنی مہنگی جیولری

خریدی ہے۔"

اس کے اور فاران کے اکاؤنٹ میں بھی اتنی رقم موجود نہیں تھی کہ چھ کروڑ کا تقاضا پورا کیا جا سکتا۔ فاران کے دوست اظہر بھی ملک میں نہیں تھا۔ ایک دم اسے پاپا کا خیال آیا تھا۔ کل رات ہی وہ بزنس ٹور سے واپس آئے تھے۔ ڈرائیور سے گاڑی نکالنے کا کہتی وہ اسی ملگجے حلیے میں چل پڑی تھی۔

☆☆☆

بظاہر آنٹی کی باتوں پر سر ہلاتے اس کے کان کچن سے آتی کھٹ پٹ کی آوازوں پر تھے۔ چھوٹی فروا کو اس کے پاس بٹھا کر وہ بی بی جان کی مطلوبہ چیز لینے کے لیے اٹھ گئیں۔ فروا اپنی ڈرائنگ بک لینے چلی گئی تو وہ کچن میں جا گھسا جہاں وہ چولہے کے سامنے کھڑی کڑھ رہی تھی۔ اس کے کھنکھارنے پر مڑی اور خون خوار نظروں سے اسے گھورا۔ وہ شرارت سے مسکرایا، الفاظ منہ میں تھے کہ اس نے جھٹ کاؤنٹر پر پڑی چھری اٹھا کر اس کے سامنے کی۔

"ارے ارے، یہ کیا کر رہی ہو؟" چھری کو اپنے قریب دیکھ کر گڑبڑایا۔

"تم اپنے دوستوں کی بہنوں سے فری ہوتے پھرو اور میں تمہیں یوں ہی چھوڑ دوں۔" چھری اس کے سامنے گھمائی۔

"اوہو، وہ تو مراد مذاق کر رہا ہے۔ میں تو کسی اریبلا نامی لڑکی کو جانتا تک نہیں ہوں۔" (ہاں البتہ لڑکے کو ضرور جانتا ہوں)۔

"پھر اس کے نام سے کیسے واقف ہو؟" وہ ابھی تک مشکوک تھی۔

"مراد سے سنا تھا، وہی پڑھتا ہے رسالے۔" مراد کا نام دانتوں میں چبایا۔

"تمہارے ہوتے ہوئے میں بھلا کسی اور کے بارے میں سوچ سکتا ہوں۔"

"سوچنا بھی مت ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" اس بار نرمی سے بولتے اس نے چھری پیچھے کی۔

"شکر ہے، ورنہ آج تم نے مجھ معصوم کا قتل کر دینا تھا۔"

"خیر اب اتنی ظالم بھی نہیں ہوں، یہ تو محض تمہیں دھمکانے کو چھری اٹھالی ورنہ تم مجھے زچ کر دیتے۔" وہ ناز سے مسکرائی۔

"یاد رکھنا، اگر کوئی اور لڑکی تمہاری زندگی میں آئی نا تو حشر کر دوں گی۔" اسے خبردار کیا۔

"تمہارے علاوہ بھلا کوئی آ سکتی ہے۔" اسے خوش ہوتے دیکھ کر مسکراہٹ دبائی۔

"جس کے پیچھے تم جیسی خون خوار لڑکی پنجے گاڑ کے پڑی ہو، اس بے چارے کو تو کوئی لفٹ بھی نہیں کرواتی۔"

"ولی کے بچے۔" اس کی بات سمجھتے ہی وہ بگڑی تو وہ ہنستے ہوئے باہر کی جانب بھاگا مگر جاتے جاتے بھی اسے چھیڑنا نہ بھولا۔

"ابھی کہاں، ابھی تو وہ معصوم تمہاری پہنچ سے دور عیش کر رہے ہوں گے۔"

ماں کو لاؤنج میں دیکھ کر اس کے پیچھے جانے کا ارادہ ترک کرتی وہیں کھڑی وہ اس کی بات پر ہنستی چلی گئی۔

☆☆☆

"بابا پلیز، مجھے پولیس سے رابطہ نہیں کرنا۔ آپ بس پیسوں کا انتظام کر دیں۔" اس نے ملتجی لہجے میں کہا۔

"اور اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ چھ کروڑ لے کر فاران کو چھوڑ دیں گے۔"

"تو کیا اس ڈر سے میں فاران کو بچانے کی کوشش بھی نہ کروں۔ مجھے اپنا سب کچھ دے کر بھی اسے بچانا پڑے تب بھی یہ سودا گھاٹے کا نہیں ہوگا۔ اس کی زندگی سے اہم تو کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ بتائیں اگر فاران کی جگہ میں اغوا ہوئی ہوتی تب بھی آپ یوں ہی سوچ بچار کرتے رہتے۔"

"انزا!" وہ تنبیہی لہجے میں بولے۔ وہ ان کی اکلوتی اور لاڈلی اولاد تھی جسے کانٹا بھی چبھ جاتا تو ان کی جان پر بن آتی۔

Google

''تو میں کیا کروں پاپا! پلیز مجھے اس بات کی سزا دینا چھوڑ دیں کہ میں نے آپ کی مخالفت کے باوجود فاران کو اپنی زندگی میں شامل کیا۔ معاف کردیں پاپا! اس کی جان بچالیں۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کررودی۔ دلاور صاحب اٹھ کراس کے قریب بیٹھ گئے اوراس کا سر اپنے سینے سے لگالیا۔

''تم فکرمت کرو، میں بھلا تمہیں تکلیف دینے کا سوچ سکتا ہوں؟ چھ کروڑ چھوٹی رقم نہیں ہوتی۔ انتظام کرنے میں تھوڑا وقت لگے گا۔ اغوا کاروں کا فون آئے تو ان سے مزید وقت مانگ لینا، اب یہ رونا بند کرو، تمہارا باپ ابھی زندہ ہے۔'' اس کا سر تھپکتے انہوں نے اسے تسلی دی۔ اس نے سر ہلایا، اتنے گھنٹوں کی بے آرامی اور گریہ وزاری کے باعث سر پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا اور آنکھیں الگ جل رہی تھیں جب کہ دلاور صاحب سوچ رہے تھے کہ اتنی بڑی رقم کے فوری انتظام کے لیے انہیں کسی سے قرض لینا پڑے گا کیونکہ وہ خود نئی برانچ کھول رہے تھے جس کی وجہ سے بینک میں اتنی رقم نہیں تھی۔

☆☆☆

''ڈیوٹی پر جارہے ہو؟'' گنگناتا ہوا وہ بائیک پر آکر بیٹھا تو اس کی آواز پر چونکا۔ اپنے اردگرد نگاہیں گھمائیں مگر وہ سامنے ہوتی تو نظر آتی۔

''یہاں ہوں بھئی لان میں۔'' اس کی کھلکھلاتی ہوئی آواز پھر سے آئی تو وہ دیوار کے ساتھ رکھے اسٹول پر کھڑا ہوگیا۔ اپنے گھر کے صحن میں کھڑی، پودوں کو پانی دیتی وہ اسی کی جانب متوجہ تھی۔

''مراد کی طرف جارہا تھا، وہیں سے ڈیوٹی پر چلا جاؤں گا۔'' اس کی طرف دیکھتے شرارتی چمک آنکھوں میں ابھری۔ ''تم کہتی ہو تو رک جاتا ہوں، اب اتنا اصرار کروگی تو منع تو نہیں کرپاؤں گا نا۔''

''مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولی پھر پائپ رکھ کر دیوار کے قریب آئی جس کی اوپری سطح پر دونوں بازو رکھے وہ اندر جھانک رہا تھا۔

''تم نے اپنے مستقبل کا کیا سوچا ہے ولی؟''

''خیر تو ہے، اس وقت میرا مستقبل کہاں سے آگیا۔'' ہلکے پھلکے انداز میں کہتا وہ قطعاً سنجیدہ نہیں تھا۔

''بی سیریس ولی! یہ ہماری زندگی کا سوال ہے۔ امی آج کل میری شادی کے پیچھے پڑی ہوئی ہیں اور ابو بھی کویت سے آرہے ہیں اس ہفتے۔'' اریبا کی پریشان صورت دیکھ کر اس کے تاثرات بدلے۔

''میں بابا اور بی بی جان سے بات کرتا ہوں، وہ رشتہ لے آئیں گے۔ تم فکرمت کرو۔''

''یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔'' وہ بے چینی سے بولی۔

''تم تو کہہ رہی تھیں آنٹی تمہاری خواہش سے واقف ہیں۔''

''واقف ہونا اور متفق ہونا دو الگ باتیں ہیں۔ ان کی نظر میں تمہارا مستقبل ایک سوالیہ نشان ہے۔ اسی لیے میں تم سے کہتی رہی کہ سی ایس ایس کرلو مگر تم سنتے ہی کب ہو کسی کی۔ اب بتاؤ میں کیا کروں؟'' وہ روہانسی ہوئی تو وہ بھی پریشان ہوگیا۔

''دیکھو اریبا! مانا کہ ابھی اتنی اچھی نوکری نہیں ہے میرے پاس، مگر بے کار بھی تو نہیں بیٹھا نا۔ سی ایس ایس کا امتحان بھی دے دوں گا اور پھر ہمارا مری والا گھر۔ اس کا قبضہ ملے گا تو اس سے کاروبار بھی شروع کیا جاسکتا ہے، لیکن مجھے کچھ وقت تو دو اس سب کے لیے۔ اتنی جلدی کیا ہے تمہارے گھر والوں کو۔''

''میں امی سے بات کروں گی۔ بس تم امتحان کی تیاری کرو پھر سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' اس کو تسلی دیتی وہ مسکرائی جب کہ وہ محض سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

☆☆☆

کروٹ کے بل لیٹی وہ خود سے کچھ فاصلے پر سوئے فاران کو بغور دیکھے جارہی تھی۔ وہ گہری نیند میں تھا، شاید اسے دی گئی ادویات کا اثر تھا کہ وہ یوں بے خبر تھا اور نیند تو اسے بھی کتنی راتوں کے بعد آئی تھی جب فاران رات صحیح سلامت واپس آگیا تھا۔ اس کے لیے اس سے بڑی خوشی بھلا کیا ہوسکتی تھی۔

Digitized by Google

آنکھ کے کنارے سے پھسلتے آنسو کو اس نے انگلی سے جھٹکا اور تشکر سے مسکرادی۔

نہا کر تازہ دم سی باتھ روم سے نکلی اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بال سلجھانے لگی۔ چہرے پر سکون کی گہری چھاپ تھی اور کیوں نہ ہوتی کہ اس کی زندگی میں ایک بڑا طوفان آکر گزر چکا تھا۔ اس کی نگاہیں صوفے پر پڑی جیکٹ پر پڑیں۔ کل فاران نے یہی پہن رکھی تھی، اس کے لبوں پر پھیلتی مسکراہٹ سمٹی۔ ہاتھ میں پکڑا برش واپس رکھ کر وہ صوفے تک آئی۔ ارادہ یہی تھا کہ جیکٹ کسی ملازم کو دے کر اس واقعے سے جڑی ہر چیز کا وجود مٹادے۔ جیکٹ اٹھانے پر کوئی چیز قالین پر گری۔ اس نے جھک کر دیکھا، وہ نیند کی گولیوں کی شیشی تھی۔ وہ متعجب سی شیشی کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ فاران تو کبھی بھی نیند کی دوا استعمال نہیں کرتا تھا پھر سوئے ہوئے فاران پر نگاہ ڈالی۔ شاید ان ناخوش گوار واقعات کو بھلانے کی غرض سے اس نے رات ان گولیوں کو استعمال کیا ہو۔ اس خیال کے آتے ہی وہ مطمئن ہو گئی۔ جوں ہی وہ سیدھی ہوئی، مدھم سروں میں بجتی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔ آواز جیکٹ کی جیب سے آرہی تھی، اس کی نظریں بے اختیار بیڈ کی سائیڈ میز پر گئیں جہاں فاران کا موبائل پڑا تھا۔ جب اسے اغوا کیا گیا تھا تو گاڑی میں اس کا موبائل بھی پڑا ملا تھا۔ پھر یہ کس کا موبائل تھا؟ مسلسل بجتے موبائل کو جیب سے نکالتی وہ اچنبھے کا شکار تھی۔

☆☆☆

"جلدی کریں بی بی جان! ڈیوٹی کا ٹائم ہو جائے گا۔" ولی نے کچن کی جانب دیکھ کر ہانک لگائی، جہاں بی بی جان کھڑی اس کے لیے پراٹھا بنا رہی تھیں۔

"لا رہی ہوں۔ جلدی جلدی مچا کر میرے ہاتھ پیر نہ پھلایا کرو۔" جواب دیتی وہ تیزی سے ہاتھ چلا رہی تھیں۔ پانچ منٹ بعد ہی وہ اس کا پسندیدہ آلو کا پراٹھا لے کر آ گئیں، ساتھ پودینے والی چٹنی اور چائے کا بھاپ اڑاتا مگ تھا، اس کی بھوک چمک اٹھی۔

بی بی جان قریبی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔

"پھر اس اتوار آپ دونوں جا رہے ہیں نا ارینا کے گھر رشتہ لے کر۔" لقمہ منہ میں رکھتا وہ بولا۔

"ہاں بات ہوئی ہے کمال سے میری۔ لڑکی تو ہم دونوں کو ہی پسند ہے، پر وہ مانے اسی شرط پر ہیں کہ تم اس بار سنجیدگی سے سی ایس ایس کا امتحان دو گے۔" باپ کا مطالبہ سن کر اس کے ہاتھ لمحے بھر کو رکے، ٹھنڈی سانس لبوں سے نکلی۔

کچھ دیر وہ اسے خاموشی سے کھانا کھاتے دیکھتی رہیں پھر اسے آخری لقمے لیتے دیکھ کر سمجھانے والے انداز میں بولیں۔

"اب باپ کی شکایت دور کر دو۔ امتحان دے دو گے تو وہ بھی خوش ہو جائیں گے۔"

"بی بی جان امتحان تو میں دے دوں گا، پر زیادہ امید نہ رکھیں۔ پاس نہیں ہونے والا۔"

"ارے وہ کیوں؟" نگاہیں اس پر ٹکی تھیں، جو ہاتھ دھونے کچن میں چلا گیا تھا۔ واپس آکر کرسی کی پشت پر ہاتھ جمائے۔

"یہ امتحان کوئی مذاق تھوڑی ہے یا وہ امتحان لینے والے اس انتظار میں تھوڑی بیٹھے ہیں کہ میرے پرچا—— دیتے ہی وہ مجھے پاس کر کے کوئی بڑی پوسٹ دے دیں گے۔ بہت تیاری کرنی پڑتی ہے بی بی جان اور مجھے تو اب پڑھنے کی عادت ہی نہیں رہی۔ خاصا مشکل ہے میرے لیے، پر کوئی سمجھے تب نا۔" اس نے بے چارگی سے کہا۔

"تم بس نیت اور کوشش کرو۔ ہم ہیں نا، ہم دعا کریں گے۔" اپنی طرف سے حوصلہ دیتیں، وہ خالی برتن اٹھاتی کچن کی جانب بڑھ گئیں۔

"اب ان سب کی خوش فہمیوں کا کیا کروں میں۔ فیل ہو گیا تو پتا نہیں گھر میں گھسنے کی اجازت بھی ملے گی یا نہیں۔ چل بیٹا ولی! ابھی تو ڈیوٹی دے۔" خود کلامی کرتا سر پر عادتاً الٹی پی کیپ رکھتا، جیکٹ کی جیب سے بائیک کی چابی نکالتا وہ جیسے ہی مڑا، دروازے کے پاس کھڑی ارینا کو دیکھ کر ٹھٹک

Google

گیا۔ اس کے چہرے پر پھیلے خفگی بھرے تاثرات ظاہر کر رہے تھے کہ وہ بہت کچھ سن چکی ہے۔ وہ جھٹکے سے مڑی تو اسے ہوش آیا۔

''اریبنا...... اریبنا! میری بات تو سنو۔'' تیزی سے بھاگتا اس کے پیچھے باہر نکلا مگر وہ رکے بغیر گیٹ عبور کر گئی۔

☆☆☆

اسکرین پر چمکتے ''جے کے'' کو لمحے بھر دیکھتے رہنے کے بعد اس نے کال اٹھالی۔ دوسری طرف موجود شخص شاید کچھ جلدی میں تھا تب ہی اس کے بولنے کا انتظار کیے بغیر شروع ہو گیا۔

''سوری سر! آپ کو ڈسٹرب کیا۔ سارے پیسے میں نے نئے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دیے ہیں۔ فارم ہاؤس میں آپ کی موجودگی کے نشانات بھی مٹا دیے ہیں اور جس نمبر سے میڈم کو فون کیا تھا وہ سم ضائع کر دی گئی ہے۔''

یہ سب سنتی انزا کو اپنی سماعت پر شک گزر رہا تھا۔

''سر...... ہیلو سر! آواز آ رہی ہے؟ سر یہاں سگنلز کا مسئلہ ہے، میں دفتر پہنچ کر آپ کو کال کرتا ہوں۔'' آواز آنا بند ہو گئی تھی مگر اس کے ذہن کی ساری کھڑکیاں گویا کھلتی چلی گئیں اور یہ — آواز بھی تو وہ پہچان گئی تھی۔ وہ فاران کے مینیجر جواد صاحب جو اس سارے کھیل میں شریک تھے۔

جیکٹ کو وہیں صوفے پر پھینکتی ایک بھیگی نگاہ سوئے ہوئے فاران پر ڈالتی وہ موبائل ہاتھ میں دبائے کمرے کی بالکنی میں چلی آئی۔ کمرہ ہیٹنگ سسٹم آن ہونے کی وجہ سے گرم تھا جب کہ یہاں چلتی سرد ہواؤں کے باعث خاصی ٹھنڈ تھی اور اس نے محض شال اوڑھ رکھی تھی جو ناکافی تھی مگر اسے اس وقت پرواہ ہی کب تھی۔ دل و دماغ میں جیسے کوئی جنگ چھڑ گئی تھی۔ دل دماغ کی ہر بات کو رد کیے جا رہا تھا، بھلا اس کا فاران ایسا کیسے کر سکتا تھا۔

''لیکن اس نے ایسا کیا ہے؟'' دماغ نے حقیقت بتائی تو دل تڑپ اٹھا......

''یقیناً وہ مجبور ہو گیا ہو گا تب ہی...... ورنہ وہ ایسا نہیں ہے۔'' دل تاویلیں پیش کرتے نہ تھک رہا تھا۔

☆☆☆

کل سے وہ دہری اذیت کا شکار تھا۔ اریبنا تو اسی دن سے ناراض تھی نہ اس کا فون اٹھاتی نہ میسج کا جواب دیتی اور انکل آنٹی نے رشتے سے بھی صاف انکار کر دیا تھا۔ اسے کسی پل چین نہ آ رہا تھا۔

''اگر اب بھی تم نے میری بات نہ سنی تو میں آ رہا ہوں تمہارے گھر۔'' یہ آخری میسج ولی نے بھیجا تھا جس کے بعد وہ ملنے پر راضی ہوئی تھی۔ اس کے گیٹ کے باہر ٹہلتا وہ شدت سے اس کا منتظر تھا۔ گیٹ کھلا تو اریبنا کا چہرہ نظر آیا، آج وہاں ناراضی کے بجائے گہری سنجیدگی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے راستہ دینے پر وہ صحن تک آ گیا۔

''تم انکل سے بات کرو اریبنا! انہیں کہو کہ مجھے تھوڑا سا وقت دیں۔ میں اپنا آپ منوالوں گا بلکہ میں خود بھی ان سے بات کروں گا۔ ہمیں مل کر انہیں سمجھانا ہو گا کہ......''

''میرا رشتہ طے ہو گیا ہے۔'' اس کے یک دم بولنے پر وہ یوں چپ ہوا جیسے اب کبھی نہ بول پائے گا جب کہ وہ سینے کے گرد بازو لپیٹے سنجیدہ سی بولے جا رہی تھی گویا کسی اور کی بات کر رہی ہو۔

''بہت اچھا رشتہ ہے، لڑکا سرکاری نوکری کرتا ہے۔ اچھا کماتا ہے، امی اسے انکار نہیں کرنا چاہتی تھیں۔''

''آنٹی یا تم؟'' وہ سلگ کر بولا۔ اب اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ وہ کیا بات تھی جو بی بی اس سے چھپا رہی تھیں۔

''ہاں میں بھی۔'' وہ ایک دم مشتعل ہوئی۔ ''اور کس بل بوتے پر انکار کرتی۔ تمہیں کب فکر ہے اپنے مستقبل کی۔ تم محض سنہرے خواب دکھا سکتے ہو۔''

''بس اتنا ہی جان پائی ہو مجھے؟ تھوڑا بھروسا تو کرتیں۔ کبھی بھوکا نہ رہنے دیتا تمہیں، اپنے زور بازو پر یقین ہے مجھے۔'' اس کے ٹوٹے بکھرے لہجے

کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہو پا رہا تھا۔
"آٹھ نو ہزار میں زندگی نہیں گزرتی، محض گھسیٹی جاسکتی ہے اور مجھے ایسی زندگی نہیں چاہیے۔"
"اور ہماری محبت، اس کا کیا؟" ولی کے منہ سے پھسلا۔
"آج کی محبت بھی آسائشوں کی محتاج ہوتی ہے ولی کمال! مگر تم یہ سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔" وہ تلخ ہوئی۔
"بہت اچھی طرح سمجھا دیا ہے تم نے۔" وہ استہزائیہ انداز میں مسکرایا تو وہ نظریں پھیر گئی۔ وہ جانے کے لیے مڑ گیا، آنکھوں میں چبھن سی ہو رہی تھی۔ گیٹ تک پہنچ کر رکا اور بغیر مڑے بولا۔
"خدا کرے تمہارے سارے خواب پورے ہوں۔ جہاں رہو خوش رہو۔" سنجیدگی سے کہتا وہ دہلیز پار کر گیا۔

☆☆☆

وہ دبے قدموں اس کے پیچھے آئی تھی۔ اسٹڈی کے ادھ کھلے دروازے سے اندر جھانکا تو وہ ہاتھ میں جیکٹ تھامے اسے الٹ پلٹ کرتا نظر آیا۔ آہستہ قدموں سے چلتی وہ جوں ہی اسٹڈی میں داخل ہوئی فاران نے مڑ کر دیکھا۔ وہ یوں ہی چوکنا رہتا تھا۔ اپنے قریب کسی بھی شے کی موجودگی کو فوراً بھانپ جاتا۔
"کچھ ڈھونڈ رہے ہیں؟"
"ہوں، مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے کوئی چیز تھی میری جیکٹ میں۔" وہ پرسوچ انداز میں بولا۔
"کہیں وہ چیز یہ تو نہیں؟" اس نے اپنی ہتھیلی یک دم اس کے سامنے پھیلائی جس پر موبائل دھرا تھا۔ لمحے بھر کے لیے اس کے تاثرات بدلے پھر وہ سنبھل گیا اور اس کی تو جیسے ہمت ختم ہو گئی تھی، وہ بولی تو لہجہ بھیگا ہوا تھا۔
"کیوں کیا فاران آپ نے ایسا؟ پیسوں کی ضرورت تھی تو مجھے کہتے۔ میں خود پاپا سے بات کرتی۔ اس کے لیے آپ کو میرے جذبات سے کھیلنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"ویری اسمارٹ۔ تم نے تو خود ہی ساری کہانی بنا ڈالی لیکن میری جان یہ گیم اتنی سیدھی نہیں ہے۔" وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا تو وہ ٹھٹک گئی۔
"گیم......؟"
"ہاں گیم۔" اس نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے موبائل اٹھا کر قریبی میز پر رکھا اور پوری توجہ سے اسے دیکھا۔ کچھ تھا اس کی آنکھوں میں جو پہلے کبھی نظر نہیں آیا تھا۔
"میں چاہوں تو تمہاری اسی کہانی کو آگے بڑھا سکتا ہوں۔ تم تو میری بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لو گی پر میں ایسا نہیں کروں گا۔ اب ڈائریکٹ آخری پلان پر جاؤں گا۔"
"یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں، مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" اس کا یہ عجیب سا روپ اسے ڈرا رہا تھا۔
"سچ سننے کی ہمت ہے۔" اس نے آگے کو جھک کر اس کی کھلی حیران آنکھوں میں جھانکا۔
"تو سنو انزا دلاور! مجھے تمہاری خواہش نہیں بلکہ تمہارے باپ سے دشمنی تم تک لائی تھی۔ دلاور جہانگیر نے میرے باپ کو قتل کیا تھا۔" اس کے آس پاس گویا دھماکے سے ہو رہے تھے۔
"برسوں انتقام کی اس آگ کو پالا ہے میں نے، پر اب اس کے ٹھنڈا ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ دلاور جہانگیر کو اب ہر اذیت کا حساب دینا ہو گا۔" پتھریلے لہجے میں بولتا وہ اسے بہت اجنبی لگا تھا۔ کاش یہ کوئی خواب ہو جو آنکھ کھلنے پر ٹوٹ جائے، اس لمحے انزا دلاور نے شدت سے خواہش کی تھی۔
"اور ہم...... ہماری...... م...... محبت......" لفظ ٹوٹ کر اس کے لبوں سے ادا ہوئے تھے، جیسے کوئی ڈوبنے والا ابھرنے کی آخری خواہش کرے۔
"ہاہاہا......" فاران کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ "تمہیں کیا لگتا ہے، باپ کے قاتل کی بیٹی سے فاران سکندر محبت کر سکتا ہے؟" اس کا استہزائیہ انداز اس کے دل کو چھلنی کر گیا۔ وہ بے پناہ محبت، وہ

التفات جس کا اظہار وہ برملا کیا کرتا تھا، وہ سب جھوٹ تھا۔ انزا دلاور کو لگا جیسے وہ کسی گہری کھائی میں گرتی چلی جارہی ہو۔

''ایک سال تک تمہیں دھوکے میں اس لیے رکھا کہ تم وہ قیمتی شے تھیں جس سے دلاور جہانگیر ٹوٹ کر محبت کرتا ہے۔ جس کی ذرا سی تکلیف پر اس کی جان نکل جاتی ہے۔ یہ پیسے ویسے کا نقصان زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ آج جو قرضہ تمہارے باپ نے لیا ہے وہ کل کو اتار بھی دے گا، مگر اولاد کا نقصان وہ برداشت نہیں کر سکے گا۔'' سفاک لہجے میں بولتے فاران کی آنکھوں میں گویا خون اتر آیا تھا۔ انزا دو قدم پیچھے ہوئی، خوف سے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہوئی تھی۔

''آپ کیا کرنا چاہتے ہیں فاران؟ میں...... میں نے آپ سے محبت کی ہے۔ مجھے سزا مت دیں۔''

''تم بہت اچھی ہو ڈیئر، پر میں اتنا اچھا نہیں ہوں۔ اپنے اندر جلتے الاؤ کو ٹھنڈا کیے بغیر مجھے چین نہیں آئے گا۔'' یک دم اس نے مڑ کر میز کی دراز سے کچھ نکالا، اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا چھوٹا سا پستول دیکھ کر اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہوگئے۔ پیچھے ہٹنے کی خواہش میں وہ کسی چیز سے ٹکرا کر نیچے گری۔

''پلیز ایسے مت کریں، میں نے کچھ نہیں کیا۔ مجھے سزا مت دیں، پلیز۔'' اپنی طرف بڑھتے فاران کو دیکھ کر اس نے منت کی تھی۔ آنسو بھل بھل آنکھوں سے بہہ رہے تھے اور وہ خود میں اتنی ہمت نہیں پارہی تھی کہ اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کرتی۔

''سزا تو تمہارے باپ کو ملے گی، جب اس کو یہ پتا چلے گا کہ اس کی عزیز از جان بیٹی لاپتا ہے۔'' وہ پنجوں کے بل اس کے پاس بیٹھا۔ ''کیونکہ کھو جانے کی اذیت کسی کے مرنے سے زیادہ ہوتی ہے۔'' سفاکی سے کہتے اس نے گولیاں چیک کی تھیں، پھر وہ سیدھا کھڑا ہوا۔

''پلیز ایسا مت کریں۔ خدا کے لیے مت کریں۔'' لرزتی آواز میں التجا کرتی وہ ہاتھوں کے سہارے زمین پر پیچھے کو کھسکی تھی۔ مگر اسے اس لڑکی پر رحم نہیں آیا تھا۔ وہ دلاور جہانگیر کی بیٹی تھی جسے دیکھ کر اسے رحم نہیں آسکتا تھا۔ پستول اس پر تانے، اس نے دو گولیاں اس کے جسم میں اتار دی تھیں۔ اگرچہ ایک لمحے کے لیے اس کا ہاتھ لرز گیا تھا اور اس کی آخری چیخ کے ساتھ اس کی آواز بھی بند ہوگئی تھی۔ اس پر ایک نظر ڈالتے اس نے اپنی پیشانی پر آئے پسینے کی بوندیں شرٹ کے بازو سے صاف کی تھیں۔ چہرہ خطرناک حد تک سرخ ہو چکا تھا۔ وہ تیزی سے دروازے کی جانب بڑھا، ابھی بہت سے کام کرنے باقی تھے۔

☆☆☆

''چچ چچ، ناکام عاشقوں والی صورت۔'' مراد کے مصنوعی اظہار افسوس پر وہ چڑا تھا۔

''اس وقت مجھے تیری کوئی چیپ بات نہیں سننی۔''

''نہ پھر تو مجھے ساتھ لایا کس لیے ہے۔ یہ غم خاموشی سے منانے کے لیے یا سڑکیں ناپنے کے لیے۔'' مراد تپ کر بولا۔ ولی کی آج چھٹی تھی اور شام ہی سے وہ اسے ساتھ لیے سڑکوں پر مارا مارا پھر رہا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اپنا غم غلط کررہا تھا۔

''کوئی اچھی بات کرسکتا ہے تو کر ورنہ اپنا منہ بند رکھ۔''

''میری بات سن، تو اگر ساری رات بھی چکر لگاتا رہا تب بھی حقیقت نہیں بدلے گی۔ وہ چلی گئی ہے۔ اس بات کو تسلیم کرلے۔'' مراد نے سنجیدگی سے کہا، اتنی دیر سے وہ اس نقطے پر بات کرنے سے پہلو تہی کررہا تھا اب جیسے تھک کر رک گیا۔

''کیسے کرلوں۔'' دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں ڈالے وہ افسردہ سا بولا۔

''بھئی جیسے اس نے کرلیا ہے۔ وہ بھی تو کسی سے شادی کررہی ہے نا۔''

Digitized by Google

''وہ کر سکتی ہے۔اس نے شاید سوچ سمجھ کر محبت کی ہوگی پر میرے من میں تو کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ میں نے تو صرف اسی کی چاہ کی تھی۔'' نگاہیں تاروں بھرے آسمان پر ٹھہر گئیں۔

''اس وقت تو تو مجھے افسانوی کردار لگ رہا ہے۔ خالص محبت کرنے والا ہیرو۔'' مراد کے کہنے پر اس نے ہاتھ جوڑے۔

''بس آج تیری کوئی کہانی نہیں سنوں گا۔''

''ہاں مجھے بھی تیرے اوپر اپنے قیمتی الفاظ ضائع نہیں کرنے۔'' مراد نے منہ بنایا۔ پھر اطراف میں نظر ڈالی، وہ خاصے دور نکل آئے تھے۔

''بہت ہی کوئی ویران جگہ ہے۔ چل نکلتے ہیں اس سے پہلے کوئی لیٹرا ہی دھر لے۔''

''ملنا اسے کچھ بھی نہیں ہے۔'' ولی کے اطمینان پر مراد نے اسے گھورا۔

''تیری نہیں تو میری جان تو قیمتی ہے نا۔''

''جی بالکل۔ اریبلا مراد صاحبہ کی جان نہایت قیمتی ہے۔'' اس کا مذاق اڑاتے ولی نے قدم بڑھائے۔ وہ بھی ہنس دیا۔ دونوں کچھ قدم ہی اٹھا پائے تھے کہ یک دم پیچھے سے کسی گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس ان پر پڑیں۔ وہ بے اختیار مڑے۔ گاڑی کے اندر سے کچھ پھینکا گیا اور پھر گاڑی تیزی سے ان کے پاس سے گزرتی چلی گئی۔ ولی کی نگاہیں واپس پلٹیں جہاں گاڑی والے نے کچھ پھینکا تھا۔ وہاں کسی چیز کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی وہ بے اختیار آگے بڑھا تھا۔

☆☆☆

آج اسے اپنے مالک سے اپنی وفاداری کا ثبوت دینا تھا جس نے اسے اور اس کے پورے خاندان کو قرضے کی دلدل سے نکال کر گویا خرید ہی لیا تھا۔ باوجود اس کے ایک انسانی وجود کو اس حالت میں گاڑی میں ڈالتے وہ عرق ندامت سے پورا پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ اس کے مالک نے اپنی بیوی کا قتل کر دیا تھا اور یہ بات اس کے لیے حیران کن تھی۔

اب اسے دفنانے کی غرض سے وہ آندھی طوفان کی طرح گاڑی دوڑاتا ایک سنسان جگہ تک پہنچا تھا۔

موسم سرما کی شدید ٹھنڈ کے باوجود اس کی جانب ہاتھ بڑھاتے اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ اس کا خون بہہ رہا تھا جو اس کے اپنے ہاتھوں اور کپڑوں پر بھی لگ چکا تھا۔ اسے تھامتے یک دم جیسے زندگی کا احساس ہوا۔ اس نے بے اختیار جھک کر اس کے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی جو مدھم رفتار سے چل رہی تھی۔ اس کا دل کانپ اٹھا، ایک زندہ جان کو وہ کیسے قبر میں اتار سکتا تھا۔ وہ بھی وہ معصوم لڑکی جس کا سلوک ہمیشہ تمام ملازمین سے اچھا رہا تھا۔ وہ کیسے اسے مرنے کے لیے چھوڑ سکتا تھا۔ اس کا ضمیر ملامت کرنے لگا تو وہ مزید پریشان ہوا تھا۔ بھلا وہ اس کے لیے کیا کر سکتا تھا۔ اسی وقت اس ویرانے میں اسے ہنسنے کی آواز آئی تو اس نے مڑ کر ان لڑکوں کو دیکھا اور لمحوں میں فیصلہ ہو گیا۔ وہ کم از کم کوشش تو کر سکتا تھا۔ آگے اس لڑکی کی قسمت، جلدی سے اسے گاڑی سے اتار کر زمین پر لٹا دیا۔ پھر گاڑی میں سوار ہوتے ان دونوں پر ہیڈ لائٹس ڈالیں۔ ان کے متوجہ ہوتے ہی گاڑی میں رکھی بوتل اٹھا کر عین اس کے قریب پھینکی اور گاڑی دوڑا لے گیا۔

☆☆☆

''ولی! کہاں جا رہے ہو؟'' اسے آگے بڑھتے دیکھ کر مراد نے پکارا۔

''کچھ گڑبڑ ہے، وہاں کچھ ہے۔'' وہ تیزی سے وہاں تک پہنچا اور زمین پر پڑے وجود کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ قریب آتے ہی مراد کی تو سٹی گم ہو گئی۔ ولی جلدی سے جھک کر اس کی نبض ٹٹولنے لگا جو مدھم رفتار سے چل رہی تھی۔

''یہ زندہ ہے۔'' اس کی اطلاع پر مراد نے نفی میں سر ہلایا۔ ''خون بہہ رہا ہے۔ گولیاں سینے میں اتری ہوئی ہیں۔ مجھے تو یہ مری ہوئی لگ رہی ہے۔''

''میں جو کہہ رہا ہوں کہ یہ زندہ ہے۔ ہمیں اسے بچانا ہوگا۔'' ولی کے مضبوط لہجے پر وہ بدکا۔

"اس ویرانے میں ہم اسے کیسے نکالیں گے۔ رہنے دے، اس نے تو بچنا نہیں ہے، ہم الٹا پھنس جائیں گے۔"

"بچانے والی ذات رب کی ہے لیکن ہم کوشش تو کر سکتے ہیں۔ تو اپنے اس کولیگ کو کال ملا جس کے والد اسپتال کی ایمبولینس چلاتے ہیں۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔

"پولیس کیس بنے گا۔" مراد نے موبائل نکالتے مطلع کیا مگر ولی اپنے فیصلے سے ہٹنے والا نہیں تھا۔

ایمبولینس دس منٹ میں پہنچ گئی تھی۔ اس دوران وہ اس کے دل کی دھڑکن مسلسل چیک کرتا رہا تھا جو مدھم ہی سہی پر اس کے اندر زندگی کی لو کو بجھنے نہیں دے رہی تھی۔

ولی نے انہیں قریبی کلینک لے جانے کا کہا تھا۔ ان کے پاس وقت کم تھا۔ قریب میں ایک مشہور سرجن کا کلینک تھا جہاں وہ اسے لے گئے تھے۔ صد شکر کہ سرجن موجود تھا مگر وہ اتنا سیریس کیس لینے کو تیار نہیں تھا۔ لیکن خوش قسمتی سے ڈاکٹر سے مراد کی رشتہ داری نکل آئی تو وہ اسے راضی کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ گولیاں آسانی سے نکل گئی تھیں لیکن خون زیادہ بہہ جانے کے سبب وہ بے ہوش تھی۔ اس عرصے میں بی بی جان کی تین بار کال آ چکی تھی پر وہ یہاں سے نکل نہیں سکتے تھے۔

"میں تو کہتا ہوں یہاں سے بھاگ چلتے ہیں۔" مراد نے قریب آ کر سرگوشی کی۔

"وہ جو گارڈ ہم پر نظر رکھنے کے لیے بٹھایا گیا ہے، وہ ہمیں بھاگنے نہیں دے گا۔" ولی نے خطرناک تیوروں والے گارڈ پر نگاہ ڈالی جو اپنی بندوق پکڑے چوکس کھڑا تھا۔

"رشوت کے نام پر تو نے جن پیسوں کا وعدہ کیا ہے ناں جب اسے نہیں ملیں گے تو ہم دونوں حوالات میں بیٹھے ہوں گے۔"

"تو ٹینشن نہ لے، لڑکی بچ جائے گی تو وہ اپنا بیان خود دے دے گی۔" ولی نے اسے تسلی دی ورنہ دھڑکا تو اسے بھی لگا ہوا تھا۔

"اور نہ بچی تو......" مراد نے سنجیدگی سے اسے دیکھا تو وہ نظریں پھیر گیا۔ اس سوال کا جواب ابھی اس کے پاس نہیں تھا۔

☆☆☆

صبح کی روشنی پھیلنی شروع ہو چکی تھی اور وہ دونوں ابھی تک راہ داری میں کھڑے تھے۔ اس لڑکی کا آپریشن ہو چکا تھا مگر اسے ہوش نہیں آیا تھا۔

"ڈاکٹر پیسوں کا کہہ کر گیا ہے۔ اب بتا کیا کریں۔ کہاں سے لائیں گے ستر ہزار۔" مراد نے طنزیہ انداز میں اسے دیکھا۔

"پھر تو میرا خیال ہے یہاں سے بھاگ ہی لیتے ہیں۔" ولی نے پیشانی مسلی۔ مراد نے کچا چبا جانے والے انداز میں اسے گھورا۔

"تو ایسا کر اب خود ہی پولیس کو فون کر دے۔" اس سے پہلے وہ کچھ کہتا نرس قریب آئی۔

"آپ کے پیشنٹ کو ہوش آ گیا ہے۔" دونوں نے سر ہلاتے ہوئے کمرے کا رخ کیا۔

وہ چت لیٹی چھت کو گھور رہی تھی جب وہ اندر داخل ہوئے۔ ولی اسے متوجہ کرنے کے لیے کھنکھارا۔ اس کی آنکھیں ان کی جانب گھومیں تو ولی نے بات شروع کی۔

"السلام وعلیکم! شکر ہے آپ کو ہوش آ گیا ورنہ آپ کی حالت......"

"آپ کون ہیں؟" وہ بیچ میں بول پڑی۔

"ہم نے ہی تو کل رات آپ کو سنسان سڑک پر پڑا دیکھا تو یہاں لے آئے۔ آپ کا بچ جانا کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔" مراد نے وضاحت کی۔ جواب میں اسے خاموش دیکھ کر ولی مزید بولا۔

"آپ اپنے گھر والوں کا بتایئے ہم ان سے رابطہ کرتے ہیں۔ کہیں آپ کے دشمن یہاں تک نہ پہنچ جائیں۔"

"مگر مجھے تو کچھ یاد نہیں آ رہا۔" عجیب سپاٹ

Digitized by Google

سا انداز تھا۔ دونوں نے سٹپٹا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر مراد نے اس لڑکی کو دیکھا جو خاموشی سے خلا میں دیکھ رہی تھی۔

"میرا خیال ہے آپ کو ہمیں دیکھ کر یوں لگ رہا ہے ورنہ گولیاں لگنے سے انسان کی یادداشت جاتی نہیں۔"

"معلوم نہیں پر مجھے کچھ یاد نہیں۔"

"یہ کیا فلمی سچویشن ہے یار۔ اس کے دماغ پر اثر کیسے ہوسکتا ہے یا پھر یہ پہلے سے ہی کسی نفسیاتی مسئلے کا شکار ہوگی۔" مراد سرگوشی میں بولا۔ نرس کو اندر آتے دیکھ کر مراد خاموش ہوگیا۔

"سسٹر یہ کہہ رہی ہیں کہ ان کو کچھ یاد نہیں۔ مگر گولیاں تو ان کے سینے میں لگی تھیں؟" ولی کے پوچھنے پر وہ مڑی۔

"بظاہر تو ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ان کے سر کے پیچھے گہری چوٹ لگی ہے۔ ہوسکتا ہے حادثے کی وجہ سے ان کی دماغی حالت متاثر ہوئی ہو۔"

نرس کے باہر جاتے ہی مراد اس پر الٹ پڑا۔

"اب کیا ہوگا اس کی یادداشت واپس نہ آئی تو ہم کیا کریں گے اور وہ ستر ہزار جو اس لالچی ڈاکٹر کو نہ ملے تو وہ فوراً پولیس بلالے گا۔" لڑکی کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ نیند میں تھی۔

"ٹینشن نہ دے کچھ سوچنے دے۔ میرے پاس ابھی صرف دو ہزار ہیں۔"

"اور میرے پاس ایک بھی نہیں ہے۔" مراد نے اپنی جیب ٹٹولی۔ اسی وقت ڈاکٹر اندر آیا تھا۔

"ریسپشن پر پیسے جمع کروا کر آپ لوگ یہاں سے جاسکتے ہیں۔"

دونوں گڑبڑا گئے۔ بھلا اتنے پیسے کہاں سے لاتے۔ اسی وقت اس لڑکی نے آنکھیں کھولیں۔ بامشکل ہاتھوں کا سہارا لے کر وہ اٹھ پائی۔

"ڈاکٹر آپ یہ رکھ لیں۔" اس نے نرس کے دیے سامان میں سے اپنا بریسلیٹ اور انگوٹھی اٹھا کر ڈاکٹر کی جانب بڑھائی۔

"ارے، یہ آپ کیا کررہی ہیں۔" ولی نے شرمندگی سے اسے دیکھا، یہی حال مراد کا تھا۔ یقیناً وہ ان کی باتیں سن چکی تھی۔

"بی بی! ان کا میں کیا کروں گا اور بھلا ان سے کیا بنے گا۔" ڈاکٹر کو شاید ہیرے کی پہچان نہیں تھی تبھی بے دلی سے بولا۔

"شاید کچھ بن جائے۔ آپ اپنی تسلی کرلیں۔" اس کے کہنے پر ڈاکٹر دونوں چیزیں لے کر چلا گیا۔

"آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ مجھے کسی دارالامان میں چھوڑ آئیں۔ جب تک میری یادداشت واپس نہیں آجاتی میں وہیں رہ لوں گی۔" سنجیدگی سے کہتی وہ پھر لیٹ گئی۔

"اس زخمی حالت میں ہم اسے کسی دارالامان میں بھلا کیسے جمع کروائیں گے۔" مراد نے سرگوشی کی۔ ولی کچھ دیر لڑکی کو پرسوچ انداز میں دیکھتا رہا۔ پھر یکدم کمرے سے نکلا، مراد اس کے پیچھے لپکا۔

"کہاں جارہے ہو؟"

"گاڑی لینے۔" اس نے سوالیہ نظروں سے ولی کو دیکھا۔

"میں اسے اپنے گھر لے کر جارہا ہوں۔"

مراد نے بے یقینی سے اسے گھورا۔

"تیرا دماغ ٹھیک ہے۔"

☆☆☆

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے۔ ایک لڑکی کو اپنے ساتھ گھر لے آئے ہو۔" جب سے وہ گھر آیا تھا ان کا غصے سے برا حال تھا۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ بیٹے کو جھاڑ کر رکھ دیں۔

"بابا! ساری صورت حال تو آپ کو بتا چکا ہوں۔ اب ایسے میں، اسے وہاں اکیلا چھوڑ کر کیسے آجاتا۔ وہ زخمی ہے اور باہر نہ جانے اس کے کتنے دشمن گھات لگائے بیٹھے ہوں۔" ولی نے بی بی جان کو بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا کہ وہ کچھ بولیں۔

"ولی! ٹھیک کہہ رہا ہے کمال۔ وہ بچی زخمی ہے۔ ایسے میں ہم اسے کچھ دنوں کے لیے پناہ دے

دیں تو کیا برائی ہے۔" ان کی طرف داری پر وہ کچھ نہ بولے، چہرے پر گہری سوچ کی پرچھائی پھیل گئی۔ پھر وہ فیصلہ کن انداز میں بولے۔

"اس صورت حال کا ایک ہی حل ہے۔" ولی اور بی بی جان کے چہروں پر اطمینان اترا۔ آخر وہ مانے تو۔

"ولی کو اس لڑکی سے نکاح کرنا ہوگا۔" ان کی اگلی بات پر ولی اپنی جگہ سے یوں اچھلا گویا بجلی کی تار چھو گئی ہو۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ میں اس سے نکاح نہیں کر سکتا۔"

"تو بیٹا جی یہ ایک لڑکی کو گھر لانے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ ہم مردوں کے گھر میں ایک جوان لڑکی کے رہنے کا اور کوئی جواز نہیں بنتا اور پھر شریعت میں عورت کو پناہ دینے کی یہی ایک صورت ہے۔" ان کی سنجیدگی پر اس کا سانس حلق میں اٹک گیا۔ وہ کسی صورت یہ نکاح نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"بات تو تمہاری سو فیصد ٹھیک ہے۔" بی بی جان کی حمایت پر اس نے انہیں شکایتی انداز میں گھورا مگر وہ متوجہ ہی کب تھیں۔

"پر یہ فیصلہ قبل از وقت ہے۔ اس بچی کی یادداشت جب تک واپس نہیں آجاتی ہم یہ قدم نہیں اٹھا سکتے۔ اگر وہ شادی شدہ نکلی پھر......" ان کی اس بات پر ولی کا سانس بحال ہوا اور دل بی بی جان کے ہاتھ چوم لینے کو کر رہا تھا جنہوں نے اتنا اہم نکتہ اٹھایا تھا۔

کمال صاحب نے بھی پہلو بدلا۔

"بی بی جان ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مجھے تو اعتراض نہیں ہے بعد میں مسئلہ ہو جائے گا اگر وہ نکاح شدہ یا منگنی شدہ نکلی۔" اس نے بھی فوراً نمبر بنانے کی کوشش کی۔

کمال صاحب نے ہنکارا بھرا۔

"خیر منگنی ونگنی کا تو مسئلہ نہیں ہے پر شادی شدہ ہوئی تو ظاہر ہے مسئلہ ہو جائے گا۔ ٹھیک ہے پھر وہ یہاں رہے گی تم اپنا سامان اٹھاؤ اور مراد کے ساتھ شفٹ ہو جاؤ۔" مراد کے گھر والے مہینے بھر کے لیے گاؤں گئے ہوئے تھے۔

"میں کیوں جاؤں، یہ میرا بھی گھر ہے۔" اس نئے فیصلے پر وہ تلملایا۔

"جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہو جاتا یہی بہتر ہے۔ اب تم اس لڑکی کو لے ہی آئے ہو تو ہم اسے سڑک پر تو نہیں پھینک سکتے نا۔" ان کے طنزیہ انداز پر وہ چپکا ہوا اور بی بی جان کو اشارہ کیا۔

"ولی کو مراد کے گھر بھیجنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو رات بھر ڈیوٹی پر ہوتا ہے صبح آکر سو جاتا ہے۔ وہاں سے خوامخواہ بچے کو دو گھنٹے کی مزید خواری کرنی پڑے گی اور پھر میں ہوں نا۔ بچی میرے کمرے میں میرے ساتھ ہی رہے گی۔" بی بی جان کے کہنے پر کمال صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اچھا ٹھیک ہے، آپ اس کی ذمہ داری لے رہی ہیں تو میں کیا کہوں۔ میرے لیے ڈرائنگ روم میں بستر لگا دیں۔ میں کچھ عرصہ وہاں پر گزارا کرلوں گا۔" اخبار تہہ کرتے وہ اٹھ گئے تو ولی نے شکر کا کلمہ پڑھا۔

☆☆☆

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی، لحاف ہاتھ سے پیچھے دھکیلا۔ شدید ٹھنڈ میں بھی اس کا پورا بدن پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بالوں میں پھنسائے، سر تھام کر اس نے خود کو پرسکون کیا اور یہ یقین دلایا کہ وہ محض ایک خواب تھا۔ اب تو زندگی بھی ایک خواب بن گئی تھی جس کی بھیانک تعبیر نے اسے کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ بس دل چاہتا تھا کہ کہیں بھاگ جائے، کسی ایسی جگہ جہاں اسے وہ صورتیں نظر نہ آئیں جنہیں دیکھ کر کبھی وہ جیا کرتی تھی۔ بنیادی طور پر وہ ابھی تک صدمے کی کیفیت سے نکل نہیں پائی تھی۔ وہ شخص جس سے اس نے محبت کی، اس کا اصل روپ اتنا بھیانک تھا کہ انزا دلاور کا ہر رشتے سے اعتبار اٹھ گیا تھا۔ کتنے

Digitized by Google

آرام سے وہ دھوکا کھاتی آئی تھی۔ کتنی بے وقوف تھی جو محبت کی پٹی آنکھوں پر باندھے اپنے قریب سلگتی انتقام کی آگ کو محسوس ہی نہ کر سکی۔

دلاور جہانگیر اس کا باپ جس کے ہوتے ہوئے وہ آج دوسروں کے در پر پڑی تھی۔ وہ ایک قاتل تھا اور باپ کے اس روپ کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اسی لیے اب وہ ان کے پاس بھی نہیں جانا چاہتی تھی۔ سر جھٹک کر اس نے سوچوں کے بھنور سے نکلنے کی کوشش کی تو نگاہیں بھٹک کر خود سے کچھ فاصلے پر لیٹی خاتون پر ٹک گئیں۔ وہ مہربان خاتون کل سے اس کا بہت خیال رکھ رہی تھیں مگر وہ چونکہ اپنوں سے چوٹ کھائی ہوئی تھی اس لیے کسی پر اعتبار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے اپنے زخم ٹھیک ہونے تک کا وقت چاہیے تھا اور کچھ اس کیفیت سے نکلنے کا بھی تاکہ وہ کچھ سوچ سکے۔ یادداشت کا تو محض بہانا تھا، وہ اپنی زندگی کے متعلق کسی کو کچھ نہیں بتانا چاہتی تھی۔

☆☆☆

جرابیں ہاتھ میں تھامے وہ عجلت میں کمرے سے نکلا۔ نظریں بھٹک کر ٹی وی سے ہوتی اس لڑکی پر جا ٹھہریں جو دونوں ٹانگیں اوپر کیے صوفے پر بیٹھے بظاہر ٹی وی دیکھ رہی تھی مگر حقیقتاً نگاہیں کسی غیر مرئی نقطے پر ٹکی تھیں۔ عجب گم صم سا انداز تھا۔ اس کی موجودگی کو بھی وہ محسوس نہ کر سکی۔ جلدی جلدی جرابیں، جوتے پیروں میں اڑستے وہ بی بی جان کے پیچھے کچن میں گھسا۔

"جلدی کریں بی بی جان! میں لیٹ ہو جاؤں گا۔"

اس کی آواز پر توے پر روٹی ڈالتی بی بی جان پلٹیں۔

"بیٹا! تمہارا تو روز یہی حال ہے۔ وقت پر کیوں نہیں تیار ہو جاتے۔"

"اچھا نا بی بی جان! کل سے ہو جاؤں گا۔ ابھی تو کھانا دے دیں۔" وہ بچوں کی طرح انہیں بہلا رہا تھا۔ آج وہ دوپہر میں اٹھ کر کسی کام کی وجہ سے باہر چلا گیا تھا اسی لیے واپس آتے آتے ڈیوٹی کا ٹائم ہو گیا تھا۔

"بس لا رہی ہوں۔ اس بچی کو بھی کچھ دیتی ہوں، ٹھیک طرح سے کچھ کھا نہیں رہی۔" وہ فکر مندی سے بولیں۔ ولی نے ایک نظر اس پر ڈالی جو ہنوز اسی کیفیت میں بیٹھی تھی۔

"اسے کچھ یاد آیا؟"

"نہیں، اسے تو نام تک یاد نہیں اپنا۔ میں نے تو اس کا نام تانیہ رکھ دیا ہے۔ مخاطب کرنے کے لیے نام ہی تو درکار ہوتا ہے۔" اسے جواب دیتیں وہ ساتھ ساتھ روٹی پکا رہی تھیں۔

"بابا کہاں ہیں؟" کچھ خیال آیا تو ولی نے پوچھا۔

"کہاں ہونا ہے۔ ڈرائنگ روم میں ہی سارا وقت گزار دیتا ہے۔ چائے دے کر آئی تھی تو اخبار کھولے بیٹھا تھا۔ تم جا کر مل آؤ۔"

ولی سر ہلاتا کچن سے نکلا۔ جوں ہی وہ اس کے قریب سے گزرنے لگا اسی وقت وہ صوفے سے اٹھی تو گود میں رکھا کشن گر پڑا۔ ولی نے اسے سلام کرتے ہوئے کشن نیچے سے اٹھایا۔ اس نے محض سر کی جنبش سے جواب دیا۔ وہ ڈھیلے ڈھالے شلوار قمیص میں ملبوس تھی۔ دوپٹہ ایک کندھے پر جھول رہا تھا اور بالوں کو کیچر میں باندھ رکھا تھا۔ یکدم اس پر سے ہوتی نظر میز پر پڑی تو ہاتھ بڑھا کر کارڈ اٹھالیا۔ اس دوران وہ آگے بڑھ گئی۔

کارڈ پر لکھے ارمینا کے نام کو دیکھا تو جیسے ساکت ہو گیا تھا۔ یہ کب سوچا تھا اس نے کہ وہ کسی اور سے منسوب ہو جائے گی اور وہ بے بسی سے ایسا ہوتا دیکھے گا۔ کھانے کی ٹرے لاتی بی بی جان نے اس کے ہاتھ میں کارڈ دیکھا تو بوکھلا گئیں۔ وہ کارڈ اٹھانا بھول گئی تھیں۔ انہیں افسوس ہوا۔

"آجاؤ، کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔" وہ معمول کے انداز میں بولیں۔ ولی نے چونک کر ان کو دیکھا تو

by Google

وہ نظریں چرا گئیں۔

"اب بھوک نہیں رہی بی بی جان! دیر ہو رہی ہے۔ چلتا ہوں۔" بائیک کی چابیاں اٹھاتا وہ تیزی سے باہر نکل گیا جبکہ وہ ـــــ دروازے کی جانب لپکیں۔ اسے پکارا بھی مگر وہ بائیک اڑاتا غائب ہو گیا۔ کچن کے دروازے میں ایستادہ اس نے بی بی جان کو دیکھا جو ہاتھ کی انگلیوں سے آنکھوں میں آئی نمی صاف کرتی اندر آ رہی تھیں۔

☆☆☆

"کیا ہوا آپا! طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟" انہیں خاموش دیکھ کر کمال صاحب فکرمندی سے بولے۔

"ولی کی وجہ سے پریشان ہوں۔ ارمینا کی شادی کی خبر سن کر کیسے چپ ہو گیا ہے میرا بچہ۔" اس کے بھوکا چلے جانے کا ذکر وہ گول کر گئی تھیں۔

انہوں نے گہرا سانس لیا۔ "اس کا حل ہے میرے پاس، کچھ دنوں کے لیے مری چلتے ہیں۔ وہاں گھر کی حالت بھی جا کر دیکھنی ہے۔ اچھا ہے کام وام کروا لیں گے۔ اس عرصے میں شادی بھی گزر جائے گی۔" ابھی حال میں ہی انہیں گھر کا قبضہ ملا تھا۔ وہ کیس جیت گئے تھے۔

"پروگرام تو اچھا ہے پر تم دونوں کی نوکریوں کا کیا بنے گا۔" بی بی جان کو خیال آیا۔

"میں کچھ دنوں کی چھٹی لے لوں گا اور ولی سے کہوں گا اپنے ساتھی لڑکے سے ڈیوٹی کرنے کی بات کر لے وہ، جس کی بیماری پر ولی اس کی ڈیوٹی بھی دیتا رہا تھا۔ تھوڑے سے دنوں کی بات ہے وہ بچہ مان جائے گا۔" انہوں نے پروگرام ترتیب دیا جس پر بی بی جان بھی متفق ہو گئیں۔

"اس بچی کا کیا حال ہے؟" کمال صاحب نے خیال آنے پر پوچھا۔

"کافی بہتر ہے۔ زخم تو کافی حد تک مندمل ہو چکے ہیں۔ کل پھر لے چلیں گے اسے ڈاکٹر کے پاس۔"

"چلیں ٹھیک ہے آپا! اسے بھی بتا دیجیے گا جانے کا۔ اچھا ہے ماحول کی تبدیلی اس کی طبیعت پر اچھا اثر ڈالے گی۔"

"ہوں، یوں بھی وہ ہر وقت گم صم اور پریشان سی رہتی ہے۔" طویل سانس لیتی وہ اٹھ گئیں تو کمال صاحب بھی اخبار کی جانب متوجہ ہو گئے۔

☆☆☆

مری جانے کا سن کر وہ فوراً مان گیا تھا۔ وہ خود بھی ان دنوں یہاں سے نکلنا چاہتا تھا اور پھر فرار کا اس سے اچھا راستہ کیا ہو سکتا تھا۔

فرار ہی شاید وہ واحد حل تھا جس کے بل بوتے پر انزا بھی اپنی زندگی کے اس بھیانک سچ سے چھٹکارا پا سکتی تھی اور اسی غرض سے وہ ان اجنبی لوگوں کے ساتھ چل پڑی تھی۔

مری کا سفر ولی کے لیے اتنا بھی اجنبی نہیں تھا۔ بچپن میں وہ اکثر اپنے آبائی گھر جایا کرتے تھے جب دادا دادی وہاں رہا کرتے تھے۔ ہر سال وہ لمبی چھٹیوں کا انتظار کیا کرتا تھا تاکہ زیادہ دن مری میں گزار سکے۔ کچھ دادا دادی کی محبت بھی اسے مجبور کیا کرتی اور کچھ مری کے خوب صورت نظارے، وہ پہاڑ جن پر چڑھنے کی خواہش بچپن سے دل میں بستی تھی۔ گو کہ ان دنوں دل پر اداسی کی گرد جمی تھی مگر مری کا راستہ شروع ہوتے ہی وہ یادوں کے تکلیف دہ بھنور سے باہر نکل کر ماحول کی دلکشی کو محسوس کرنے لگا۔

لوگوں سے کھچا کھچ بھری بس میں سفر کرنا اس کے لیے بالکل نیا تجربہ تھا۔ کب سوچا تھا کہ بزنس کلاس میں سفر کرنے والی انزا دلاور ایک عام سی سواری میں عام سے لوگوں کے ساتھ سفر کرے گی۔ اور پھر مری کا راستہ شروع ہوتے ہی منچلوں اور بچوں کی شوخیاں، خوشی سے چمکتے چہرے، مسکراتے لب، وہ حیرانی سے ایک ایک کا چہرہ ٹٹولتی رہی۔ آخر کیا تھا جس پر وہ اتنے خوش تھے۔ نگاہیں کھڑکی سے باہر گئیں تو خوب صورت پہاڑ اور مہکتی ہوا نے اسے بھی

Google

اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ تو دبئی، تھائی لینڈ جیسے ملکوں میں چھٹیاں منانے والی بندی تھی۔ شاپنگ کی دلدادہ، بڑے اور شاہانہ مالز میں پھرنے والی، اسے کبھی پہاڑ وغیرہ دیکھنے کا شوق نہیں ہوا تھا۔ مگر اب یہ نظارے اچھے لگے تو وہ کھڑکی سے سر ٹکائے اپنا جی بہلانے لگی۔

☆☆☆

گیارہ بجے تک وہ مری پہنچ گئے تھے اور باقی کا سارا دن گھر کی صفائی ستھرائی میں گزر گیا تھا۔ بی بی جان کے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ ان کے ساتھ چھوٹے موٹے کام کرواتی رہی تھی۔ اگرچہ پہلے بھی اسے ان کاموں کا تجربہ نہیں رہا تھا مگر ڈسٹنگ وغیرہ کرنا اتنا بھی مشکل نہیں تھا کہ کر ہی نہ پاتی اور پھر فارغ رہ کر اسے کرنا بھی کیا تھا۔

دوپہر کا کھانا کھاتے کھاتے بھی شام ہوگئی تھی اور شام ہوتے ہی خنکی میں اچھا خاصا اضافہ ہوا تھا۔ بجلی اور گیس کے کام بھی وہ کروا چکے تھے اس لیے اب تھکن اتارنے کا ارادہ تھا۔

"میں اب کچھ دیر آرام کروں گا بی بی جان۔ اٹھ کر چائے پیوں گا، پھر جو سامان چاہیے ہو، لسٹ بنا دیجیے گا لے آؤں گا۔ ساتھ میں رات کا کھانا بھی لیتا آؤں گا۔ آپ اب کل ہی کچھ پکایئے گا۔" اس نے جمائی روکتے ہوئے کہا۔ اسے ان کی تھکن کا بھی احساس تھا۔ بی بی جان سر ہلاتی برتن اٹھاتی تانیہ کی مدد کرانے لگیں۔

"ہاں ٹھیک ہے تم جا کر آرام کرو۔ وہ باہر والا جو کوارٹر ہے اس میں اپنا سامان رکھ لو۔" ان کے اطمینان سے کہنے پر ولی کی نیند سے بند ہوتی آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں۔

"کوارٹر میں کیوں؟" بے ساختہ منہ سے پھسلا۔

"کیونکہ وہ الگ تھلگ بنا ہوا ہے اور ایک جوان لڑکی کے ہوتے ہوئے تمہیں وہیں سونا چاہیے۔"

"پر وہاں تو میری قلفی بن جائے گی۔" وہ احتجاجاً بولا۔

"جوان جہان ہو، دو رضائیاں لے جاؤ گزارا اچھا ہو جائے گا۔" پانی کا گلاس بھرتے کمال صاحب نے کمال بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔

"دیکھیں بابا! میں نہایت شریف انسان ہوں۔" اس نے مسکین صورت بنا کر انہیں دیکھا۔

"اطلاع کے لیے شکریہ۔ اب تمہیں آرام کرنا چاہیے۔" وہاں نو لفٹ کا بورڈ آویزاں تھا۔

"اور آپ کا اپنے بارے میں کیا ارادہ ہے۔ چارپائی لگا دوں اپنے ساتھ۔" سرسری انداز میں دریافت کیا گیا۔

"تم فکر نہ کرو، میں یہیں بیٹھک میں سوؤں گا۔"

"ہاں تو میں بھی ساتھ ہی سو جاتا ہوں۔" ان کے گھر کنے پر وہ گڑبڑایا۔

"ٹھیک ہے میں چلتا ہوں پھر۔" خراب موڈ کے ساتھ وہ کوارٹر تک آیا اور وہاں کا منظر دیکھ کر مزید موڈ خراب ہوا۔ اس کی صفائی تو کسی نے کی ہی نہیں تھی۔ نئے سرے سے اس کی صفائی کرتے وہ پورا وقت سلگتا رہا تھا۔ آج تو اسے باپ کے ظالم ہونے کا یقین ہو گیا تھا۔ کچھ دیر میں بی بی جان بھی اس کی مدد کرانے کو آگئیں تو اسے کچھ سہارا ہو گیا۔

☆☆☆

مری کی شدید ٹھنڈ میں کوارٹر میں رات گزارنا اسے کسی امتحان سے کم نہیں لگا تھا۔ چارپائی پر بستر لگائے، اوپر رضائی اوڑھے اس نے سونے کی ناکام کوشش کی۔ غصے میں دوسری رضائی کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔ مگر کچھ دیر میں سردی کی شدت محسوس ہوئی تو جھٹ سے اوپر دوسری رضائی بھی کھینچ لی۔ اگلے دن اس نے اپنا سامان کوارٹر میں ہی سیٹ کر لیا جس پر کمال صاحب خاصے خوش تھے۔

اگلے تین دن وہ ان کے ساتھ زمین کے معاملات کے سلسلے میں دفتروں کے چکر لگاتا رہا۔

Google

ساتھ گھر کے چھوٹے موٹے کام تھے جو کروانے تھے۔ تیسرے دن شام میں انہیں کسی دفتری کام کی وجہ سے واپس جانا پڑ گیا۔ مگر اسے وہ خاص ہدایت کر کے گئے تھے کہ وہ کوارٹر میں ہی قیام کرے اور وہ ان کی اس بے اعتباری پر جز بز ہو کر رہ گیا تھا۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو دس بج رہے تھے۔ گہرے رنگ کی موٹی جرسی پہنتا وہ کوارٹر کے ساتھ بنے باتھ روم میں گھس گیا۔ نا چاہتے ہوئے بھی ٹھنڈے پانی سے منہ دھونا پڑا۔ بھوک کا احساس بھی شدت سے ہو رہا تھا۔ وہ جلدی سے گھر کے مرکزی حصے کی جانب آیا۔ خیال یہی تھا کہ بی بی جان کچن میں ہوں گی مگر اندر جانے والا دروازہ بند تھا۔ دو بار دستک دینے کے بعد اس نے گھوم کر سارے گھر میں جھانکا۔ کچن سمیت سارا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ بی بی جان تو صبح اٹھنے کی عادی تھیں پر یہ ماجرا کیا تھا۔ اس کے کافی دفعہ دستک کے جواب میں کوئی بھی باہر نہ نکلا تو وہ جھنجلا گیا، پریشانی الگ ہو رہی تھی۔

''ایک بس مجھے چوکیدار کی طرح باہر پھینک دیا ہے۔ اب پتا نہیں اندر کیا مسئلہ ہے۔'' غصے میں خود سے بولتا وہ کھڑکی کے قریب گیا۔ اندر جھانکا۔

''پتا نہیں کون سا بدمعاش سمجھ لیا ہے والد گرامی نے جو گھر کے اندر رہا تو فساد کا خدشہ ہے۔'' غصے میں وہ باپ کو اسی طرح کے القابات سے نوازتا رہتا۔ ایک دو آوازیں بی بی جان کو لگانے کے بعد وہ واپس دروازے کے پاس آیا۔ بھوک اور سردی نے الگ بوکھلا رکھا تھا۔ آج تو دھوپ بھی نہیں نکلی تھی۔ یخ بستہ ہوائیں گویا ہڈیوں میں گھس رہی تھیں۔ دروازہ کھٹکھٹاتے غصے میں زور سے مکا دروازے پر مارا جو دروازے پر لگے لوہے پر جا پڑا، بر کیا تھا منہ سے سسکاری نکلی، ہتھیلی الگ سرخ ہو گئی۔ آج تو صحیح معنوں میں دن میں تارے نظر آ گئے تھے۔ خوں خوار نظروں سے دروازے کو گھورا۔ اسی وقت دروازہ کھلا تو تانیہ کی صورت نظر آئی۔ ولی نے فوراً چہرے کے بگڑے زاویے درست کیے۔

''بی بی جان کہاں ہیں؟''

''وہ سو رہی ہیں۔ رات ٹھیک طرح سے سو نہیں پائیں تو صبح میڈیسن لے کر سوئی ہیں۔'' جواب دیتے اس نے اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔

''سوری! میں بھی سو گئی تھی۔ آپ شاید کافی دیر سے کھڑے تھے۔'' اس کے معذرت خواہانہ انداز پر وہ بول اٹھا۔

''نہیں، کوئی بات نہیں۔ میں نے بس ناشتا کرنا تھا۔''

''آپ بیٹھیں میں بناتی ہوں۔'' آج تو وہ بھی خوش اخلاقی کے سارے ریکارڈ توڑنے پر تھی۔ ورنہ تو دیکھ کر مخاطب تک نہیں ہوتی تھی۔

''آملیٹ کے ساتھ بریڈ لے لیں گے؟'' اس نے کچن سے باہر جھانکا تو وہ چونکا۔

''جی وہی دے دیں۔'' دل میں ابھرتی پراٹھے کی خواہش کو دبایا۔ اس وقت تو ناشتا مل جاتا یہی غنیمت تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھا مراد کے میسجز پڑھ رہا تھا جب وہ ناشتے کی ٹرے لیے کچن سے برآمد ہوئی۔ وہ سیدھا ہوا۔ پانی کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں۔

''کچھ چاہیے؟'' وہ سوالیہ انداز میں بولی۔

''میں پانی پی کر آتا ہوں، آپ ناشتا شروع کیجیے۔'' ولی کے کہنے پر اس نے سر ہلایا۔ اس کے کچن سے پانی پی کر آنے تک وہ ناشتا شروع کر چکی تھی۔

پہلا لقمہ منہ میں جاتے ہی مزے دار سا ذائقہ محسوس ہوا۔ مختلف سبزیوں سے بنا ہوا وہ آملیٹ عام آملیٹ کے مقابلے میں زیادہ مزے دار تھا۔ کچھ دیر خاموشی سے ناشتا کرنے کے بعد چائے کے مگ کی جانب ہاتھ بڑھاتے وہ بولا۔

''شکریہ، ناشتا بہت مزے دار تھا۔'' وہ چونکی پھر ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیلی۔

''میں آپ سے کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔''

''کہیے پلیز، کوئی مسئلہ ہے یہاں آپ کو۔'' اس کے کہنے پر وہ نرم لہجے میں بولا۔

Digitized by Google

''نہیں، یہاں سب بہت اچھے ہیں۔ ورنہ آپ لوگوں سے تو میرا کوئی رشتہ بھی نہیں ہے۔ میں بس آپ کو تھینکس کہنا چاہ رہی تھی۔ یہ لفظ اس عمل کے لیے چھوٹا ہے جو آپ نے میری زندگی بچا کر کیا ہے ورنہ آج کل تو اپنے بھی پل بھر میں پرایا کر دیتے ہیں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''آپ کو تھینکس کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر اس دن ہم آپ کو ایسے ہی چھوڑ دیتے تو ہمارا ضمیر ملامت کرتا رہتا اور پھر آپ کی زندگی لکھی تھی الہی لیے خدا نے وسیلہ بنا دیا۔''

''آپ بھی سوچتے ہوں گے کتنی بے مروت لڑکی ہے، ایک شکریہ کا لفظ نہیں بول سکی۔'' وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولی تو اس نے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''چائے بھی بہت اچھی ہے۔'' جلدی سے بات تبدیل کی۔ وہ بھی چائے کے گھونٹ بھرنے لگی۔

☆☆☆

''ظاہر ہے تو مجھے نہیں یاد کرے گا تو کسے کرے گا۔ تیری ساری کہانیاں مجھ غریب کو ہی سننی پڑتی ہیں۔'' کوارٹر کی جانب اٹھتے قدم کچھ سست پڑے۔ نگاہ سامنے سیڑھی پر بیٹھی تانیہ پر پڑیں تو دوسری طرف سے بولتے مراد کی بات سمجھ میں نہ آئی۔

''ہیلو، آواز آرہی ہے۔'' اس کے زور سے بولنے پر اس نے منہ بنا کر موبائل دو سیکنڈز کے لیے کان سے دور کیا۔

''تیری آواز تو بندے کو سات سمندر پار بھی آجائے۔ فون بند کر بعد میں بات کروں گا۔'' اس کی بات سنے بغیر خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔ نگاہیں اس پر ٹھہر گئیں جو گہری افسردگی میں لپٹی محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ سوچ کر وہ اس کی جانب بڑھا۔ اس کے قریب جا کر کھنکھارنے پر وہ چونکی۔

''کیسی ہیں آپ؟ طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟''

''میں ٹھیک ہوں۔''

''اداس لگ رہی ہیں۔'' وہ اس سے فاصلے پر اسی سیڑھی پر بیٹھ گیا جس پر وہ گھٹنے موڑے بازوان کے گرد لپیٹے بیٹھی تھی۔

''نہیں بس پہاڑوں کو دیکھ رہی ہوں۔ شاید پہلے کبھی انہیں یوں دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔'' جانے کیوں اس کی اداس آنکھوں میں کوئی اسرار سا چھپا محسوس ہوتا تھا۔

''ہوں، میں بھی بچپن میں یہی نظارے دیکھنے کے شوق میں مری آیا کرتا تھا۔'' کچھ پل کی خاموشی کے بعد وہ بولا تو انداز سرسری تھا۔

''آپ اپنی یادداشت کو لے کر اداس تو نہیں ہیں۔ کچھ یاد آیا آپ کو؟''

''کبھی کبھی یادیں انسان کو محض تکلیف ہی دیتی ہیں۔'' اس کا لہجہ عجیب سا تھا۔ پھر وہ ہلکا سا مسکرائی۔

''لگتا ہے تنگ آگئے ہیں آپ میری اس کھوئی ہوئی یادداشت کی وجہ سے۔ آپ لوگوں پر اضافی بوجھ جو بن گئی ہوں۔''

''نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ آپ جب تک چاہیں ہمارے ساتھ رہ سکتی ہیں۔ آپ کوئی برا خیال دل میں نہ لائیں۔'' اسے شرمندگی ہوئی، چہرہ سرخ ہوا۔

''سوری شاید میں ہی تلخ ہو گئی تھی۔'' اسے افسوس ہوا۔ ان کے خلوص کی تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی گرویدہ ہو گئی تھی۔ ورنہ جس طرح کے حالات سے وہ گزری تھی ان میں کسی پرائے کی اپنائیت محسوس کرنا بہت مشکل تھا۔

''مشکل حالات میں انسان اکثر تلخ ہو جایا کرتا ہے۔''

''ہاں مگر آپ میں ایسی تلخی نہیں دیکھی میں نے۔'' ولی نے نظریں چرائیں۔

''سوری شاید میں کچھ پرسنل ہو گئی۔''

''کوئی بات نہیں۔ بی بی جان نے بتایا ہو گا۔''

''جب کوئی اپنا دھوکا دیتا ہے تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ اپنی بے وقوفی پر ہنسی آنے لگتی ہے۔ پتا

Digitized by Google

نہیں کیوں ہم لوگوں کے قریب رہتے ہوئے بھی ان کی اصلیت پہچان نہیں پاتے۔" پہاڑوں پر نظر جمائے وہ سنجیدگی سے بولی تھی۔

"میں سمجھتا ہوں جو چھوڑ جائے وہ اپنا نہیں ہوتا بلکہ شاید ہم ہی کسی دھوکے میں ہوتے ہیں جس سے تقدیر ہمیں باہر نکال دیتی ہے۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ بولا تو انداز ہلکا پھلکا تھا۔

"لگتا ہے میں نے آپ کو کچھ زیادہ اداس کر دیا۔ چلیں چھوڑیں ان باتوں کو، مری آکر بندہ اگر گھر میں گھسا رہے تو کیا فائدہ اور مجھے لگتا ہے آپ نے تو مری دیکھا ہی نہیں ہے۔"

ایک بار اس کا دوستوں کے ساتھ پلان بنا تھا مگر وہ کسی وجہ سے کینسل ہو گیا تھا اور پھر کبھی مری آنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

"اٹھیں پھر آج میں آپ کو مال روڈ گھماتا ہوں۔" اس کے کہنے پر وہ بھی اٹھ گئی۔ بی بی جان سن کر خوش ہوئیں پر ساتھ چلنے کو راضی نہ ہوئیں تو وہ شام کو واپس آنے کا بتا کر نکل گئے۔

مال روڈ کی گیلی سڑک پر گھومتے، سویٹر ہاتھوں کی انگلیوں تک پھیلائے۔ سرمئی شال اپنے گرد اچھی طرح لپیٹے اس کا موڈ خاصا خوش گوار ہو گیا تھا۔ کچھ دیر کے لیے جیسے وہ سب فراموش کر گئی تھی۔ ماحول کی شگفتگی گویا اس پر اثر انداز ہو رہی تھی۔

چھوٹی چھوٹی دکانوں پر ہاتھ سے بنی چیزیں، کڑھائی والی شالیں اس کے لیے یہ سب نیا تھا۔ وہ تو بڑے بڑے ڈیزائنرز کی چیزیں استعمال کرنے کی عادی تھی۔ ولی نے اس کی پسندیدگی دیکھتے ہوئے ایک خوب صورت کڑھائی والی شال اور ہاتھ سے بنی ٹوپی لے کر دی تھی۔ جس پر وہ بہت خوش ہوئی۔ وہ ہمیشہ سے ایسی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہو جانے والی۔ اکلوتی اور لاڈلی ہونے کے باوجود وہ بگڑی نہیں تھی اور اس میں زیادہ ہاتھ اس کی ماں کی تربیت کا تھا۔

وہ کالج میں تھی جب اس کی ماں چند دن کی علالت کے باعث زندگی کی بازی ہار گئی تھیں۔ ان کی موت پر نا صرف ان کے سرکل کے لوگ غم زدہ رہے تھے بلکہ گھر کے سارے ملازمین بھی کتنے دن اس نیک فطرت خاتون کی موت کا سوگ مناتے رہے تھے۔

پھر شام ڈھلے تک وہاں پھرتے، کون والی آئس کریم، پکوڑے اور چپس کھاتے، کافی پیتے اور چھرے والی گن سے نشانے لگاتے وہ بہت خوش تھی۔ شاید دونوں ہی اپنی ان بچکانہ حرکتوں سے اپنا دل بہلانے کی کوشش کر رہے تھے جو کافی حد تک بہل بھی گیا تھا۔

☆☆☆

لان سے گزرتا وہ سیڑھیوں کے اسٹیپ پر رکا، کلائی پر بندھی گھڑی پر وقت دیکھا۔ بارہ بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ آگے بڑھ کر کھڑکی سے اندر جھانکا۔ ساری بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ دستک دینے کو بڑھا ہاتھ رک گیا۔ ایک نظر دوسرے ہاتھ میں پکڑے ڈبے پر ڈالی۔ پھر مڑ کر واپس سیڑھیوں کی جانب آیا۔ وہاں پر بیٹھ کر ڈبا کھولا۔ اندر کافی کیک تھا۔ گھٹنے موڑے، بایاں بازو گھٹنے پر رکھے وہ کیک کو دیکھ رہا تھا۔ ایک بار ارمینا بھی اس کی سالگرہ کے دن چاکلیٹ کیک بنا کر لائی تھی۔ جس کو مزے لے لے کر کھاتے ہوئے بھی اس نے بی بی جان کے سامنے اس کیک کا اچھا خاصا مذاق اڑایا تھا کیونکہ اس نے پہلی بار بنایا تھا۔

اور اس نے ناراض ہو کر کہا تھا کہ آئندہ کبھی اس کی سالگرہ کا کیک وہ نہیں بنائے گی۔ اب تو اس کا کہا بھی سچ ہونے جا رہا تھا اور یوں بھی وہ اب کسی اور شخص کی زندگی میں شامل ہو چکی تھی۔ اس نے خود کو سرزنش کرتے اس کے خیال کو جھٹکا۔ وہ اس دن کی نئی یادیں بنانا چاہتا تھا تبھی تو چاکلیٹ کیک کے بجائے کافی کیک لایا تھا۔ کافی جو اسے پسند نہیں تھی۔

گہرا سانس لے کر اس نے اطراف پر ایک نظر ڈالی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ سرد ہوائیں پورے

Digitized by Google

وجود کو گویا چھو رہی تھیں۔ دونوں ہاتھ زور سے آپس میں ملتے اس نے کیک کاٹنے کا ارادہ کیا تو خیال آیا کہ چھری تو وہ بھول ہی گیا تھا۔ اسی وقت دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو وہ چونک کر مڑا۔

''ولی! اتنی ٹھنڈ میں باہر کیا کر رہے ہیں۔'' وہ حیران سی وہیں کھڑی پوچھ رہی تھی۔

''اپنی برتھ ڈے کا کیک کاٹ رہا ہوں۔ آپ بھی آجائیں چھری لے کر۔'' وہ حیران سی آگے آئی۔

''واؤ کافی کیک، یہ تو میرا فیورٹ ہے۔'' وہ کیک دیکھ کر خوش ہوئی۔

''آجائیں پھر، بی بی جان سوگئی ہیں؟'' خیال آنے پر پوچھا۔

''ہاں، وہ کھانے کے بعد نماز پڑھ کر سوگئی تھیں۔''

''چلیں آپ جلدی سے ماچس اور چھری لائیں بارہ بج گئے ہیں۔'' ولی نے گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا تو وہ سر ہلاتی جلدی سے اندر گھس گئی۔ اس کے آنے تک وہ جیکٹ کی جیب سے چھوٹی سی موم بتی نکال چکا تھا۔

''بس ایک کینڈل، یعنی ایک سال کے ہوگئے ہیں آپ۔'' وہ شرارت سے لب دانتوں میں دبا کر مسکرائی تو وہ بھی ہنس دیا۔

''بالکل آج سے میں ایک نئی زندگی کی شروعات کرنے جا رہا ہوں۔'' ولی نے چھری اس کے ہاتھ سے لی۔ اس نے ماچس جلا کر موم بتی جلائی۔

''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔ ہیپی برتھ ڈے ٹو ڈیئر ولی۔ ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔'' اس کی خوب صورت گنگناہٹ کے ساتھ اس نے کیک کاٹا۔

''یہ تو سچ میں بچوں جیسی برتھ ڈے ہوگئی ہے۔'' ولی نے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''تو اچھا ہے نہ۔ کبھی کبھی بچہ بن جانے سے بھی ویسی ہی خوشی ملتی ہے۔'' وہ مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ بہت خوب صورت تھی۔

''آپ پیس کریں۔ میں پلیٹس لاتی ہوں اور ساتھ میں کافی۔'' اس سے کہہ کر وہ جلدی سے اندر کی جانب بڑھ گئی۔

تاروں بھرے آسمان کو تکتا وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا جب وہ کافی لے آئی۔ اس نے مگ تھام لیا تو وہ کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔ منہ اوپر کر کے ستاروں کو دیکھنے لگی۔

''آسمان کتنا حسین لگ رہا ہے نا ان ستاروں کے ساتھ۔ میرا دل چاہتا ہے میں بھی کوئی ستارہ ہوتی۔ یونہی چمکتی رہتی۔'' اپنی معصوم سی خواہش کا اظہار کرتی وہ مسکرائی۔ ولی نے اس کی آنکھوں کو غور سے دیکھا جن میں ستاروں جیسی ہی چمک تھی۔ ڈھیلے ڈھالے شلوار قمیص کے اوپر سویٹر پہنے اور اس کے اوپر شال لپیٹے۔ شہد رنگ بالوں کی ڈھیلی سی چوٹی بنائے وہ اس سادہ سے حلیے میں بھی حسین نظر آرہی تھی۔ اس کی شال سے اٹھتی بھینی بھینی خوشبو اور ماحول کے فسوں نے گویا ایک حصار سا باندھ دیا تھا۔ ایک دم اسے چھو لینے کی خواہش دل میں ابھری تو وہ جیسے ہوش میں آیا۔ جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا تو کافی چھلک کر ہاتھ پر جا پڑی۔

''کیا ہوا؟'' اسے اٹھتے دیکھ کر وہ چونکی۔

''کچھ نہیں کافی گر گئی ہے۔'' اس نے مگ نیچے رکھ کر ہاتھ جھٹکا۔

''دکھائیں زیادہ تو نہیں جل گیا۔'' اس نے آگے بڑھ کر ہاتھ کو چھونا چاہا تو اس نے جلدی سے ہاتھ پیچھے کر لیا۔

''ہلکا سا سرخ ہوا ہے بس۔ ٹھنڈ بہت ہو رہی ہے۔ آپ آرام کریں جا کر۔ میں بھی اپنے کوارٹر میں جا کر لیٹتا ہوں۔'' جلدی سے بات بنائی۔

''آپ ٹھیک ہیں؟'' اس کا سرخ چہرہ دیکھ کر پوچھے بنا نہ رہ سکی۔ اس کے سر ہلانے پر وہ خدا حافظ کہتی اندر چلی گئی۔ اور وہ وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔ دماغ گویا جھنجھنا اٹھا۔

Digitized by Google

اس کے مومی ہاتھوں کو چھو لینے کی خواہش اس کے ذہن میں آئی کیوں کر، اس نے تو کبھی ارمینا کا ہاتھ پکڑنے کی بھی کوشش نہ کی تھی۔ ہمیشہ اس سے ایک فاصلہ رکھا تھا۔ اور یہ سب اس کی تربیت کا حصہ تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ ایسے خیال کے آتے ہی وہ اسے جھٹکنے میں کامیاب رہا تھا۔ مگر ان چند منٹوں میں اس کا پورا بدن پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔

مری کی ہڈیاں جما دینے والی سردی میں وہ جیسے اندر سے کھول رہا تھا۔ خود پر — شدید غصہ آ رہا تھا۔ واقعی کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ تنہائی میں مرد اور عورت کے درمیان شیطان جگہ بنا لیتا ہے۔ انہیں رات کے اس پل یوں اکیلے نہیں بیٹھنا چاہیے تھا۔ شاید آج کل ہاتھ پکڑ لینا اتنی بڑی بات نہیں سمجھی جاتی مگر وہ ولی کمال تھا جس کی تربیت ایسے ہی کی گئی تھی کہ اس خیال سے اسے اپنے وجود کے گرد آگ کی لپٹیں محسوس ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

اگلے روز وہ کچن میں نظر آئی تو وہ اس کی جانب بڑھا۔

"سوری کل میں کچھ تھکا ہوا تھا۔ آپ کو برا تو نہیں لگا میں نے آپ کو جانے کا کہہ دیا۔" اس نے معذرت کی۔

"اٹس او کے۔ رات دیر بھی کافی ہو گئی تھی۔ آپ کے لیے آملیٹ بنا دوں۔" وہ نارمل سے انداز میں مسکرائی تو اس نے سر ہلا دیا۔

"بی بی جان پراٹھا بنا دیں۔" اندر آتی بی بی جان کو دیکھ کر اس نے فرمائش کی۔

ناشتے کے بعد وہ بی بی جان کے ساتھ بیٹھا آج کا پروگرام ڈسکس کر رہا تھا۔ شام کی گاڑی سے انہیں اسلام آباد واپس جانا تھا۔ ایک دم باہر سے چند زوردار آوازیں آئیں تو وہ چونکا۔ بی بی جان کا ہاتھ بھی دل پر جا پڑا۔ "خدا خیر کرے۔"

"کچھ نہیں بی بی جان بچے باہر پٹاخے چھوڑ رہے ہیں۔" ولی نے اطمینان سے کہا۔ بی بی جان نے منہ بنایا۔ اسی وقت وہ کمرے سے دوڑتی ہوئی آئی تھی۔

"باہر کوئی ہے۔" وہ پریشان سی بی بی جان کے پاس بیٹھ گئی۔ سہمی ہوئی نظریں دروازے پر لگی تھیں۔

"نہیں بیٹا! کوئی نہیں ہے۔" انہوں نے تسلی دینی چاہی اسی وقت پھر سے آواز ابھری تو وہ بی بی جان کے سینے سے جا لگی۔

"باہر گولیاں چل رہی ہیں بی بی جان۔" اس بار اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

"باہر بچے پٹاخے چلا رہے ہیں۔ اور کچھ نہیں ہے۔" ولی نے تسلی دی۔

"نہیں یہ گولی کی آواز ہے۔" وہ بضد تھی۔

"میں دیکھتا ہوں۔" وہ جلدی سے اٹھ کر باہر گیا۔

"ولی، بی بی جان روکیں نا۔" اسے جاتے دیکھ کر وہ اور گھبرا گئی۔

"بیٹا پٹاخے ہیں اور کچھ نہیں ہے۔" بی بی جان نے اسے اپنے ساتھ لپٹایا۔

"پٹاخوں کی آواز تھی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں نے منع کر دیا ہے۔" ولی نے آ کر تسلی دی۔ وہ ابھی بھی بی بی جان کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ ولی نے نظریں چرائیں۔ جانے کیوں اس کی پریشان صورت اس سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

☆☆☆

"کیا ہوا اتنا سنجیدہ کیوں ہے؟" وہ کل رات واپس آئے تھے اور آج وہ مراد سے ملنے آ گیا تھا۔

"نہیں، تیرا وہم ہے بھئی۔" ولی نے اسے ٹالا۔

"مری کے حسین موسم کا بھی تجھ پر اثر نہیں ہوا۔"

"اب کیا موسم اور اس کے اثرات پر سیر حاصل بحث کروں۔" وہ چڑ گیا۔ مراد نے بغور اسے دیکھا۔ وہ کچھ الجھا الجھا سا لگ رہا تھا۔

"دیکھ تجھے پتا ہے میں ٹلنے والا تو ہوں نہیں۔ اب سچ سچ بتا مسئلہ کیا ہے؟"

ولی نے گہرا سانس لیا۔ "تانیہ۔"

Digitized by Google

"تانیہ۔" مراد نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"اس کے لیے میرے محسوسات عجیب سے ہو رہے ہیں۔" اس نے مجرمانہ انداز میں اعتراف کیا۔

"مطلب تجھے اچھی لگ رہی ہے تو بھائی مسئلہ کیا ہے۔"

"بس مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ میں ارینا کے علاوہ......" مراد نے اس کی بات کاٹی۔

"مٹی ڈال ارینا والے چیپٹر پر۔" اس کے گھورنے پر وہ گڑبڑایا۔

"میرا مطلب ہے بھول جا اسے۔ وہ خود تجھے چھوڑ کر گئی ہے۔"

"مگر میری طرف سے کوئی کھوٹ تو نہیں تھا نا۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"سچ یہ ہے بھائی کہ ارینا تیرا دل توڑ کر گئی ہے۔ تو اب تو لاکھ کوشش کر، تب بھی وہ پہلے سا مقام اسے نہیں مل سکتا۔ اور جب ایسا ہے تو تانیہ کے بارے میں کیوں نہیں سوچ سکتا۔" مراد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"پتا نہیں، میں خود الجھن کا شکار ہوں۔ میں ایسا کچھ سوچنا نہیں چاہتا۔ مگر وہ معصوم سی لڑکی اتنی اچھی ہے کہ دل اس کی جانب کھنچتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس کا چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھنا۔ ذرا سی بات پر خوش ہو جانا۔" تصور میں اس کی ستاروں کی طرح چمکتی آنکھیں اور لبوں پر کھلتی بھرپور مسکراہٹ لہرائی۔

"آہم آہم۔" مراد کے شرارتی انداز پر اسے بریک لگا۔

"گھر چلتے ہیں دوپہر ہونے والی ہے۔ تو بھی بی بی جان کے ہاتھ کا کھانا کھا لینا۔" اپنی جھینپ مٹانے کو وہ بات بدل گیا۔

وہ گھر پہنچے تو گھر بھر میں خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

"یہ کیا پک رہا ہے بی بی جان؟" ولی نے پوچھا۔

"آلو کے پراٹھے بن رہے ہیں۔ تانیہ کو شوق ہو رہا تھا سیکھنے کا۔ وہی پکا رہی ہے۔" بی بی جان نے بتایا پھر وہ مراد سے حال احوال پوچھنے لگیں تو وہ پانی پینے کچن میں آگیا۔ جہاں وہ اپنے بالوں کو جوڑے میں باندھے کسی ماہر شیف کی طرح اپنے کام میں مصروف تھی۔

"خیر تو ہے، یہ پراٹھے کس لیے سیکھے جا رہے ہیں۔"

"یونہی شوق ہو رہا تھا۔ بی بی جان اتنے بہترین پراٹھے بناتی ہیں۔ میں نے سوچا میں بھی سیکھ لوں۔" وہ عام سے انداز میں بولی۔

"وہ بھی ڈائریکٹ آلو والے پراٹھے۔"

"مشکل چیز سے شروع کرنا میری ہابی ہے۔ اب آپ ہاتھ دھو لیں۔ پراٹھے تو بس تیار ہیں۔" وہ مسکرائی تو وہ سر ہلاتا کچن سے نکلا۔

منٹوں میں اس نے برتن میز پر لگا دیے۔

"بی بی جان دیکھیں یہ پودینے کی چٹنی کتنی پرفیکٹ بنی ہے اور آخری پراٹھا بھی بالکل آپ کے پراٹھے جیسا لگ رہا ہے۔" چٹنی کا پیالا میز پر رکھتی وہ خوشی سے بولی۔ پھر کرسی پر بیٹھتے ولی کو مخاطب کیا۔

"پہلے انکل کو تو بلا لائیں۔"

"بابا گھر پر ہیں؟"

"وہ جلدی آگئے تھے۔ ان کو میگرین ہو رہا تھا۔ دوا لے کر سو گئے تھے۔ آپ بلا لائیں، اچھا ہے کھانا کھا لیں گے۔" وہ سر ہلاتا اٹھ گیا۔

پراٹھے واقعی مزے دار بنے تھے۔ سبھی نے کھا کر تعریف کی جس پر وہ مسکراتی رہی۔ مراد نے بغور میز کے گرد بیٹھے اس گھر کے افراد کو دیکھا تھا۔ منظر گویا بالکل مکمل تھا۔ ولی اسے چھوڑنے گیٹ تک آیا تو اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"میری مان سوچنے میں وقت ضائع نہ کر۔ اس لڑکی کو کوئی بھی دیکھے گا تو تیرے گھر کا فرد سمجھے گا۔ جب وہ اتنی گھل مل گئی ہے تو اس سے شادی کر لے تاکہ انکل بھی اس مشکل سے نکل سکیں۔ اور ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی تو اسے پرپوز کر دے۔" اسے نئی راہ دکھاتا وہ گیٹ عبور کر گیا۔

Digitized by Google

☆☆☆

اسے ڈھونڈتا وہ چھت تک آیا تھا۔ سامنے ہی وہ بی بی جان کے ساتھ چارپائی پر بیٹھی دھوپ سینکتی نظر آ گئی۔ ہاتھ میں کینو پکڑ رکھا تھا جس کو وہ بڑی احتیاط سے چھیل رہی تھی۔ وہ پاس جا کر کھنکارا تو وہ متوجہ ہوئی۔

"کینو کھائیں گے۔" اس نے آفر کی۔ ساتھ ہی پلیٹ اس کی جانب بڑھائی جس میں چھلے ہوئے کینو رکھے تھے۔ اس نے ایک پھانک اٹھائی۔

"آج شام میرا آف ہے۔" اس نے سوچ کر بات کا آغاز کیا۔ بی بی جان اب منہ پر دوپٹا اوڑھے ستانے کو لیٹ چکی تھیں۔

"چلیں اچھا ہے۔ آج میں لاؤنج میں سیٹنگ تبدیل کرنے کا سوچ رہی تھی۔ بلکہ بی بی جان نے تو لاؤنج کو اپنی مرضی سے سجانے کی بھی اجازت دے دی ہے۔ شام کو بیٹھ کر ڈسکس کریں گے۔" تانیا اپنی جون میں بولی تو گڑبڑایا۔

"آں ہاں کرلیں گے ڈسکس۔" پیشانی مسلی۔

"شام میں باہر چلتے ہیں۔ میری برتھ ڈے کی ٹریٹ بھی تو رہتی ہے۔" بالآخر اسے بہانہ سوجھ گیا۔

"ڈن"۔ وہ راضی ہوگئی پھر جیسے خیال آیا۔

"آج انکل تو کہیں انوائٹڈ ہیں اور بی بی جان سے شام میں کوئی خاتون ملنے آ رہی ہیں۔"

"تو میں اور آپ چلے جائیں گے۔ بہت اچھی سی جگہ ٹریٹ دوں گا آپ کو۔" ولی نے کینو کی توری منہ میں ڈالتے مزے سے کہا۔

"اوکے۔ پھر کچھ ریڈنگ شیٹس بھی لیتے آئیں گے۔ مجھے ضرورت تھی۔"

"اوکے۔" اس نے حامی بھری۔

پھر شام میں وہ میرون رنگ کا جوڑا پہن کر تیار ہو کر آئی، اوپر اس نے سیاہ رنگ کا سویٹر پہن رکھا تھا۔ شہد رنگ بالوں کی چٹیا بنا کر بائیں کندھے پر ڈال رکھی تھی اور بی بی جان کی ہدایت پر اس نے میرون دوپٹے کو سر پر کر لیا تھا۔ کچھ تھا اس لڑکی میں کہ وہ سادہ سے حلیے میں بھی خاص لگتی تھی۔ ایک مقناطیسی کشش تھی کہ کچھ لمحوں کے لیے وہ دیکھتا رہ گیا تھا۔

بی بی جان نے اسے سامان کے لیے کچھ پیسے دیے تھے جن سے وہ کچھ چیزیں لینا چاہتی تھی۔ بی بی جان اس کے سنبھل جانے پر بہت خوش تھیں شاید اسی لیے اسے سیٹنگ کی اجازت دے دی تھی۔ اس نے آخر میں بازار لے جانے کا کہا تھا۔ پہلے وہ اسے ریسٹورنٹ ہی لے جانا چاہتا تھا۔ گاڑی وہ اپنے دوست سے لے آیا تھا جس کے والد کرائے پر گاڑیاں دیتے تھے۔

اس نے گاڑی ریسٹورنٹ کے سامنے روکی تو وہ چونکی۔

"ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"یہاں میں آپ کو اچھی سی ٹریٹ دوں گا۔" ولی نے اطمینان سے کہا۔ وہ خاصا مہنگا ریسٹورنٹ تھا اور وہ آج اپنی ساری جمع پونجی لے آیا تھا۔ وہ کسی اچھی جگہ پر اسے پرپوز کرنا چاہتا تھا۔

"چلیں۔" اسے خاموش دیکھ کر اس نے کہا۔

وہ سر ہلاتی اپنی سائیڈ کا دروازہ کھول کر اتر گئی۔ یہ جگہ دیکھ کر اسے بہت کچھ یاد آ گیا تھا جسے وہ بھول جانا چاہتی تھی۔ مگر اس کی خوشی دیکھ کر وہ انکار نہ کر سکی۔

نیچے والے ہال میں وہ ایک ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ ریسٹورنٹ میں چہل پہل تھی۔ لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اسے گھبراہٹ ہوئی کہیں کوئی اسے پہچان نہ لے۔ لاشعوری طور پر دوپٹے کو سر پر درست کیا۔

"آرڈر کرتے ہیں۔" ولی نے اس کی توجہ مینیو کارڈ کی جانب کروائی۔ پھر آرڈر دینے کے بعد ولی دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ اسے اب پرپوز کر دینا چاہیے۔

"کیا ہوا، جگہ پسند نہیں آئی؟" اسے اطراف کا جائزہ لیتے دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں بہت اچھی ہے۔" وہ بامشکل مسکرائی پھر نگاہیں اس سے ملیں تو وہ ٹھٹکی۔ آج اس کے انداز

Digitized by Google

کچھ بدلے بدلے سے لگ رہے تھے۔ آنکھوں میں ہمیشہ کی طرح احترام تھا مگر ساتھ میں کوئی اور جذبہ بھی ہلکورے لے رہا تھا۔ لبوں پر بظاہر مسکراہٹ تھی مگر چہرے سے وہ نروس لگ رہا تھا۔ شاید کچھ کہنے کے لیے الفاظ ترتیب دے رہا تھا۔

"وہ میں کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔" ولی نے بات شروع کرنی چاہی تو وہ بے اختیار بات بدلنے کو بولی۔

"کھانا کب تک آئے گا۔ کہیں لیٹ نہ ہو جائیں ہم۔"

"دس منٹ تک آجائے گا۔ وہ میں فریش ہو کر آتا ہوں۔" اس کا حوصلہ ٹوٹا تو وہ اٹھ گیا۔ اس کے جاتے ہی اس نے طویل سانس لیا۔ اس کے دل میں خطرے کا الارم بج رہا تھا۔ اگر اس نے کوئی ایسا سوال کر ڈالا جس کا جواب اس کے پاس نہ ہوا تو کیا ہوگا۔ یہ لوگ بہت اچھے تھے۔ وہ ان کا دل نہیں دکھانا چاہتی تھی۔

اسے سوچ سوچ کر گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ نگاہیں یونہی لوگوں کے چہروں پر پڑنے لگیں تو دائیں جانب ایک چہرے پر نظر پڑتے ہی ذہن نے گویا لمحوں میں شعور تک کا سفر طے کیا تھا۔ پل بھر میں اس کا چہرہ فق ہوا تھا۔ اس کی نظریں بھی جانے کتنی دیر سے اس پر ٹکی تھیں۔ وہ فوراً اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی تھی اور اس کی یہ بوکھلاہٹ ہی تھی جو اسے اس کی پہچان کرا گئی تھی۔ گھبراہٹ میں وہ جلدی سے اوپر والے ہال کی سیڑھیوں کی جانب بھاگی تھی۔ چہرے پر ایسے ہوائیاں اڑ رہی تھیں گویا موت اس کے تعاقب میں ہو۔

واش روم میں کھڑا وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ آئینے میں اپنا عکس دیکھتے سیٹ بالوں کو خوامخواہ درست کرنے کی سعی کی۔

"ریلیکس ولی کمال۔ زیادہ سے زیادہ وقت مانگ لے گی یا۔" خود کو ہمت دیتے اگلی سوچ پر نفی میں سر ہلایا۔

"اونہوں، جھٹ سے انکار تو نہیں کرے گی۔ اتنا تو لحاظ کرے گی ہی۔" خود پر ایک آخری نظر ڈالتا وہ باہر نکلا۔ ہال میں داخل ہوتے ہی اسے جھٹکا لگا تھا۔ کچھ لمحوں کے لیے وہ ساکت ہوا، سامنے کی ٹیبل پر ارمینا ہی تھی۔ اسٹائلش سے انداز میں تیار ہوئی پچھلی ارمینا سے خاصی مختلف لگ رہی تھی۔ اپنے ساتھ موجود شخص سے باتیں کرتی وہ خوش اور مگن سی تھی۔ خود کو سرزنش کرتے اس نے ان پر سے نگاہ ہٹائی اور اپنی نشست کی جانب بڑھا مگر وہاں ثانیہ کو موجود نہ پا کر اسے ایک اور جھٹکا لگا۔

اوپر کے ہال میں بھی لوگ خاصی تعداد میں تھے۔ وہ بائیں جانب مڑ گئی۔ یہاں دو بند دروازے تھے اور ساتھ لیڈیز اور جینٹس واش روم تھے۔ اس نے لیڈیز واش روم کی جانب قدم بڑھائے۔ اس سے پہلے کہ وہ اندر قدم رکھتی کسی نے پیچھے سے اسے دبوچا تھا۔ وہ تقریباً گھسٹتی چلی گئی۔ چہرہ اس کی جانب مڑا تو آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ فاران سکندر نے اسے بازو سے دبوچ رکھا تھا۔ نگاہیں اس پر جمی تھیں۔

"تو تم زندہ ہو انزا دلاور۔ اگر میرے وہم و گمان میں بھی ہوتا تو میں اس رات تمہیں خود قبر میں اتارتا۔" وہ سرد مہری سے بولا تو اسے رگوں میں اپنا خون جمتا محسوس ہوا۔

"مجھے چھوڑ دو فاران۔" اس کی آواز کانپی، پیچھے ہونے کی کوشش میں وہ دیوار سے جا لگی۔

"تمہیں زندہ چھوڑ دیا تو میرا انتقام کیسے پورا ہوگا اور اب تو تمہیں چھوڑنا بھی کسی طرح خطرے سے خالی نہیں۔" اس کا ہاتھ اس کے چہرے سے ہوتا ٹھوڑی پر رکا تو اس نے اسے جھٹکنے کی کوشش کی۔ اسے اس کے وجود سے کراہیت محسوس ہو رہی تھی۔ مگر اس کی گرفت سخت تھی۔

"تمہارا قصہ تو میں آج ختم کر دوں گا۔" وہ سفا کی سے بولا۔

"مجھے چھوڑ دو فاران! ورنہ میں شور مچا دوں گی۔ یہاں بہت لوگ ہیں، تم مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔" اس نے بمشکل اپنی آواز کی کپکپاہٹ پر قابو پایا۔ وہ مسکرایا۔

Digitized by Google

"میں تمہیں اس قابل نہیں چھوڑوں گا کہ تم شور مچا سکو۔ تمہیں بے ہوش کر کے اپنے ساتھ لے جاؤں گا کہ میری بیوی بے ہوش ہو گئی ہے، کوئی مجھے نہیں روکے گا۔"

اپنی بات مکمل کرتے ہی اس نے اس کے منہ کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ اس نے یک دم پورا زور لگا کے اسے دھکا دیا تھا۔ اس کی گرفت لمحے بھر کے لیے ڈھیلی پڑی مگر وہ اس کی سوچ سے زیادہ تیز تھا۔ اس نے اسے بھاگنے کا موقع نہیں دیا تھا، اسی وقت انزا کو دیوار پر لگا ایمرجنسی بٹن نظر آیا اور اس نے جلدی سے اس پر ہاتھ رکھ دیا۔ لمحوں میں وہاں موجود دروازے کھلے تھے، جن میں سے کچھ لوگ باہر نکلے۔ فاران یک دم بوکھلا گیا اور اس کا فائدہ اٹھاتی وہ باہر کی جانب بھاگی۔ ہال میں موجود لوگ بھی گھبرا کر اپنی جگہوں سے اٹھے تھے۔ عجیب بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتی نیچے والے ہال میں پہنچی، سامنے پریشان سا ولی قریب آیا۔

"کیا ہوا، سب ٹھیک ہے؟"

"یہاں سے نکلو جلدی۔" پھولے سانس کے ساتھ وہ بیرونی دروازے کی جانب بھاگی تو وہ بھی ساتھ ہو لیا۔

"کیا ہوا ہے، کچھ بتائیں تو......" گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ بولا۔

"ولی پلیز گاڑی چلاؤ ورنہ وہ مجھے جان سے مار دے گا۔" وہ بری طرح خوف زدہ تھی۔ گاڑی سڑک پر ڈالتے وہ ٹھٹکا مگر خاموش رہا۔

"آپ اب مجھے ٹھیک سے سب بتائیں گی۔" تھوڑی دور جا کر وہ بولا تھا، اب وہ بھی کچھ پرسکون ہو چکی تھی۔

"میں نے یادداشت کھونے کا ڈراما کیا تھا۔" وہ ندامت سے بولی۔

"یہ بات میں پہلے دن سے جانتا ہوں۔" اس نے اطمینان سے کہا تو وہ چونکی۔

"ڈاکٹر سے بھی میری بات ہوئی تھی اور اس نے کہا تھا کہ ایسی گہری چوٹ نہیں لگی کہ یادداشت متاثر ہو۔ میں سمجھ گیا تھا کہ آپ کچھ بتانا نہیں چاہتیں اور ہم پر اعتبار بھی نہیں کرنا چاہتیں پھر آپ کی کھوئی کھوئی سی حالت بھی اس کا ثبوت تھی کہ آپ اپنے ساتھ پیش آئے حادثے کو بھلا نہیں پا رہیں۔"

جواب میں وہ خاموش رہی تو اسے پوچھنا پڑا۔

"کون تھا وہ؟"

"میرا شوہر۔" وہ بولی تو ولی کمال کے اندر جیسے چھن سے کچھ ٹوٹا تھا۔

☆☆☆

کمرے کا ہیٹنگ سسٹم بند ہونے کے باوجود ایک تپش کا سا احساس اپنے وجود کے گرد لپٹا محسوس ہو رہا تھا۔ پسینے کی بوندیں پیشانی پر پھیلی تھیں اور وہ مضطرب سا دفتری میز کے گرد ٹہل رہا تھا۔

"اب تک اس نے اپنے باپ سے رابطہ نہیں کیا، مگر وہ اب ضرور ایسا کرے گی اور اس سے پہلے ہی ہمیں اسے ڈھونڈنا ہے۔" ٹائی کی ناٹ مزید ڈھیلی کرتا وہ بولا۔

"پر سر! وہ زندہ کیسے بچ گئیں۔ ضرور اس غفور نے ہمدردی کی ہوگی۔" سامنے مؤدب کھڑے آدمی نے کہا۔

"ہوں، تب ہی تو وہ نوکری چھوڑ گیا۔ اسے بھی دیکھ لیں گے۔ مگر اس وقت مجھے انزا دلاور چاہیے۔ زندہ یا مردہ، کسی بھی حالت میں۔ اتنی بڑی بازی اب میں کسی صورت نہیں ہار سکتا۔" فاران سکندر کے لہجے میں سختی تھی۔

☆☆☆

"سوری ولی۔ میں نے یہ سب چھپایا آپ لوگوں سے۔ پر سچ تو یہ ہے کہ میں خود بہت شاکڈ تھی، اس سب کو بھول جانا چاہتی تھی۔ زندگی جیسے زیرو کے ہندسے پر جا رکی تھی۔" اگلے روز وہ جاب پر جانے کے لیے نکل رہا تھا جب وہ اس کے پاس وضاحت کے لیے آئی تھی۔ اس روز تو وہ بالکل خاموش ہو گیا تھا سب سن کر اور اس کی سنجیدگی دیکھ کر

Digitized by Google

وہ شرمندگی کا شکار ہوگئی تھی۔

"آپ کو سوری کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو اپنوں سے زخم کھا چکا ہو وہ اجنبیوں پر اعتبار کیسے کر سکتا ہے۔ میری وجہ سے آپ ہرگز پریشان نہ ہوں۔ مجھے بس سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کہوں۔"

اندر سے اب اسے اپنے رویے پر شرم ساری محسوس ہو رہی تھی۔ اسے اپنی خوامخواہ کی ناراضی دکھا کر اس لڑکی کا مزید امتحان نہیں لینا چاہیے تھا۔ غلطی تو اس کی تھی جو جانے اس کے متعلق کیا کچھ سوچنے لگا تھا اور اب وہ اس حقیقت سے نظریں نہیں چرا سکتا تھا کہ وہ کسی کی بیوی تھی۔ چاہے پورا سچ جو بھی تھا مگر وہ خود سے شرمندہ تھا کہ اس نے ایسی لڑکی کے بارے میں سوچا جو کسی اور کے نکاح میں تھی۔

"تم کہتے ہو تو میں یہاں سے چلی جاتی ہوں۔" اس نے لب کاٹے۔

"پلیز میری بات کا غلط مطلب مت لیں۔ آپ یہاں رہ سکتی ہیں۔ لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ آپ اپنے والد سے رابطہ کریں۔ آپ کی ان سے ناراضی ٹھیک نہیں ہے اور اب جبکہ وہ جان چکا ہے کہ آپ زندہ ہیں تو اس جیسا شاطر انسان سکون سے نہیں بیٹھے گا۔ وہ پھر سے آپ کو تلاش کر رہا ہوگا۔"

ایک نگاہ اس پر ڈالی جو خاموش کھڑی تھی۔

"میری بات پر غور کیجیے گا۔" بائیک کی چابی نکالتا وہ باہر نکل گیا۔

☆☆☆

"اٹھ جاؤ ولی بیٹا۔ جلدی کرو۔" بی بی جان اسے کوئی آدھے گھنٹے سے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"سونے دیں نا بی بی جان۔ ابھی تو ایک بجا ہے۔" اس نے جمائی روکتے ہوئے منہ رضائی سے نکال کر گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

"کل بتایا تو تھا رضیہ کو ہسپتال دیکھنے جانا ہے۔ چل میرے بچے اٹھ جا اب۔" ساتھ انہوں نے پچکارا۔ ان کی سہیلی دل کے دورے کے باعث ہسپتال میں داخل تھیں۔ گہرا سانس لیتے اس نے بستر چھوڑا۔

وہ تیار ہو کر لاؤنج میں آیا تو سینڈوچ اور دودھ کا گلاس میز پر رکھا تھا۔ جب تک وہ کھا کر فارغ ہوا وہ دونوں تیار کھڑی تھیں۔

"یہ بھی ساتھ جائیں گی۔" اس نے انزا کو دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں تو عیادت کے لیے جا رہے ہیں۔ ساتھ چلی چلے گی۔" بی بی جان برا مان گئیں۔

"وہ تو ٹھیک ہے پر اس شہر میں سو دشمن ہو سکتے ہیں ان کے۔ ان کا یوں باہر جانا ٹھیک نہیں ہے۔" ولی نے سمجھایا۔

"کچھ نہیں ہوتا ہم ساتھ ہیں خیر سے۔"

"میں اکیلی تو نہیں ہوں اور پھر ہسپتال تک ہی تو جانا ہے۔" انزا بولی۔ وہ کہنا تو کچھ اور بھی چاہتا تھا مگر بی بی جان نے مہلت نہ دی۔

گاڑی وہ اپنے دوست سے پہلے ہی لا چکا تھا۔ ہسپتال خاصا دور تھا اور پھر راستے میں بی بی جان نے پھل خریدنے میں خاصا وقت صرف کیا۔

وہ ہسپتال پہنچے تو راہداری میں انہیں رضیہ خالہ کے بیٹے مل گئے۔ بی بی جان ان سے حال احوال پوچھ رہی تھیں، جب ولی کو کچھ فاصلے پر رضیہ خالہ کے دوسرے بیٹے کے ساتھ کھڑے شخص کی نگاہیں انزا پر پڑتی محسوس ہوئیں اور یکدم جیسے اس کا خون کھول اٹھا تھا۔ وہ نامحسوس انداز میں انزا کے آگے آ کھڑا ہوا اور ایک سنجیدہ نگاہ اس شخص پر ڈالی جو چونک کر اب اپنی نظروں کا زاویہ بدل چکا تھا۔ مگر پھر اس کا ان کے پیچھے کمرے تک آنا اسے سخت تپا گیا تھا۔ وہ رضیہ خالہ کے دیور کا بیٹا تھا۔ وہ اسے تو محض گھور ہی سکا مگر بی بی جان کو اس نے وہاں زیادہ دیر ٹھہرنے نہ دیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی بی بی جان نے بازار جانے کو کہا تو وہ چڑ گیا، موڈ پہلے ہی سخت خراب تھا۔ مگر اس کے منع کرنے کے باوجود بی بی جان اپنی بات منوا کر ہی رہیں۔ انہوں نے انزا کو ساتھ چلنے کا کہا تو اس نے نہ جانے دیا۔ پتا نہیں کیوں اسے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔

گاڑی میں خاموشی تھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر

Google

بیٹھا باہر دیکھ رہا تھا جبکہ وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی اس کا خراب موڈ دیکھ رہی تھی۔

''ولی۔'' اس نے پکارا تو وہ چونکا۔

''ہوں۔''

''ناراض ہو؟'' وہ کافی دیر سے اس کا خراب موڈ نوٹس کر رہی تھی۔

''آپ کو کیا ضرورت تھی بی بی جان کے ساتھ باہر آنے کی۔ کچھ اندازہ ہے کتنا خطرناک ہے آپ کا یوں باہر نکلنا۔'' وہ غصے میں اس پر الٹ پڑا، پھر لب بھینچ لیے۔ غصے سے عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی، جیسے کچھ سمجھ میں نہ آ رہا ہو۔

''جانتی ہوں فاران سکندر میرے خون کا پیاسا ہے۔ اب احتیاط کروں گی۔'' وہ ہولے سے بولی۔

''اپنے والد کو فون کیا آپ نے؟''

''نہیں۔''

''آپ کیوں نہیں سمجھتیں وہ والد ہیں آپ کے اور رشتے یوں نہیں ٹوٹا کرتے اور اس وقت......''

''فاران بھی تو میرا شوہر ہے تو کیا اس کے پاس جانے کا مشورہ بھی دو گے۔'' وہ یکدم بھڑک اٹھی، چہرہ غصے سے سرخ پڑ گیا تھا۔

''مجھ سے تنگ آ گئے ہو تو بتا دو۔ چلی جاتی ہوں۔'' منہ پھلا کر وہ دوسری جانب دیکھنے لگی تھی۔

بجائے اسے جواب دینے کے وہ گاڑی سے اتر گیا اور زوردار آواز سے دروازہ بند کیا۔ اتنا غصہ تو اسے کبھی نہیں آیا تھا۔ کچھ دیر گاڑی سے ٹیک لگائے اس نے خود کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تو شرمندگی کا احساس دل میں ابھرا۔ اسی وقت نگاہ مراد پر پڑی تو وہ بے اختیار اس کی جانب بڑھا۔

''میری کال تو اٹھا نہیں رہا تھا اور یہاں بازار میں پھر رہا ہے۔'' قریب جا کر اسے لتاڑا۔

''خیر تو ہے۔ انگارے کیوں چبا رہا ہے۔'' مراد نے سبزی والے کو پیسے تھماتے شاپر پکڑا۔

''کچھ نہیں، بس بی بی جان کا انتظار کر رہا تھا۔'' مراد اصل صورت حال سے ناواقف تھا۔

کچھ دیر وہاں کھڑے ہو کر اس کے ساتھ گپ لگانے سے اس کا دماغ اچھا خاصا ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ پھر بی بی جان آتی نظر آئیں تو وہ ان کی جانب چل پڑے۔ ان کے ہاتھ سے شاپر تھامتے انہیں گاڑی تک لائے۔ ولی نے پچھلا دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ لاک تھا۔ شیشہ بجاتے وہ انزا کو اشارہ کرنے کے لیے جھکا تاکہ وہ لاک کھولے مگر اسے جھٹکا لگا، شاپرز اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ وہ بے اختیار دوسری جانب آیا دروازہ پورا بند نہیں تھا اور وہ بیچ میں کہیں نہیں تھی۔

''تانیہ کہاں گئی۔'' بی بی جان الگ بوکھلا گئیں۔

ولی انہیں بیٹھنے کا کہتا آس پاس اسے تلاش کرنے لگا مگر دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور چھٹی حس کچھ غلط ہو جانے کا سگنل دے رہی تھی۔

پندرہ منٹ بعد وہ تھکے تھکے قدموں اور پریشان صورت لیے گاڑی تک آیا۔ مراد وہیں کھڑا بی بی جان کو تسلیاں دے رہا تھا۔

''وہ یہاں نہیں ہے بی بی جان۔ اس کا دشمن اسے لے گیا ہے۔'' ولی کی بات پر ان دونوں کو حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

☆☆☆

اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جاگنے پر اس نے پلکوں کو جنبش دے کر آنکھیں کھولنے کی کوشش کی اور کامیاب رہی۔ آنکھیں جھپک جھپک کر اس مانوس سی جگہ کو دیکھا تو یکدم جیسے ساری حسیات جاگ اٹھیں۔ یہ فاران کا فارم ہاؤس تھا۔ وہ کئی بار یہاں آ چکی تھی۔ اسے یہ جگہ بہت پسند تھی۔ مگر اب اسے اس جگہ سے وحشت ہو رہی تھی۔ قسمت کا یہ کیسا مذاق تھا کہ وہ گھوم پھر کر پھر اسی دھوکے باز شخص کے پاس پہنچ گئی تھی۔ یقیناً یہ اس کی موت ہی تھی جو اسے کھینچ کر یہاں تک لے آئی تھی۔ اب جیسے اسے اس بات کا یقین ہو گیا تھا۔

☆☆☆

''ہمارا دلاور صاحب سے ملنا بہت ضروری ہے۔'' مراد نے بندوق لیے کھڑے چوکیدار کو سمجھانے

Digitized by Google

کی کوشش کی۔ ساتھ کھڑا ولی سخت اکتاہٹ کا شکار تھا۔ دس منٹ سے وہ بحث کر رہا تھا مگر گارڈ ان کی ملاقات کرانے پر کسی طرح راضی نہیں ہو رہا تھا۔

''بس تم جاؤ یہاں سے۔ کہہ جو دیا ہے نہیں ملنا چاہتا صاب کسی سے۔ یہاں تو لمبی لمبی گاڑیوں والے وقت لے کر آتے ہیں اور تم خوامخواہ گھسنے کی کوشش کر رہے ہو اور ابھی تو صاب نے منع کیا ہے کسی سے بھی ملنے سے۔ وہ آج ہی کراچی سے آیا اور بڑا دکھی ہے۔ اس کی بیٹی کچھ عرصہ پہلے کراچی سے غائب ہو گئی تھی پھر کچھ پتا نہیں چلا اس کا۔'' اسے شاید زیادہ بولنے کی عادت تھی تبھی جلدی میں بول گیا۔ ولی فوراً بول پڑا۔

''ان کی بیٹی کے بارے میں ہی تو بات کرنے آئے ہیں ہم ......'' اس نے بیچ میں ہی ٹوک دیا۔

''بڑے تیز ہو کیسے بات بنالی ہے۔ مجھے اتنا بھی بے عقل نہ سمجھو۔ جاؤ یہاں سے۔'' وہ گیٹ بند کر کے اندر چلا گیا۔

''ہمارے پاس وقت کم ہے اور یہ۔'' ولی نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں۔ کمال صاحب کے مشورے پر وہ فوراً اس کے باپ سے رابطہ کرنے نکلے تھے۔ دلاور جہانگیر خاصی جانی پہچانی شخصیت کے مالک تھے اس لیے ان کے گھر تک وہ با آسانی پہنچ گئے تھے مگر اب ان سے ملاقات نہ ہو پا رہی تھی اور جیسے جیسے شام ڈھل رہی تھی۔ اس کے اندر کچھ ہو جانے کا خوف اور بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ یکدم اسے کوئی خیال آیا تو اس نے نیچے گرا چھوٹا سا پتھر اٹھا کر اوپری منزل کی کھڑکی پر دے مارا۔ اس کا نشانہ بہت اچھا تھا۔ بس اس ایک پتھر کے لگتے ہی اس نے اور اٹھا لیے۔

''اس سے کیا ہوگا۔ الٹا وہ چوکیدار ہمارے گلے پڑ جائے گا۔'' مراد نے گیٹ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ بڑے گھروں میں رہنے والے آخر سمجھتے کیا ہیں خود کو۔ اپنا نقصان کرالیں گے مگر ہم جیسوں سے بات نہیں کریں گے۔'' ولی چڑ کر بولا۔ چند منٹ بعد ہی کسی کی اونچی آواز سنائی دی تھی۔

''نظیر۔ نظیر۔''

''جی صاحب۔'' چوکیدار کی آواز آئی۔

''باہر دیکھو کون ہے۔ کھڑکی پر کوئی پتھر مار رہا ہے اور تمہیں خبر نہیں ہے۔''

''صاب! دو بدتمیز لڑکے تھے وہی ہوں گے۔ آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔'' اس وقت ولی نے اونچی آواز میں بولنا شروع کر دیا۔

''دلاور صاحب! اگر آپ اپنی بیٹی کی زندگی بچانا چاہتے ہیں تو ایک بار ہماری بات سن لیں۔'' اور دلاور جہانگیر گویا اگلا قدم اٹھانا بھول گئے۔

''دروازہ کھولو نظیر۔'' وہ کانپتی آواز میں بے تابی سے بولے۔

☆☆☆

اس بار آنکھیں کھولنے پر وہ مکمل ہوش میں آ چکی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھی، یہ فارم ہاؤس کا ہی ایک کمرہ تھا۔ نظریں لاشعوری طور پر دروازے کی جانب گئیں تو وہ بے اختیار بستر سے اٹھی۔ حسب توقع دروازہ باہر سے لاک تھا۔ وہ کھڑکیوں کی جانب بڑھی، پردہ سرکا کر جھانکا، رات کی سیاہی پر پھیلائے گویا ہر طرف راج کر رہی تھی۔ اس کی ہولناکی سے خائف ہو کر اس نے پردہ برابر کر دیا۔ اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ آخر اسے کیا کرنا چاہیے۔ ٹک کی آواز پر وہ بری طرح چونکی۔ لاک کھول کر وہ اندر آیا تھا جس کی صورت دیکھنا اسے عذاب لگا تھا۔

''مجھے یقین تھا تمہیں ہوش آ چکا ہو گا۔'' دروازے کے لاک کو اندر سے دباتا وہ اس کی جانب بڑھا تو انزا بے اختیار دو قدم پیچھے ہوئی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ ایک ہاتھ میں مگ تھامے وہ بڑے اطمینان سے اس کے قریب آ رہا تھا۔

''تم مجھے مارنے کے لیے لائے تھے نا پھر یہاں بند کرنے کا مقصد۔'' اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ اب وہ اپنی جگہ پر جم کر کھڑی ہو گئی۔

Digitized by Google

"میں چاہتا ہوں تم اپنے باپ کے لیے آخری پیغام ریکارڈ کرواؤ۔" کافی کی چسکی لیتا وہ اسے بتا رہا تھا۔

"دلاور جہانگیر سمجھتا ہے کہ اس کی بیٹی اپنے شوہر کے ساتھ کراچی گئی تو وہاں سے لاپتہ ہو گئی۔ بڑا دکھی ہے وہ، بہت تلاش کیا ہے اس نے تمہیں۔ اب میں چاہتا ہوں کہ وہ جان لے کہ اس کی بیٹی کس جرم کی پاداش میں اذیت ناک موت کا شکار ہوگئی۔ تڑپ اٹھے گا وہ یہ جان کر۔" اس کا لہجہ پتھریلا ہوا۔ آنکھوں میں نفرت اور انتقام کی تپش تھی۔ کیسے وہ اس شخص کے دھوکے میں آ گئی تھی کہ اس کی اصلیت نہ جان سکی۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی فاران سکندر کہ تم اس قدر بے حس ہو گے۔ پر تم بھول رہے ہو میرا باپ تمہیں سزا دلائے بغیر چین سے نہیں بیٹھے گا۔"

اس کا قہقہہ کمرے میں گونجا۔

"تمہیں لگتا ہے میں یہاں موجود رہوں گا۔ اونہوں! فاران سکندر اتنی آسانی سے مات کھانے والا نہیں ہے۔ میں اپنے دشمن......"

اس کا جملہ مکمل نہیں ہو سکا تھا، انزا نے اس کے ہاتھ میں موجود کافی کا مگ اسی کے چہرے پر الٹ دیا تھا اور یہ وار اتنا جرأت مندانہ اور اچانک تھا کہ وہ سمجھ ہی نہ سکا۔ کافی گرم تھی اس کے منہ سے سسکاری نکلی، اس نے جلن سے بلبلا کر اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھے۔

انزا کو اتنی ہی مہلت درکار تھی، اسے دھکا دیتی وہ دروازے کی جانب بھاگی۔ لاک کھول کر وہ اندھا دھند باہر بھاگی تھی۔ اس کا رخ درختوں کی جانب تھا۔ اس کمرے کا دروازہ چونکہ باہر کی جانب تھا اس لیے اسے آسانی رہی تھی۔ اسے علم تھا گارڈز کہاں کہاں ہو سکتے ہیں۔ بھاگتے ہوئے اس کا تنفس تیز ہوتا جا رہا تھا۔ وہ یقیناً اس کے پیچھے آنے والا تھا اور اسی چیز کے خوف سے وہ سرپٹ بھاگ رہی تھی۔

فارم ہاؤس خاصا بڑا تھا اور اندھیرے میں اسے سمت کا اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ بس وہ جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ بھاگ رہی تھی۔ فضا میں یکدم بھاگتے قدموں اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں، اس کا دل لرز گیا۔ آنکھوں سے نمکین سیال رواں ہو گیا۔ موت اسے قریب تر محسوس ہونے لگی تھی۔ آوازیں قریب آرہی تھیں۔ اسے دیکھ لیا گیا تھا، اس کی سانس رکنے لگی، کسی چیز سے الجھ کر وہ جھٹکے سے زمین پر گری تھی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ گولیوں کی آوازیں اور بہت سا شور گونجنے لگا تھا پھر اسے اپنا ذہن تاریکی میں ڈوبتا محسوس ہوا۔ آخری احساس تکلیف کا تھا، شدید تکلیف کا۔

☆☆☆

نرم سا احساس تھا جس نے اسے جاگنے پر مجبور کیا۔ اس نے محسوس کیا تھا۔ کسی نے اس کے ہاتھ کی پشت کو سہلایا۔ اس کی آنکھیں کھلیں تو نم آنکھوں والا چہرہ نظر آیا۔

"پاپا۔" وہ اس کا باپ تھا۔ وہ پہچان گئی۔ تو وہ بچ گئی تھی۔

"انزا۔ شکر ہے تمہیں ہوش آ گیا۔" وہ خوش ہو رہے تھے۔ وہ خاموش رہی، نظروں کا زاویہ بدل کر ہسپتال کے کمرے کو دیکھا۔ اسی وقت دروازہ کھول کر ولی اندر آیا تو اسے دیکھ کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر ہلنے سے بازو میں تکلیف ہوئی، شاید وہاں کوئی گہرا زخم آیا تھا۔

"لیٹی رہو، ابھی کمزوری ہے۔" انہوں نے ہاتھ رکھا تو وہ لیٹ گئی مگر بولی کچھ نہیں۔

"آپ ٹھیک ہیں؟" ولی کے پوچھنے پر وہ سر ہلا گئی۔

"بی بی جان اور بابا ابھی گھر گئے ہیں۔ کافی دیر آپ کے ہوش میں آنے کا انتظار کرتے رہے۔" اس نے کہا تو دلاور صاحب بول پڑے۔

"میں آپ لوگوں کا مشکور ہوں۔ اتنے عرصے میری بیٹی کا خیال رکھا۔"

"نہیں سر! ہم نے تو اپنے گھر آنے والی مہمان کا خیال رکھا تھا بس۔" نگاہیں بھٹک کر اس کی جانب

Digitized by Google

انھیں، اس کو ہوش میں دیکھ کر دل میں ڈھیروں سکون اتر آیا تھا۔ یہ رب کی مہربانی تھی کہ وہ بروقت اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے اور ایسا تب ہی ممکن ہوسکا جب وہ دلاور جہانگیر تک پہنچے، پھر انہوں نے اپنے تمام ذرائع استعمال کرتے ہوئے رضیہ آنٹی کے دیور کے بیٹے کو برآمد کرالیا تھا جس پر ولی کو شبہ تھا اور جو اس سارے کیس میں شامل رہا تھا اور پھر رات تک پولیس فارم ہاؤس پہنچ گئی تھی۔

''ہر کوئی ایسا خیال بھی تو نہیں رکھتا۔'' وہ آب دیدہ ہوئے۔

''اب تو خوش ہو جایے۔ آپ کی بیٹی آپ کے پاس ہے۔'' وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔

''ہاں مگر ناراض ہے ابھی تو باپ کو نظر بھر کر دیکھ بھی نہیں رہی۔'' وہ اداسی سے مسکرائے۔ ولی کی نگاہیں خاموش لیٹی انزا پر پڑیں۔

''اپنے باپ کو مجرم سمجھتی ہو نا۔ تو کیا وضاحت کا ایک موقع بھی نہیں دو گی۔'' ان کا ہاتھ اس کے بالوں پر آرکا تو وہ ان کو دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔ بغور انہیں دیکھا، وہ برسوں کے بیمار لگ رہے تھے، آنکھوں کی پتلیوں پر تھکن آٹھہری تھی اور کیسی پیاسی نگاہوں سے وہ اسے تک رہے تھے۔ اسے اپنی ناراضی ریت کی دیوار محسوس ہوئی جو ان کی حالت دیکھ کر ڈھے گئی تھی۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ فاران اس کہانی کا کردار ہے جو ماضی کی دھول میں کہیں چھپ گئی تھی۔'' ولی کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے وہ خود بھی قریب کرسی پر بیٹھ گئے۔ زبان برسوں پہلے کی کہانی دہرانے لگی۔

☆☆☆

جہانگیر خان علاقے کے سردار مانے جاتے تھے اور یہ حکمرانی انہیں وراثت میں ملی تھی۔ ان کی رعب دار شخصیت کی وجہ سے کوئی ان کے فیصلوں سے اختلاف کرنے کی جرأت نہیں رکھتا تھا۔ مگر کچھ عرصے سے ان کا بھتیجا سکندر خان ان سے متنفر رہنے لگا تھا۔ جس کی وجہ وہ دس مربع زمین تھی جسے جہانگیر خان اپنا کہتے تھے جبکہ اس کے مرحوم باپ کا بھی اس میں برابر کا حصہ تھا۔ وہ زمین سونا تھی اور وہ اس سے کسی طرح دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھے۔ بحث و مباحثے کے بعد بات اتنی بڑھ گئی تھی کہ دونوں نے قطع تعلق کرلیا۔

اور یہ ان ہی دنوں کی بات تھی جب جہانگیر خان کا اکلوتا بیٹا دلاور جہانگیر بیرون ملک سے اپنی تعلیم مکمل کر کے آیا تھا۔ آخری بار وہ دو سال پہلے سکندر خان کی شادی میں شریک ہونے آیا تھا، تب سب ٹھیک تھا مگر اس بار ابا جی اپنے بھتیجے کا نام تک سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن وہ ابا جی کی ناراضی کی پرواہ کیے بغیر سکندر خان سے ملنے چلا گیا تھا، اسے زمینوں کے جھگڑے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ سکندر خان پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا۔ اس نے چاچے کی زیادتی کا پلندہ کھول لیا۔ جس پر دلاور نے باپ سے بات کرنے کی ہامی بھرلی۔

اسے بھی اس معاملے میں اپنے باپ کی زیادتی کا احساس تھا۔ اس نے ابا جی سے بات کرنی چاہی پر وہ بھڑک اٹھے اور اسے بھی میل ملاپ بڑھانے سے منع کردیا۔ دلاور فطرتاً صلح جو انسان تھا، اس کی یہی خواہش تھی کہ دونوں آپس کے جھگڑے کو نبٹالیں۔ ایسے میں ایک اور خبر نے گاؤں میں ہلچل سی پیدا کر دی کہ سکندر خان نے اپنے چاچے کے خلاف وکیل کرلیا ہے اور اب زمین کا مسئلہ عدالت میں حل ہوگا۔ جس نے بھی سنا، زبان دانتوں میں داب لی۔ بھلا پہلے ایسا کب ہوا تھا۔

جہانگیر خان اس خبر پر بھرے بیٹھے تھے۔ ایسے میں دلاور جہانگیر نے باپ کی غیر موجودگی میں سکندر خان کو مصالحت کرنے کے لیے بلاوا بھیجا۔ اس نے یہی سوچا تھا کہ وہ ہر مہینے اس کے حصے کے عوض منافع کی رقم اس کے ہاتھ پر رکھ دیا کرے گا۔ یوں یہ معاملہ سلجھ جائے گا۔ سکندر بڑی مشکلوں سے اس ملاقات کے لیے راضی ہوا تھا حالانکہ اس کی بیوی اسے روکتی رہی تھی۔ اسے جہانگیر خان کے گھرانے سے کسی اچھائی کی امید نہ تھی۔ برا تب ہوا جب

Digitized by Google

زمینوں کا دورہ کرتے جہانگیر خان کو سکندر خان کی اپنے ڈیرے پر موجودگی کا علم ہوا۔ غصے میں کھولتے ہوئے وہ وہاں پہنچے تھے۔

سکندر پہلے ہی دلاور کی پیش کش پر راضی نہیں تھا ایسے میں جہانگیر خان کا وہاں آنا اور بھڑکنا اس کے اندر کے غصے کو بھی ہوا دے گیا تھا اور اسی لڑائی جھگڑے میں جہانگیر خان سے گولی چل گئی اور ان کا اکلوتا بھتیجا موت کے گھاٹ اتر گیا۔ یہ گاؤں جہانگیر خان کا تھا۔ یہاں اس کی حکمرانی تھی اسی لیے یہ بات دبا دی گئی۔ اس کے سالوں کو بھی کچھ دے دلا کر خاموش کرا دیا گیا۔ مگر سارے میں یہ بات پھیل گئی کہ دلاور خان نے اپنے چچازاد کو ڈیرے پر بلایا جہاں سے وہ زندہ واپس نہ جا سکا۔ اس ساری صورت حال سے دلاور خاصا دل برداشتہ تھا۔ اس نے مستقل طور پر شہر منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ جاتے جاتے اس نے سکندر کی بیوہ اور بیٹے سے ملنے کی کوشش کی مگر وہ اس سے ملنے پر راضی نہ ہوئے تو وہ خاموشی سے گاؤں چھوڑ گیا۔

☆☆☆

سلاخوں کے پیچھے کھڑا شخص اپنے عام سے حلیے میں یکسر مختلف نظر آ رہا تھا۔ ہمیشہ ٹک سک سے تیار رہنے والا فاران سکندر، اپنی شاندار شخصیت اور ڈریسنگ کی بدولت ہی تو اپنے حلقے میں مقبول رہا تھا۔ مگر اب ...... اس نے سر جھٹک کر پچھلی باتوں کو ذہن سے جھٹکا۔

"اب تو تم جان ہی چکے ہو نا کہ میرا باپ تمہارے باپ کا قاتل نہیں تھا۔ پھر میرے ساتھ کی گئی زیادتی کو کس خانے میں فٹ کرو گے فاران سکندر۔" نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز کیے وہ ضبط سے بولی، حلق میں کچھ اٹک گیا تھا۔

"میرا باپ بچپن میں مر گیا تھا۔ میری ماں اپنے بھائیوں کے ساتھ رہنے پر مجبور ہو گئی تھی۔" وہ اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔

"ماموں نے ہماری ساری زمینوں پر قبضہ کر لیا تھا اور تب بھی ہماری حیثیت وہاں گھر کے افراد جیسی نہیں تھی۔ ماموں کی تلخ باتیں اور کھا جانے والی نظریں ایسی ہوتی تھیں گویا ہم ان کے خرچے پر پڑے ہوں۔ میری ماں روتی بلکتی، کوسا کرتی اس شخص کو جس نے میرے باپ کو موت کی نیند سلا دیا اور وہ ہمیں تنہا چھوڑ گیا۔ بس اسی روز سے نفرت ہو گئی تھی مجھے دلاور جہانگیر سے اور اس کی خوشیوں سے۔

بڑے ہو کر میں اپنے ماموں سے اپنا حق لینے میں کامیاب تو ہو گیا مگر وہ نفرت جس کا بیج میری ماں نے میرے دل میں بویا تھا، وہ بھی پل کر جوان ہو گئی۔ مرتے وقت بھی اس کی یہی آرزو تھی کہ میں دلاور جہانگیر اور اس کے خاندان کو اس کے انجام تک پہنچاؤں۔" یکدم اس پر نگاہ ڈالی۔

"اور تم انزا دلاور اسی خاندان کا حصہ ہو جسے میں برباد کر دینا چاہتا تھا۔" اس کا لہجہ سخت ہوا۔

"تم اگر ایک بار کہہ دیتے کہ میرے ساتھ کی زیادتی پر تمہیں افسوس ہے تو میں ابھی اسی وقت اپنا کیس واپس لے لیتی۔ اب یہ رشتہ تو میں قائم نہیں رکھ سکتی مگر معاف کرنے کا ظرف ضرور ہے۔ لیکن تم فاران......" اس نے اس بے حس انسان کو دیکھا جسے کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔

"مجھے تمہاری بھیک نہیں چاہیے۔ مجھے اپنے باپ کے قتل کا انتقام لینا تھا جو میں نہیں لے سکا۔ بس اس بات کا افسوس رہے گا۔" اس نے منہ موڑا۔

"انتقام، ہاں اس انتقام کی آگ میں ہی تو سلگ رہے ہو تم۔ مگر سچ یہ ہے کہ تمہاری ماں نے تمہیں اس آگ میں جھونک کر تم پر ظلم کیا ہے۔ تبھی تو تم اتنے بے حس ہو گئے ہو کہ تمہارے اندر کی انسانیت مر گئی ہے۔" اپنی آنکھوں میں آئی نمی کو اس نے بے دردی سے ہتھیلی سے رگڑا۔

"چلی جاؤ یہاں سے۔ اپنی خوش قسمتی کے جشن مناؤ۔ آج تو یوں بھی ہماری ڈائیورس فائنل ہو جائے گی پھر تم آزاد ہو گی۔" اس نے اسے نہیں دیکھا تھا لیکن اس نے آگے بڑھنے سے پہلے اس پر ایک تاسف بھری نگاہ ضرور ڈالی تھی۔ انتقام کے نام

Digitized by Google

پر اسے برباد کر دینے کی خواہش رکھنے والا آج خود بربادی کے دہانے پر کھڑا تھا۔

☆☆☆

سوچنا جتنا آسان ہوتا ہے، کبھی کبھی وہ سب اپنی زبان سے ادا کرنا اتنا ہی مشکل لگنے لگتا ہے۔ وہاں بیٹھے ڈرائنگ روم کے در و دیوار کو گھورتے اس نے بارہا سوچا تھا۔

''انکل کب تک آئیں گے؟'' چائے کی خالی پیالی میز پر رکھتے اس نے سامنے بیٹھی انزا سے پوچھا۔

''ایک گھنٹے تک آجائیں گے۔''

''میں چلتا ہوں، مجھے یہاں سے ڈیوٹی پر جانا ہے۔'' وہ عجلت میں اٹھ کر باہر نکلا۔ وہ اس کے پیچھے آئی۔

''ولی۔'' اس کے پکارنے پر وہ مڑا۔

''اس روز ریسٹورنٹ میں تم کوئی بات کرنا چاہ رہے تھے۔ وہ کیا بات تھی۔'' اپنی جھجک چھپاتے انزا نے پوچھا۔

وہ دو قدم اس کی جانب بڑھا۔ انزا کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئیں۔ وہ یقیناً وہ بات کہنے والا تھا جس کا وہ چار مہینوں سے انتظار کر رہی تھی۔ اپنی بات کہہ دینے کا ارادہ کرتے ولی کی نگاہیں بے اختیار اس کے شان دار گھر پر پڑیں۔ اس محل نما گھر میں ـــــ کھڑی وہ اسے کوئی شہزادی ہی لگ رہی تھی۔ اس نے تھوک نگلا، دل کو ایک تسلی دی اور جب بولا تو لہجہ سرسری تھا۔

''مجھے یاد نہیں۔ شاید اتنی اہم بات نہیں تھی۔'' وہ بے وجہ مسکرایا اور یہ دیکھ نہیں پایا کہ سامنے کھڑی لڑکی کی آنکھیں کیسے ماند پڑی تھیں۔ وہ جانے کے لیے مڑ گیا اور وہ وہیں کھڑی اس راستے کو دیکھتی رہی جہاں سے وہ نظروں سے اوجھل ہوا تھا۔

کیا کچھ لوگ اتنی آسانی سے آپ کی زندگی کی کہانی سے غائب ہو جاتے ہیں کہ اہم کردار ہوتے ہوئے بھی محض ثانوی کردار لگنے لگتے ہیں؟

☆☆☆

سفری بیگ کاندھے پر ڈالتا وہ مال روڈ پر اترا تھا۔ پچھلے کچھ دنوں کی مصروفیت کی وجہ سے وہ خاصا تھکا ہوا تھا پر یہاں آنے کی خوشی اس تھکن پر حاوی تھی۔ ٹھنڈی نم ہوا نے چہرے کو چھوا تو ایک خوش گواریت کا احساس رگ و پے میں سرایت کر گیا۔

پندرہ منٹ کی واک کے بعد وہ مطلوبہ گیسٹ ہاؤس کے سامنے موجود تھا جسے دیکھ کر لب خود بخود مسکرا اٹھے۔ دروازے سے ایک شادی شدہ جوڑا باہر نکل رہا تھا جن کے ساتھ دو بچے ہاتھ تھامے، خوشی سے اچھلتے باہر آرہے تھے۔ اس کی مسکراتی آنکھوں نے دور تک ان کا پیچھا کیا۔ یہ اگست کا مہینہ تھا اور ان دنوں عموماً بارش ہی رہتا تھا۔ اس کے قدم اندر کی جانب بڑھ گئے۔ انٹرنس پر بیٹھے وہ رجسٹر دیکھ رہے تھے۔ وہ قریب جا کر کھنکھارا تو چونکے۔

''سرپرائز۔'' ان کی حیرانی پر وہ مسکرایا۔

''سرپرائز کے بچے، چار مہینوں بعد شکل دکھا رہے ہو۔'' اس پر بگڑتے ہوئے انہوں نے اٹھ کر اسے گلے لگایا۔ باپ کے سینے سے لگ کر اس کے وجود میں گویا جان پڑ گئی تھی۔

''آپ کی دلی خواہش پوری کر کے آرہا ہوں۔ سی ایس ایس کا امتحان دے دیا ہے۔ اب بتائیے کیا حکم ہے۔'' ان سے الگ ہوتا وہ بولا۔

''اب تم سیدھے گھر جاؤ کیونکہ تمہاری بی بی جان اور بیوی دونوں سخت ناراض ہیں۔ تمہارے کل کے فون کی وجہ سے ناک تک بھری بیٹھی ہیں۔'' اسے صورت حال سے آگاہ کرتے وہ مسکرائے تو وہ سر ہلاتا ریسٹ ہاؤس کے عقبی دروازے کی جانب آگیا جس سے نکلتے ہی سامنے ان کا پورشن تھا۔ اس پورشن کا ایک راستہ ریسٹ ہاؤس کے بائیں جانب سے بھی نکلتا تھا۔ اندرونی دروازے سے اندر گھستے ہی خوشبوؤں کا ریلہ سا ناک سے ٹکرایا، سامنے ہی تو چھوٹا سا اوپن ایئر کچن تھا۔ چولہے پر رکھے فرائنگ پین سے شوشو کی آوازیں آرہی تھیں شاید کباب فرائی ہو رہے تھے، ساتھ پلاؤ کی مخصوص خوشبو تھی۔ اسے

Google

اپنی بھوک بڑھتی محسوس ہوئی۔ کتنے عرصے سے اس نے گھر کا کھانا نہیں کھایا تھا۔
کمرے سے نکلتی وہ اپنے دھیان میں آ رہی تھی۔ اس پر نگاہ پڑی تو آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے اپنا سفری بیگ نیچے رکھا۔ دوسرے لمحے اس کیفیت سے نکلتی وہ ناراض سی کاؤنٹر کی جانب بڑھی۔ اور جب بولی تو خفگی صاف ظاہر تھی۔
''آ گیا خیال گھر آنے کا۔''
''ہم نے بڑوں سے سنا تھا۔ اچھی بیویاں گھر آئے شوہر کا مسکرا کر استقبال کرتی ہیں، انہیں کھانے پینے کا پوچھتی ہیں۔'' کاؤنٹر پر دونوں ہاتھ رکھے، شرارت سے لب دانتوں میں دبائے وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
''وہ سلوک اچھے شوہروں سے کیا جاتا ہے۔ جو مہینوں شکل نہ دکھائیں انہیں لفٹ نہیں کرانی چاہیے۔'' وہ کباب پلٹتے ہوئے بولی۔
''تم ہی تو کہتی تھیں بس پڑھائی پر توجہ دیں، یہاں کی فکر نہ کریں۔''
''ہاں تو یہ تو نہیں کہا تھا کہ بالکل ہی بھول جائیں اور کل تو کہہ رہے تھے اب مزید ایک مہینے بعد آؤں گا۔'' اس نے بھڑاس نکالی، سارا غصہ تو کل والی بات کا تھا۔
''مذاق کر رہا تھا۔ کیا اب اس کی معافی بھی نہیں ملے گی۔''
''ہرگز نہیں۔ میں اور میرا بیٹا تو معاف نہیں کریں گے۔'' وہ ہنوز ناراضی سے بولی۔
''ارے واہ، یونہی میرے بیٹے پر الزام لگایا جا رہا ہے۔'' بولتا ہوا وہ کمرے کی جانب بڑھا، پہلے بی بی جان کے کمرے میں جھانکا۔ وہ نماز پڑھ رہی تھیں پھر اپنے کمرے میں گھس گیا۔ اس کا ارادہ بھانپتی وہ بھی پیچھے آئی۔
''اچھا بعد میں مل لینا نا، ابھی سو رہا ہے۔'' اس نے روکنا چاہا مگر وہ پہلے ہی اپنے آٹھ ماہ کے بچے کو گود میں لے چکا تھا جو اب اس کی گود میں کسمسا رہا تھا۔
''یہ تو اپنے بابا کو لفٹ کروائے گا۔'' بے اختیار اسے چوما۔
''ولی۔'' اس نے اس کی گود سے بچہ لے لیا اور اسے بستر پر لٹا کر تھپکنے لگی۔
''پیپر کیسا رہا۔'' اب کی بار مسکرا کر دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
''ہو تو اچھا گیا۔'' پھر اسے اٹھتے دیکھ کر پکارا۔
''انزا۔'' وہ رک گئی، منتظر نگاہوں سے اسے دیکھا۔
''اگر میں امتحان پاس نہ کر سکا۔''
''تو کوئی بات نہیں۔ اچھا ہے بابا کے ساتھ گیسٹ ہاؤس دیکھیے گا۔ میں تو پاپا کو بھی کہتی رہتی ہوں مری شفٹ ہو جائیں۔'' وہ خوش گوار موڈ میں بولی تو وہ سرشار سا مسکرا دیا۔ اس کے لیے وہ زندگی کا سب سے بڑا انعام تھی جس نے اسے ویسے ہی قبول کیا تھا جیسا وہ تھا۔ اپنے ساتھ وہ کچھ بھی لے کر نہیں آئی تھی سوائے اعتماد کے، جس کی اسے سب سے زیادہ ضرورت تھی۔
''انزا دلا ور اگر تم میری زندگی میں نہ ہوتیں تو اس زندگی میں کوئی رنگ نہ ہوتا۔'' اس کا ہاتھ تھام کر وہ جذب سے بولا۔ وہ اکثر یونہی اظہار کر جاتا تھا۔ وہ جھینپ کر مسکرائی۔ دو سال پہلے اگر وہ خود سے اس کی جانب نہ بڑھتی تو شاید آج زندگی اتنی مکمل اور خوب صورت نہ ہوتی۔ اس کے پروپوز کرنے پر وہ دنگ رہ گیا تھا، وہ اپنے اور اس کے اسٹیٹس کی وجہ سے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ جبکہ سچ تو یہ تھا کہ وہ جس ٹراما سے گزری تھی، اب اس کے لیے باقی سب چیزیں بے معنی ہو کر رہ گئی تھیں۔ بس ایک پرخلوص اور چاہنے والے ساتھ کی ضرورت تھی، اس وفاداری کی چاہ تھی جو اس کے لیے ہو اور ولی کمال کے بھرپور ساتھ نے اس کے دل کی ساری خواہشات کو پورا کر دیا تھا۔



ماہرہ ریحان

لو میرج

چائے کے لوازمات ختم ہوئے تو لڑکی کو ایک بار پھر بلائے جانے کا اصرار ہونے لگا...... جس کا مطلب یہی تھا کہ لڑکے کی ماں نے لڑکی کے ہاتھ پر کچھ رکھ کر اسے اپنے بیٹے سے منسوب کر لینے کا فیصلہ کر لیا تھا...... نفیسہ کو یہ سوچ کر ہی خوشی ہونے لگی...... اپنی بیٹی کی خوب صورتی، ذہانت اور اچھے قد کاٹھ پر انہیں ویسے تو فخر تھا مگر اس بار رشتے کے لیے آنے والا لڑکا بھی کچھ کم پروقار، کامیاب اور لائق نہ تھا پھر جو ٹھاٹ باٹ اور سسرال کا سکھ وہ اپنی بیٹی کے لیے چاہتی تھیں، اچھی طرح جانتی تھیں کہ اسی گھر سے مل سکے گا۔

نفیسہ دل ہی دل میں لڑکے کو اپنی بیٹی کے ساتھ کھڑا دیکھ کے خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھیں...... گو وہ جانتی تھیں کہ یقیناً سعدیہ بھی ڈرائنگ روم کے اندرونی دروازے سے ملحق چھوٹی سی راہ داری میں کھڑی مہمانوں کی باتوں پر کان دھرے سب کچھ تو سن ہی رہی ہوگی پھر بھی انہوں نے مہمانوں سے خوش دلی سے معذرت کر کے سعدیہ کو بلانے کے لیے اندر جانے کی اجازت چاہی کہ اچانک لڑکے نے سنجیدگی سے ہاتھ کے اشارے سے انہیں اٹھنے سے روکا...... نفیسہ نے لڑکے کی ماں کو حیرت سے دیکھا جو ان کی ہی طرح غور سے اپنے بیٹے کو دیکھ رہی تھیں۔

"اب آپ سب خاموشی اور تحمل سے میری بات سنیں۔" لڑکے نے دو ٹوک اعلان کی صورت اونچی آواز میں کہا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ سعدیہ بھی اسے سن رہی ہوگی۔

"میں آپ کی بیٹی سے شادی نہیں کروں گا...... میں آپ کی بیٹی سے شادی کرنا، آپ کے گھر سے کسی بھی قسم کا رشتہ جوڑنا...... اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ لہٰذا۔"

لڑکے کے منہ سے نکلا ہی تھا کہ نفیسہ سے پہلے لڑکے کی ماں نے اسے ڈانٹنا شروع کر دیا...... یہاں تک کہ ان کے ساتھ بڑی مشکلوں سے چل کر آئی ہوئی لڑکے کی دادی ماں بھی اپنی بہو (لڑکے کی ماں) کی ہاں میں ہاں ملانے لگیں۔

مگر لڑکا جو ابھی تک اپنی ماں اور دادی ماں کی باتوں کے دوران نظریں جھکائے بہت ہی مہذب انداز میں بیٹھا ہوا تھا، اچانک ایک بپھرا ہوا زخم کھایا ہوا شیر بن گیا...... وہ اپنی ماں اور دادی ماں کی باتوں کی پروا نہ کرتے ہوئے ایک بار پھر نفیسہ صاحبہ سے گویا ہوا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے چچی جان! میں سب بھول گیا ہوں؟ جو آپ نے دادی ماں کے ساتھ کیا، جو آپ نے میری ماں کے ساتھ کیا اور سب سے بڑی بات جو آپ نے میرے بابا اور چچا جان کے ساتھ کیا؟ کیسی محبت، کیسی الفت تھی بابا اور چچا جان کے درمیان؟ زمانہ مثالیں دیتا تھا کہ دو بھائی ایک جان ہیں۔ چچا جان مجھے اپنے کندھوں پر بٹھا کر اسکول لے کر جاتے تھے...... میرے ساتھ کھیلتے تھے...... میرے پکے دوست تھے...... امی جان کی عزت چچا جان کی آنکھوں سے ٹپکتی تھی...... ان کے ہر کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔

کتنی ہی بار بابا کام کی مصروفیت کے باعث چچا جان کو پورا گھر بار سونپ کر ملک سے باہر سدھارے



اور پیچھے چچا جان نے ہمیں کبھی سربراہ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی...... دادی ماں اپنے دونوں بیٹوں کی آپس میں ایسی والہانہ محبت دیکھ کر دعائیں دیتی نہ تھکتی تھیں۔

ہمارا گھر امن کا گہوارہ اور سکون کا آشیانہ تھا...... اور پھر...... پھر آپ...... چچی جان آپ نے ہمارے گھر میں قدم رنجہ فرمایا اور آپ کے آتے ساتھ ہی چچا جان جو اپنی ماں...... میری دادی ماں کے سامنے اونچی آواز میں بات نہیں کرتے تھے، باقاعدہ ان سے جھگڑنے لگے...... میری ماں کو غربت کا طعنہ دینے لگے...... مجھ سے متنفر ہوئے اور پھر...... ہمیں اپنا ہی گھر چھوڑ کر الگ مکان میں رہنے پر مجبور کر دیا گیا...... کبھی پلٹ کر بھی نہ پوچھا کہ ہم جیتے بھی ہیں یا مر گئے؟ کتنی آسانی سے اپنا کیا بھول بھال کر آپ نے مجھ سے اپنی بیٹی کا نام جوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے کیونکہ اب میں آپ کی حیثیت سے کہیں بڑھ کر ہوں...... کیوں؟ مگر معاف کیجیے گا...... میں نے اپنی حیثیت فقط آپ کی بیٹی کو اپنانے کے لیے نہیں بنائی...... اور پھر کیا معلوم آپ کی بیٹی بھی ہمارے ہنستے بستے گھر میں ویسے ہی ناچاقی کے بیج بوئے جو آپ نے ہمارے بڑوں کے درمیان بوئے اور جس کا پھل اب آپ کو کھانا ہی پڑے گا...... کبھی آپ کو ہم سے ملنے میں توہین محسوس ہوتی تھی، اب میں آپ کے گھر میں آنا تو کیا آپ کے گھر کے پاس سے گزرنے کو بھی اپنی توہین سمجھتا ہوں......!"

نفیسہ کو یہاں تک تو یاد تھا۔ شاید انہیں لڑکے کی ہی کہی تلخ باتیں یاد رہیں۔ اس کے بعد ابتری میں اٹھ کر لڑکے کے چلے جانے پر اس کی ماں اور دادی ماں نے نفیسہ کو کس طرح کے دلاسے دیے کس طرح ہمت بندھائی انہیں کچھ یاد آتا اور پھر بھول جاتا......

☆☆☆

"توہین؟"

نفیسہ نے اس کے بعد کئی بار یہ لفظ دل ہی دل میں دہرایا...... جب اپنی پیاری نازوں پلی بیٹی سعدیہ کے اترے ہوئے چہرے پر نظر پڑی تو اس لفظ کی تلخی اور گہری ہو جاتی...... کیسا توہین آمیز لفظ استعمال کر گیا وہ لڑکا اور کس قدر توہین کر گیا ان کی، ان کی بیٹی کی، ان کے غرور اور فخر کو کیسا توہین آمیز جھٹکا لگا گیا...... کیا واقعی جو بیج انہوں نے آج تک بوئے ان کے پھل کاٹنے کا وقت آ چلا تھا؟

مکافاتِ عمل اپنا رنگ دکھانے آ چکا تھا؟ مگر یہ وقت تو بہت پہلے سے آ چکا تھا...... نفیسہ کی زندگی تو اسی دن سے تلخ ہو گئی تھی جب ان کے شوہر کا دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا تھا۔ اس وقت ان کی بڑی بیٹی سعدیہ ہی اس قابل تھی جو اپنے باپ کی جگہ ان کے کاروبار کو سنبھالنے کی کوششوں میں جت گئی تھی مگر وہ ایک کم عمر لڑکی ہی تھی۔ ایسے میں کاروبار اور آفس میں آنے والے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے مردوں کی چالوں سے آئے دن ان کے کاروبار کو نقصان پر نقصان ہوتا رہتا تھا۔ نفیسہ کو اب احساس ہوتا تھا کہ جن سگے رشتوں کو انہوں نے غریب اور کمتر سمجھ کر بڑی نخوت اور غرور سے پیچھے چھوڑا تھا، ایسے وقت میں ان کے کس قدر کام آ سکتے تھے۔

"تم فکر نہیں کرو نفیسہ...... بچہ سمجھ کر معاف کر دو...... میں سمجھاؤں گی...... سعدیہ میری بیٹی ہے میرے ہی گھر جائے گی...... تم تنہا نہیں ہو...... نفیسہ ہمت سے کام لینا...... میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مجھے چند دن دے دو...... پھر آؤں گی...... جلال کو بھی ساتھ لاؤں گی...... ہمت کرو۔"

لڑکے کی ماں یعنی ان کی جٹھانی زبیدہ بھابھی نے کتنی ہی بار ان کو دلاسا دیا تھا جبکہ لڑکے کی دادی ماں یعنی ان کی ساس صاحبہ اپنی آنکھوں پر دوپٹہ رکھے بے بسی سے آنسو ہی پونچھتی رہیں...... ان کو اس حالت میں دیکھ کر نفیسہ کو جھرجھری آ گئی...... ساس صاحبہ بالکل ویسی ہی لگ رہی تھیں جب وہ آخری بار اپنا آبائی گھر جس پر ان کے چھوٹے بیٹے کا یعنی نفیسہ

Google

کے شوہر کا قبضہ تھا چھوڑ کر اپنے بڑے بیٹے کے کرائے کے مکان پر جانے کی تیاری کر رہی تھیں ...... مگر اس وقت نفیسہ کو اپنی ساس پر ذرا بھی رحم نہیں آیا تھا۔

"جاتی ہیں تو جائیں اور غربت میں دھکے کھائیں ...... بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔"

نفیسہ نے نخوت سے سوچ کر اپنے کمرے کی راہ لی تھی ...... بات بہت چھوٹی سی تھی مگر ساس صاحبہ نے رائی کا پہاڑ بنا دیا تھا ...... اتنی ہی سی تو بات تھی کہ نفیسہ کے شوہر نے اپنے آبائی گھر پر پہلی بار اپنا حق جمایا تھا۔ پہلی بار انہوں نے نفیسہ کے ساتھ مل کر اپنے گھر کو بچانے کی کوشش کی تھی ...... کون نہیں کرتا اپنا گھر بچانے کی کوشش ...... اگر انہوں نے بھی کی تو کیا گناہ کیا؟ حالانکہ شادی کے شروع کے دنوں میں دونوں میاں بیوی نے اپنی ماں کو اسی طرح گھر کی مالکن کی حیثیت دے رکھی تھی مگر جب نفیسہ اپنی جٹھانی کے تین بچوں کی بھاگم دوڑ، گھر کے ہر حصے پر اجارہ داری اور مشترکہ باورچی خانے کے باعث راشن سے ان بچوں کے لیے نت نئے پکوانوں سے تنگ ہونے لگیں تو انہوں نے اشارے کنائے میں کئی بار زبیدہ بھابھی کو احساس دلانا شروع کر دیا تھا کہ یہ ٹھاٹ باٹ صرف نفیسہ کو ہی زیب دیتے ہیں۔

کیونکہ یہ بات بالکل واضح تھی کہ گو زبیدہ کے شوہر دبئی میں کام کرتے تھے مگر آخر وہ تھے تو ایک معمولی مزدور ...... ان کی آمدنی اتنی کہاں تھی کہ زبیدہ بھابھی اپنے بچوں کو انگلش میڈیم اسکول بھیجیں ...... سونے کا نوالہ کھلائیں اور رہائش کے لیے اتنا بڑا گھر بھی دے سکیں ...... زبیدہ کے شوہر تو اپنی تنخواہ سے اس بڑے سے گھر کا بجلی کا بل بھی بھر لیں تو بڑی بات تھی ...... ایسے میں نفیسہ خوب اچھی طرح سمجھتی تھیں کہ یہ جو دن رات کے ٹھاٹ باٹ ہیں وہ صرف ان کے شوہر کی کمائی کے مرہون منت ہیں۔ ایسے میں زبیدہ بھی دنیاداری کے لیے ہر وقت گھر کے کاموں میں لگی رہتیں ...... ساس صاحبہ کے آرام کی خاطر خود کو گھلائے رکھتیں ...... یہاں تک کہ نفیسہ کو بھی کسی کام میں ہاتھ بٹانے کو نہیں کہتیں تو اصل میں یہ ان کی چال ہی تھی۔ شروع دن سے ہی نفیسہ صاحبہ کو زبیدہ بھابھی کی چالاکیوں کا اندازہ ہونے لگا تھا۔

وہ ایک طرف نفیسہ کو گھر کے ہر کام سے الگ رکھتیں، دوسری طرف خود کو پیش پیش رکھ کر پورے خاندان میں اپنی محنت اور صبر کا پرچار کرتی رہتیں ...... تب ہی تو ہر آنے والا مہمان آتے ساتھ ہی سب سے پہلے زبیدہ کا پوچھتا ...... وہ اگر کام میں کہیں مصروف ہوتیں اور مہمان کے سامنے دیر سے آتیں تو الٹا زبیدہ بھابھی کو ہی عزت ملتی کہ بے چاری گھر کے کاموں سے فرصت نہیں پاتیں ...... یہاں تک کہ ساس صاحبہ بھی جب تک زبیدہ میز پر نہ آ جاتیں، کھانے کو ہاتھ نہیں لگاتی تھیں ...... تب ہی دونوں ساس بہو اکثر سب کے کھانا کھا چکنے کے بعد مل کر کھانا کھاتیں ...... نفیسہ کو اپنی ساس صاحبہ سے یہی گلہ تھا۔ وہ اپنے بڑے بیٹے اور بہو پر اتنا واری صدقے جاتی تھیں کہ جب نفیسہ نے زبیدہ کو گھر چھوڑنے کا حکم سنایا تو وہ تو خاموشی سے سہہ گئیں مگر ساس صاحبہ نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

"یہ تو ایسے واویلا مچا رہی ہیں جیسے میں نے زبیدہ بھابھی کو یہ گھر نہیں دنیا چھوڑ دینے کا کہہ دیا ہو؟" نفیسہ کو اچھی طرح یاد تھا کہ انہوں نے اپنی ساس صاحبہ کے ہنگامے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بس اتنا ہی سوچا تھا ...... ساس صاحبہ کا کہنا تھا کہ نفیسہ کے شوہر کو پڑھانے لکھانے اور اس مقام تک پہنچانے میں ان کے بڑے بیٹے اور بہو کا ہاتھ ہے ...... کیونکہ والد تو دونوں بھائیوں کے بچپن میں ہی انتقال کر گئے تھے۔ ایک مکان کے سوا وہ دے کر ہی کیا گئے تھے۔ ایسے میں بڑے بھائی نے اپنی پڑھائی چھوڑ کر گھر کی ذمہ داری اٹھائی اور اپنے چھوٹے بھائی کو پڑھایا لکھایا کہ وہ اچھا کما کھا سکے۔

جب کہ بڑے بھائی نے اپنے روشن مستقبل کو

Google

پس پشت ڈال کر اپنے چھوٹے بھائی کے لیے قربانی دی تو اب چھوٹے بھائی کا بھی فرض تھا کہ اتنا نہ سہی مگر تھوڑا بہت تو اپنے بڑے بھائی کے بال بچوں کا بوجھ اٹھالے۔ نفیسہ خود بھی مشترکہ خاندان سے آئی تھیں اور اچھی طرح جانتی تھیں کہ مشترکہ خاندان میں ہر اکائی ایک جیسی آمدنی نہیں لاتی مگر پھر بھی ایک جیسا کھاتی پیتی ہے۔

نفیسہ کی نظر میں مشترکہ خاندان کی ایک یہی برائی ہے کہ کوئی اگر زیادہ کماتا ہے تو صرف اس وجہ سے سارا خود پر خرچ نہیں کر پاتا کہ دوسروں کی دل آزاری ہوگی اور کم کمانے والا طفیلیہ بن کر مزے سے ان تمام سہولتوں کو پالیتا ہے، جس کے حصول کا اکیلے رہ کر وہ تصور بھی نہیں کر سکتا...... اس نظریے سے نفیسہ اور ان کے شوہر یعنی کہ چھوٹے بھائی مسلسل گھاٹے میں تھے اور زبیدہ بھابھی اور ان کے بچے مزے کر رہے تھے...... وہ دل میں طے کیے بیٹھی تھیں کہ اپنے شوہر کی کمائی کو اس طرح لوٹ کا مال سمجھنے والوں کو ایک دن خود سے دور کر دیں گی اور یہ کام ان کو اس وقت بہت آسان لگنے لگا جب شادی کے چند مہینوں بعد اپنے شوہر کی الماریوں کو کھنگالنے پر نفیسہ صاحبہ کے ہاتھ ایک اسٹامپ پیپر لگا۔

یہ مکان جو کہنے کو آبائی مکان تھا اور جو دونوں بھائیوں کی برابری کی ملکیت سمجھا جاتا تھا، دراصل بڑے بھائی نے اپنے چھوٹے بھائی کے نام کر دیا تھا...... یہ بات بعد میں کھلی تھی کہ اس میں بھی زبیدہ بھابھی کا ہی ہاتھ تھا...... کئی سال پہلے ان کے شوہر دبئی میں ایک حادثے کا شکار ہو کر ہسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش میں پڑے تھے اور ان کے پاس علاج کے پیسے نہیں تھے، جس پر چھوٹے بھائی نے اپنی کئی سالوں کی جمع شدہ کمائی اور کچھ ادھار اکٹھا کر کے بڑے بھائی کے علاج پر لگائے...... اور اللہ اللہ کر کے کئی مہینوں کے بعد بڑے بھائی دوبارہ کمانے کے لائق ہو سکے تھے...... ایسے میں سب کچھ معمول کے مطابق چلنے لگا تھا مگر زبیدہ بھابھی کو یہ بات ستانے لگی کہ ان کے شوہر نے اپنے چھوٹے بھائی سے اتنی بڑی رقم لے تو لی ہے واپس کیسے کریں گے...... لہٰذا انہوں نے ساس صاحبہ اور شوہر کو سمجھایا۔ یوں بڑے بھائی نے آبائی مکان سے اپنے حصے کا اپنے چھوٹے بھائی کے حق میں دستبرداری کا اسٹامپ پیپر بھجوا دیا تھا جو کہ چھوڑے بھائی نے لاپروائی سے اپنی کسی الماری میں رکھ دیا تھا۔

اسٹامپ پیپر نے نفیسہ کو زمین سے آسمان پر چڑھا دیا تھا...... وہ بات جو نفیسہ صاحبہ پہلے زبیدہ بھابھی اور ساس صاحبہ سے کہتے ڈرتی تھیں اب ڈنکے کی چوٹ پر کہنے لگیں...... ان کی روز روز کی سکھائی پڑھائی نے چھوٹے بھائی کی نظر میں زبیدہ بھابھی جس سے ان کو بڑی بہنوں جیسا پیار تھا اور جن کے ساتھ ان کا لاڈ پیار چھوٹے بھائیوں جیسا تھا برا بنا دیا تھا...... بڑے بھائی کے بچوں سے ان کو بیر ہونے لگا اور حد اس وقت ہوگئی، جب نفیسہ کے اپنے ہاں اولاد کی خوش خبری آئی...... بڑے بھائی تو بعد میں منظر پر ظاہر ہوئے، زبیدہ بھابھی اپنے شوہر کے آنے سے پہلے ہی ایک کم درجے کے علاقے میں مناسب کرائے کا مکان لے کر ہجرت کر گئیں...... بڑے بھائی نے چند دن ملک میں رہ کر چھوٹے بھائی کو سمجھانا چاہا مگر چھوٹے بھائی اس وقت تک اپنے خاندان کے پھیلنے اور کام میں اس قدر مصروف ہو چکے تھے کہ کچھ سنتے بھی تھے تو یاد رکھنے اور عمل کرنے کا وقت نہ پاتے...... اس وقت ساس صاحبہ پورے جوش و خروش سے اپنے بڑے بیٹے کی حمایت میں نفیسہ صاحبہ کی ناراضی سے لاپروا اپنے چھوٹے بیٹے کو سمجھاتیں۔

اول تو نفیسہ بیگم اکیلے دونوں ماں بیٹے کو بات کرنے ہی نہ دیتیں اور اگر دیکھ لیتیں کہ شوہر صاحب پر اپنی ماں کی باتوں کا اثر ہونے لگا ہے تو جھٹ کوئی من گھڑت قصہ سنا کر شوہر صاحب کو زبیدہ بھابھی اور بچوں سے متنفر کر دیتیں...... ساس صاحبہ چند دن تو

Google

چھوٹے بیٹے کے ساتھ رہیں مگر جب ان کو یقین ہو گیا کہ ان کے چھوٹے بیٹے کا خون سفید ہو گیا ہے تو اپنا وہ گھر جو ان کو ان کے شوہر نے بنوا کر دیا تھا اور جس میں انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو آپس میں محبت اور امن کے ساتھ پھلتے پھولتے دیکھنے کے سپنے دیکھے تھے، سب بھلا کر اپنے بڑے بیٹے اور بہو کے گھر چلی آئیں...... جن کے دلوں میں انسانیت اور سلوک میں رواداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

چھوٹے بیٹے کو اپنی ماں کا اس طرح ناراض ہو کر چلے جانا برا لگا مگر نفیسہ صاحبہ نے آخری کانٹا اپنی زندگی سے نکلتا دیکھ کر سکون کا سانس لیا اور بھول کر بھی کبھی اپنی ساس صاحبہ کو منانے کے لیے اپنے شوہر کو نہ بھیجا بلکہ اگر کبھی چھوٹے بھائی کو اپنی ماں یا بھائی کی یاد آئی تو نفیسہ صاحبہ اپنے بچوں کے کسی کام یا خاندان میں کسی تقریب کا بہانہ کر کے بڑے بھائی کے گھر جانے سے انکار کر دیتیں...... دوسری طرف مشترکہ ملنے ملانے اور رشتہ داروں میں یہ کہتی پھرتیں کہ ایک مزدور آدمی کے چھوٹے سے کرائے کے مکان پر جانے سے ان کی توہین ہوتی ہے اور اگر وہ لوگ اتنی ہی محبت رکھتے ہیں تو خود ہی آ کر مل جایا کریں۔

نفیسہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ زبیدہ بھابھی جتنی بھی ملنسار اور روادار ہوں، اپنی عزت پر کبھی آنچ نہیں آنے دیتیں۔ یہ سب باتیں زبیدہ بھابھی کو کسی نہ کسی طرح تو پہنچ ہی جاتی ہوں گی نتیجتاً وہ بھول کر بھی نفیسہ کے گھر کا رخ نہیں کریں گی...... اور زبیدہ بھابھی نے واقعی ایسا ہی کر دکھایا...... بڑے بھائی اور ان کا خاندان چھوٹے بھائی اور ان کے خاندان کی زندگیوں سے کچھ اس طرح نکلا کہ کبھی کسی تقریب میں ملاقات ہو بھی جاتی تو رسمی سلام دعا کے علاوہ بات آگے نہ بڑھتی...... یوں نفیسہ صاحبہ اپنی اجارہ داری قائم کر کے دل ہی دل میں مطمئن اور خوش ہوتی رہیں جب تک بچے چھوٹے تھے اور شوہر حیات تھے۔ زندگی گل و گلزار بنی رہی۔ شوہر صاحب کے انتقال اور پھر اپنی بیٹی کو کاروبار کے سلسلے میں ملنے والے پے در پے دھوکوں نے نفیسہ کی آنکھیں کھول دی تھیں۔

دنیا کی بے رحمی پر کھلی تو ان کو اپنی بے رحمی یاد آنے لگی...... مگر اب وہ پچھتا بھی تو نہیں سکتی تھیں۔ وقت کا گلہ بھی تو نہیں کر سکتی تھیں کیونکہ وقت نے تو ان کو کئی ایک بار پیچھے پلٹ کر دیکھنے اور اپنی غلطیوں کو سدھارنے کا بھرپور موقع دیا تھا۔ جب ان کے شوہر کو پہلی بار دل کی بیماری نے گھیرا تھا، وہ بہت کمزور ہو گئے تھے اور اسی کمزور لمحے میں انہوں نے اپنی ماں اور بڑے بھائی بھابھی سے ملنے کی نفیسہ سے درخواست کی تھی۔ وہ چاہتے تو خود ماں بھائی بھابھی سے مل آتے مگر وہ نفیسہ کو ناراض کرنے سے بھی ڈرتے تھے۔ کئی بار انہوں نے نفیسہ کو منانے کی کوشش کی۔ کئی بار انہوں نے دونوں خاندانوں کے ملاپ کی خواہش کا ڈرتے ڈرتے اظہار کیا مگر ہر بار نفیسہ صاحبہ کی طرف سے اتنی شدت سے ردعمل دکھایا جاتا کہ بات ایک دو جملوں میں ہی نمٹا دی جاتی۔

نفیسہ صبح شام زبیدہ بھابھی کے فون کے انتظار کے دوران بس یہی سوچتی رہتیں اور جب ہر طرف سے خود کو قصور وار دیکھتیں تو رونے لگ جاتیں......

پھر بھی انہیں اطمینان تھا۔ وہ صبر سے زبیدہ بھابھی کی دوبارہ آمد کا انتظار کر رہی تھیں...... وہ جانتی تھیں کہ زبیدہ بھابھی وعدے کی پکی ہیں وہ ضرور اپنے بڑے بیٹے جلال کو منا کر لے آئیں گی۔ اس رشتے کے لیے پہل زبیدہ بھابھی نے ہی کی تھی...... چھوٹے بیٹے کے انتقال کے بعد ساس صاحبہ اکثر نفیسہ کے گھر رہنے آ جاتی تھیں، گو نفیسہ ان کو روکتیں مگر وہ ایک دو دن سے زیادہ نہ رہتیں۔ ایسے میں ساس صاحبہ نے ہی زبیدہ بھابھی کا پیغام نفیسہ کو پہنچایا تھا۔

نفیسہ کو شوہر کے انتقال کے بعد سے جو اپنا اور اپنے خاندان کا وجود بیچ طوفان میں پھنسا محسوس ہونے لگا تھا ایک دم کنارے پر آ لگنے کی امید ہو چلی تھی اور زندگی میں پہلی بار انہوں نے صدق دل سے

Digitized by Google

زبیدہ بھابھی کی ساری اچھائیوں کا کھل کر اعتراف کیا تھا۔ جن کو کبھی وہ چالاک، مکار اور کینہ پروری کا نام دیتی تھیں۔ دراصل ان کی اپنی ہی نیت کا فتور تھا...... وہ جب سے شادی کر کے آئی تھیں زبیدہ بھابھی کے نام کے ڈنکے بجتے دیکھ کر نفیسہ کے دل میں شدید قسم کا حسد بے دار ہوا تھا۔ وہ زبیدہ بھابھی اور ان کے خاندان کو گرانے کے چکر میں اپنا ہی نقصان کر بیٹھی تھیں...... انجانے میں اسی شاخ کو کاٹ بیٹھی تھیں جس پر ان کا اپنا بھی آشیانہ تھا...... مگر اب وہ کھلے دل سے زبیدہ بھابھی کی بڑائی کو تسلیم کر رہی تھیں...... کہاں تو وہ لوگ کرائے کے مکان میں رہتے تھے اور اب تینوں بیٹوں کے بڑے ہونے اور ایک سے ایک کامیابی حاصل کرنے کے بعد تو جیسے زبیدہ بھابھی کی حیثیت نفیسہ سے بھی کہیں بڑھ گئی تھی مگر ابھی بھی ان کے رویے میں رواداری، ملنساری اور خلوص تھا...... نفیسہ کو پورا یقین تھا کہ کچھ بھی ہو زبیدہ بھابھی اپنے دیور کے خاندان کو بکھرنے نہیں دیں گی۔

ایک دن سعدیہ آفس سے لوٹی تو اس کے چہرے کی ویرانی کچھ اور گہری ہو رہی تھی۔ وہ کسی سوچ میں ڈوبی اپنی ماں کے برابر میں آ بیٹھی۔ بے چینی سے نفیسہ نے پہلو بدلا...... وہ سعدیہ کو دلاسہ دینا چاہتی تھیں کہ زبیدہ بھابھی کا آج ہی فون آیا تھا وہ کل دوبارہ جلال کے ساتھ آ رہی ہیں اور اب کی بار وہ بات پکی کر کے ہی جائیں گی۔ چند ہی دنوں کی بات ہے پھر سعدیہ کی تمام مشکلات ختم ہو جائیں گی...... وہ گھر بیٹھے گی اور کاروبار اس کے تایا زاد سنبھال لیں گے۔ ''اس قدر لائق اور سمجھ دار بیٹے ہیں زبیدہ بھابھی کے چاہیں تو چند ہی دنوں میں تمہارے بابا کے کاروبار کو سنبھال کر اسے اور بھی ترقی دے ڈالیں...... پھر زبیدہ بھابھی کی تربیت...... اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ انہوں نے بچوں کے دلوں میں رواداری اور محبت ہی ڈالی ہوگی...... تم وہاں بہت خوش اور مطمئن رہو گی سعدیہ...... میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں۔''

''آپ ان لوگوں کو انکار کر دیجیے امی پلیز۔'' سعدیہ نے بے دلی سے ان کی بات کاٹ کر کہا تو نفیسہ کا دل دہل گیا۔ ''منع کر دوں؟ مگر کیوں؟'' نفیسہ پوچھے بغیر نہ رہ سکیں۔ سعدیہ نے تاسف سے سر ہلایا۔

''کتنی عجیب بات ہے امی کہ آپ مجھ سے پوچھ رہی ہیں...... میں جانتی ہوں تائی جان کو...... وہ لے آئیں گی، منا کر سمجھا بجھا کر اپنے بیٹے کو...... مگر جو توہین وہ آپ کی اور میری کر گیا ہے کیا آپ وہ سب بھول سکتی ہیں؟ ہاں آپ اپنے فائدے کے لیے بھول بھی سکتی ہیں مگر کیا وہ خود بھول سکے گا؟ کیا ہے اس کی نظر میں آپ کی، میری، ہمارے خاندان کی اوقات...... وہ مجھے ''آپ'' سمجھتا ہے۔ امی...... ایسا بیج جس سے ناچاقی کے پودے پھوٹتے ہیں...... وہ اپنی ماں کی بات مان کر شادی بھی کر لے گا مگر ہمیشہ مجھے شک کی نگاہ سے دیکھے گا...... مجھ سے خوف زدہ رہے گا، اپنے خاندان والوں کو مجھ سے بچا کر رکھے گا، وہ مجھے کبھی بھی آپ سے الگ حیثیت نہ دے سکے گا اور میں...... امی میں بھی خود کو آپ سے کبھی الگ نہ کر سکوں گی، میں خود بھی نہیں جانتی، کیا معلوم میں بھی آپ کی ہی طرح اس خاندان میں اپنے سے بہتر کسی اور کو دیکھ کر جلن و حسد کے سمندر میں جا گروں...... کیا معلوم میں آپ کی ہی طرح ہنستے بستے امن کے گہوارے کو توڑ ڈالوں...... امی آپ نے حسد کے جو بیج بوئے ان سے پھوٹے کچھ بیل بوٹے آپ کے تمام بچوں میں بھی سرایت کر گئے ہیں۔ ان بیل بوٹوں نے دوسروں کو تو وقتی نقصان پہنچایا مگر ہمیں...... آپ کے اپنے خاندان کو عمر بھر کا روگ لگا دیا ہے امی...... آپ نہیں جانتیں ہم سب یا ہم میں سے کچھ انجانے میں آپ کے ہی نقش قدم پر چل کر ساری عمر خود کو اور اپنے چاہنے والوں کو نقصان دیتے رہیں گے اور جلال ٹھیک کہہ گیا ہے...... آپ کے بوئے ناچاقی کے بیجوں کا پھل تو ہمیں کھانا ہی ہوگا۔''

سعدیہ سوچ میں ڈوبی بول رہی تھی اور نفیسہ صاحبہ کی آنکھوں سے آنسو بہتے چلے جا رہے تھے۔

☆

نعیمہ ناز

رزقِ ماہ و سال

بیگم زرتاج مہر اسپتال میں داخل ہیں، کومے میں ہیں۔ ان کے چاروں بیٹے ان کے سامنے آ کر اپنے اپنے دل کا حال کہہ رہے ہیں وہ کوئی جواب دے نہیں رہی تھیں، بیگم زرتاج سن سب رہی تھیں۔

مہر ولی زرتاج بیگم کے شوہر ایک ایسے خانوادے کی تیسری نسل سے تھے جنہوں نے انگریزوں سے وفاداری نبھائی اور انگریز سے وفاداری ان کی گھٹی میں شامل تھی۔ مہر ولی نے پہلے بیٹے کی پیدائش کے بعد کاؤنٹی میں جائیداد خریدی۔

زرتاج بیگم ایک نام ور مصورہ تھیں۔ ان کا تعلق جس گھرانے سے ہے انہوں نے اپنے ملک سے غداری کر کے انگریزوں کا ساتھ دیا اور جاگیریں حاصل کیں۔

بیگم زرتاج کی تین نسلوں پہلے 1857 کی جنگ آزادی کا زمانہ ہے۔

میر وجاہت حسین کا گھرانا جس میں ان کے دو بیٹے میر شجاعت حسین، میر سعادت حسین اور یتیم بھتیجے میر سلامت حسین کھانے کے بعد ملکی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہیں۔

پانچ بوڑھیا عورتیں اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی ہیں کہ یہ بنیا گیری کرنے آئے تھے، محل میں گھس کر قلعے کے داروغہ بن گئے۔

شاہی خانوادے کے شہاب الدین دہلی میں ہی رہنے کا فیصلہ کرتے ہیں اور میر وجاہت حسین کے گھر پناہ کے لیے آتے ہیں۔

گھر کی خواتین کو بتائے بغیر انہیں تہہ خانے میں منتقل کر دیا جاتا ہے گھر کے مردوں اور رحمت بوا کے بیٹے قاسم کے علم

مکمل ناول





میں یہ بات ہے۔ نادر شاہ کے بعد دہلی پھر تباہی کی زد میں تھی۔ انگریز سپاہی میر وجاہت حسین کے گھر آتے ہیں اور شہاب الدین اور ان کے گھر والوں کو پناہ دینے کے جرم میں میر وجاہت حسین اور ان کے خاندان کے ساتھ ساتھ شہاب الدین اور ان کے خاندان کو بھی ختم کر دیا جاتا ہے۔

عبدالمعید ایک معمولی عورت سارہ کولسن سے شادی کرنا چاہتا ہے جو غیر مسلم بھی ہے۔ میر ولی اور زرتاج کے منع کرنے پر گھر بار، جائیداد چھوڑ کر ایک انتہائی نچلے علاقے میں ایک کمرے کے فلیٹ میں جو سارہ کا تھا رہنے لگتا ہے۔ ایک دن وہ فلیٹ میں آتا ہے تو دیکھتا ہے کہ سارہ ایک مرد کے ساتھ بیٹھی ہے، وہ اس کا شوہر ہونے کا دعوے دار ہے۔ معید وہاں سے بھاگ جاتا ہے اور والدین کی پسند کی ہوئی لڑکی زہرہ پروین سے شادی کر لیتا ہے۔ سارہ اسے صفائی دینے کی کوشش کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ وہ پریگننٹ ہے لیکن وہ یقین نہیں کرتا۔

انگریز سرکار وجاہت حسین کے ملازم قاسم کو مخبری کرنے پر خان بہادر کا لقب اور جاگیر سے نوازتی ہے جو اسے کم لگتا ہے۔

نور فاطمہ اپنے گرینڈ پا کے ساتھ رہتی ہے۔ گرینڈ پا ایک کتاب لکھ رہے تھے، نور فاطمہ ریسرچ میں ان کی مدد کر رہی ہے۔

ایک لڑکی ماریہ عبدالمعید کو بلیک میل کرتی ہے کہ وہ ان کی اور سارہ کولسن کی بیٹی ہے۔

قاسم کی ماں رحمت بوا وجاہت حسین کی خاندانی ملازمہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر پاتیں کہ ان کا بیٹا انگریز کا وفادار ہے۔

دوسری قسط

''کیا؟'' عبدالمعید یوں اچھلا جیسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔

''یہ لعنتی انسان اب تمہارے ساتھ یہاں کیا کر رہا ہے؟ یہ وہی ہے نا جو تمہیں چھوڑ کر بھاگ گیا تھا؟'' عبدالمعید نے کراہیت آمیز نظروں سے ہیری کو دیکھا۔

''ہیری کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو یہ واپس آ گیا۔ یہ مجھ سے سچی محبت کرتا ہے۔'' ماریہ بولنے کا موقع دیے بغیر خود ہی اس کا دفاع کر رہی تھی۔

''یا پھر شاید اسے معلوم ہو گیا کہ تم کس کی بیٹی ہو؟'' عبدالمعید نے ہر گھاٹ کا تو نہیں مگر کئی گھاٹوں کا پانی پیا ہوا تھا۔ ہیری کا تعارف ہوتے ہی وہ سمجھ گیا کہ یہ لڑکا یہاں کیوں موجود ہے۔

اس کے تبصرے پر ہیری نے یوں آنکھیں گھمائیں جیسے داد دے رہا ہو۔

''آپ ہیری کی تحقیر کر رہے ہیں۔'' ماریہ نے آنکھوں میں خشونت بھر کر باپ کو دیکھا۔

''میرا خیال ہے کہ میرے آفس کا راستہ بھی اسی نے دکھایا ہو گا تمہیں؟'' عبدالمعید کا اندازہ سو فیصد درست تھا۔ ماریہ خاموشی سے باپ کو گھورتی رہی۔ سبز آنکھوں میں عناد کی تحریر صاف نظر آ رہی تھی۔

''میرا خیال ہے انکل کہ......'' ہیری نے کہنا شروع کیا۔ اس کی آواز ذرا کھردری اور لہجے میں ایک عامیانہ پن تھا، عبدالمعید نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

''مجھے تمہارے خیالات جاننے میں بالکل بھی دلچسپی نہیں ہے۔ تم اپنا منہ بند ہی رکھو بلکہ بہتر ہے کہ یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔'' عبدالمعید کا لہجہ بے حد سخت تھا۔

''میں آپ کا ہونے والا داماد ہوں مسٹر عبدالمعید۔'' ہیری ایک لمحے میں ہی انکل سے مسٹر

پر آ گیا۔ چہرے پر وہ غصہ تھا جو کسی ناکامی پر خفت کے بعد آتا ہے۔

''تم جیسوں کو میں ملازم رکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ داماد بنانا تو دور کی بات ہے۔''

''ایک منٹ۔'' ماریہ نے ہاتھ اٹھا کر باپ کو روکا۔

''آپ کا داماد کون بنے گا، اس کا فیصلہ میں کروں گی اور میں نے آپ کو یہاں اس لیے نہیں بلایا کہ اپنے لیے داماد منتخب کریں، وہ میں کر چکی ہوں۔ مجھے یہ کہنا ہے کہ ہم شادی کر رہے ہیں۔ اس لیے پیسوں کی ضرورت ہے اور شادی کے بعد سیٹل ہونے کے لیے بھی۔ ہیری فی الحال بے روزگار ہے، آپ ہمیں سپورٹ کریں تاکہ ہم ایک اچھی زندگی گزار سکیں۔''

ماریہ نے تیز تیز بولتے ہوئے بلی تھیلے سے باہر نکال دی۔

☆☆☆

''گھوڑا بڑا شان دار ہے حضور! میرٹھ کی گھڑ دوڑ میں بڑا انعام پایا ہے۔ پورے ضلع میں تو کیا پورے صوبے میں بھی ایسا گھوڑا کسی کے پاس نہیں ہوگا۔ ہمارے مالک کے پاس آیا تو شان ہی کچھ اور ہوگی۔ سوگنی (انگریزی اشرفی) لگ چکے ہیں۔ دس بیس اوپر آپ لگا دیں۔''

مہابت خان نے کندھے دباتے ہوئے گھوڑے کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے۔

''ملاقات کا بندوبست کرو گھوڑے کے مالک سے۔ مول کی کوئی بات نہیں، اگر پسند آ گیا تو دس بیس کیا پچاس گنا بھی زیادہ دام دے کر خرید لیں گے۔'' قاسم علی نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

''بہتر ہے مالک۔'' مہابت خان بے حد مہارت سے اس کے کاندھے اور بازو دبا رہا تھا۔

قاسم خان کچھ اور سوچ رہا تھا۔

اصطبل میں عمدہ نسل کے کئی گھوڑے اور گھوڑیاں جمع کر لیے تھے اس نے۔ جو تفریح اور شغل کا ذریعہ بھی تھے اور اپنی امارت کی نمود و نمائش کا بھی۔ وہ سب کچھ اس نے حاصل کر لیا تھا، جس کی خواہش کی تھی بلکہ اپنی خواہش سے بھی زیادہ ہی مل گیا تھا۔

آہستہ آہستہ سب کچھ سنبھالنے کا طریقہ و سلیقہ بھی آتا جا رہا تھا۔ مہابت خان کی مدد اور تعاون سے اس نے اپنے لیے ملازموں کی جو فوج اکٹھا کی تھی۔ وہ بڑے محنتی، وفادار اور فرض شناس تھے۔ اپنے کاموں میں ماہر، جائیداد کے بندوبست اور انتظامات سنبھالنے میں انہوں نے شب و روز اپنی صلاحیتیں اور محنتیں کھپا دیں۔ اعلا طبقے کے طور طریقے، اٹھنا بیٹھنا اور طرزِ معاشرت، بہت کچھ وہ میر وجاہت حسین کی حویلی سے اور ان کی صحبت سے سیکھ چکا تھا کہ بچپن سے وہیں پلا بڑھا تھا۔

جو کچھ کمی تھی ان ملازموں، مصاحبوں اور خادموں نے پوری کر دی تھی جو لاٹ اور میم صاحبان کے تربیت یافتہ تھے۔ سارے قاعدے، قرینے، ادب آداب اس کے ماحول ہی میں نہیں خون میں بھی جیسے رچ بس گئے تھے۔ اب فطری، معاشرتی اور مذہبی تقاضے پورے کرنے کی فکر تھی، جو کچھ حاصل کیا تھا اسے اپنی اگلی نسل بلکہ آئندہ کئی نسلوں تک کو مستفید کرنے کی فکر تھی۔

''مہابت خان! وہ جو ایک ذمہ داری سونپی تھی تمہیں، اس کا کیا بنا؟''

''حضور کا اقبال بلند ہو۔ غلام اپنی ذمہ داریوں سے غافل نہیں ہے۔ اپنی جان لگا دی ہے میں نے اس کام میں، سرکار کے ہم پلہ جیسے ہی کوئی خاندان نظر میں اور سمجھ میں آیا، ضرور بات ڈالیں گے۔'' مہابت خان کی زبان بھی اس کے ہاتھوں کی طرح تیز چل رہی تھی۔

Digitized by Google

"بس ایک بات کا دھیان رکھنا، خاندان میں روپ کی دولت ضرور ہونی چاہیے۔ بے شک دولت، حیثیت، مرتبے میں ہم سے کچھ کم ہی ہوں، مگر حسن و جمال میں زیادتی ہو۔"

"اب ساری فکریں غلام کے لیے چھوڑ دیں سرکار۔" مہابت خان نے اپنے مخصوص خوشامدانہ انداز میں تسلی دی۔

قاسم علی نے بیاہ کے لیے حسب نسب، دولت، حیثیت اور مرتبے کے مقابلے میں خوب صورتی کو اہمیت دی تھی۔ اس کا فلسفہ تھا کہ بے تحاشا وسیع و عریض جاگیر و جائیداد نے اسے اعلا منصب اور بلند حیثیت و مرتبہ ویسے ہی عطا کر دیا تھا۔ نام سے پہلے خان بہادر کا لاحقہ اپنی جگہ بجائے خود حسب بھی بن گیا تھا اور نسب بھی۔ بس اب وہ چاہتا تھا کہ اس کی اولاد اور آگے آنے والی نسلوں میں دولت و حیثیت کے ساتھ ساتھ حسن و جمال کا آہنگ بھی شامل ہو۔ اس کا ماننا تھا کہ خوب صورتی اپنی جگہ خود ایک طاقت ہے۔ جب یہ طاقت جاہ و حشمت کے ساتھ مل جائے تو فتح اور کامیابی ہی سمیٹتی ہے۔ "خان بہادر قاسم علی" کے خواب فقط اپنے لیے نہیں تھے، اپنی ذات تک محدود نہیں تھے بلکہ ان خوابوں، خواہشوں اور آرزوؤں کی زنجیر آئندہ آنے والی کئی پیڑھیوں تک پھیلی ہوئی تھی۔

قاسم علی کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس طرح کی زنجیر جس کے حلقے مال حرام کی بنت سے باندھے گئے ہوں، وہ زنجیر نسل در نسل کئی پیڑھیوں کو اپنی گرفت میں ایسے لے لیتی ہے جیسے زہریلا کوبرا جو کسی وجود کے گرد ایسے لپٹ جاتا ہے کہ پھر اپنا زہر اس میں منتقل کر کے ہی ہٹتا ہے۔

قاسم علی نے یہ بات سوچی ہی نہیں کہ جس مال کو وہ اپنی اور اپنی آئندہ نسلوں کی سربلندی اور عروج کا سبب بنانے کی کوشش کر رہا ہے، وہ مال ان پیڑھیوں کو، فراز کے بجائے نشیب میں لے جائے گا۔ اس کی نسلوں کے لیے یہ رزق، رزق وبال اور رزق زوال بن جائے گا۔

☆☆☆

ہاتھی دانت کی بنی صندوقچی میں رکھے کاغذ پیلے پڑ چکے تھے۔ لفافے بوسیدہ ہو چلے تھے، ایک چھوٹی سی ڈائری بہت احتیاط سے انہوں نے ہاتھوں میں تھامی۔ اس کے ورق بھی بس علیحدہ ہونے کو تیار بیٹھے تھے۔ بے حد محتاط ہو کر انہوں نے اسے کھولا، کچھ دیر تک اس پر نظریں دوڑاتے رہے اور پھر مایوس ہو کر ڈائری بند کر دی۔

"کاش میں فارسی بھی سیکھ لیتا۔" گرینڈ پا نے ایک مایوسی کے عالم میں ڈائری بند کی۔

وہ دس سال کی عمر میں لندن آئے تھے، یہیں تعلیم حاصل کی، یہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور شعبہ تعلیم سے منسلک ہو گئے۔ جوانی میں پڑھانا شروع کیا تھا، اب بڑھاپا آ گیا تھا۔ اردو اور انگریزی پر عبور کے علاوہ عربی، فرنچ اور اسپینش پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے اس شوق اور عہد کو پورا کرنے میں لگ گئے، جسے اپنی پوری ملازمت کے دوران، مصروفیت اور وقت کی کمی کی وجہ سے پورا نہ کر سکے تھے۔

پچھلے بیس سالوں سے ان کی توجہ کا تمام تر مرکز نور فاطمہ تھی۔ اس کی چوتھی سالگرہ کے تین ہفتے بعد اس کے پاپا محض بیس سال کی عمر میں ایک کار ایکسیڈنٹ میں فوت ہو گئے تھے۔

نور فاطمہ کی ماں مصری نژاد خاتون تھیں، حدیقہ خلیل۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے دوسری شادی کر لی۔

نور فاطمہ ان ہی کے ساتھ رہ رہی تھی۔ جب انہوں نے اسے ہاسٹل بھیج دیا تو گرینڈ پا اسے اپنے گھر لے آئے۔ جہاں وہ پیدا ہوئی تھی۔ جب تک نور فاطمہ بارہ سال کی ہوئی تھی، باقاعدگی سے ماں سے ملتی اور چھٹیاں ان ہی کے ساتھ گزارتی تھی پھر

Google

وہ اپنی فیملی کے ساتھ پیرس شفٹ ہو گئیں۔ ملاقاتیں کم ہو گئیں مگر بہر حال ٹیلی فونک رابطہ بحال رہا۔

گرینڈ پا نے اپنی تمام تر توجہ، وقت اور محنت نور فاطمہ کی تعلیم و تربیت اور پرورش کے لیے وقف کردیے تھے۔ اب جب کہ نور فاطمہ اپنی تعلیم سے فارغ ہو کر نوکری کرنے لگی تھی۔ انہوں نے اپنی عمر کا تمام تر حاصل کردہ علم اور تجربہ کتاب کی صورت میں ڈھالنا شروع کردیا تھا۔

ان کی ایک کتاب شائع ہو چکی تھی جو لندن میں بسنے والے، برصغیر کے ان مسلمانوں کے بارے میں تھی جو ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش سے تعلق رکھتے تھے اور جن کی عموماً دوسری اور کسی کسی کی تیسری نسل یہاں مقیم تھی۔ بہت محنت اور عرق ریزی سے انہوں نے حقائق اور اعداد و شمار جمع کر کے اپنی پہلی کتاب لکھی تھی جو کم از کم ان حلقوں میں تو بے حد مشہور ہوئی جن کے لیے لکھی گئی تھی۔

اب انہوں نے جس نئی کتاب کا ڈول ڈالا تھا وہ برصغیر پر انگریزوں کے تسلط اور اقتدار کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ بہت سی تحریریں امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں معدوم ہو گئیں۔ کچھ انقلاب زمانہ نے کھودیں، کچھ وقت کے ساتھ ساتھ ضائع ہو گئیں۔ پھر بھی تھوڑا بہت جو ذخیرہ گرینڈ پا تک پہنچا اور کچھ انہوں نے اپنی کوشش، تحقیق اور جدوجہد سے حاصل کیا، اس سے انہیں بڑی قیمتی معلومات حاصل ہوئیں۔

حاصل کردہ بہت سا مواد وہ اپنی تحریر میں استعمال کر چکے تھے۔ اب کچھ کاغذات (جو خطوط کی شکل میں تھے اور ایک ڈائری جو آدھی سے زیادہ بھری ہوئی تھی) باقی رہ گئے تھے، یہ فارسی میں تھے۔ گرینڈ پا اب ایک اور نہج پر سوچ رہے تھے، یہ سارا مواد انہیں ترجمہ کروانا تھا اور اس کے لیے ان کے ذہن میں دو نام تھے۔

☆☆☆

دھیرے دھیرے کاروبار زندگی چل رہا تھا۔ طیبہ اور رفعت دونوں کو زیادہ عرصہ دوسرے پر بار بننا گوارا نہ ہوا۔ کرتوں پر کڑھائی کر کے انہیں اپنے ہاتھ سے سینے میں مہارت تھی۔ اسی ہنر کو کام میں لے آئیں، شبن میاں بھی کام لادیتے تھے، کبھی بوا کسی سے لے آتیں۔ تھوڑی بہت مزدوری مل ہی جاتی، اپنی خود داری اور وقار کو ٹھیس لگائے بغیر دو





وقت کی روٹی کا بندوبست ہو جاتا۔

شبن میاں اور ان کی بیگم نے تو ایثار کرنا چاہا مگر دونوں بہنوں کو گوارا نہ ہوا، جو ہاتھ کبھی دینے کے لیے آگے بڑھتے تھے، اوپر تھے۔ اب نیچے ہوئے اور لینے کے لیے بڑھانے پڑے تو ان کی روحیں تک کانپ گئیں۔

بہت اصرار کر کے انہوں نے بوا اور شبن میاں کو آمادہ کیا۔ وہ کثیر العیال تھے۔ محنت مزدوری کر کے اپنے کنبے کا پیٹ پال رہے تھے، یہ ہی بڑی بات تھی۔

اس وقت بھی نور فاطمہ کو سلا کر وہ سوئی دھاگہ سنبھالے کرتا سی رہی تھیں۔ باہر صحن سے حسب معمول بوا اور رشیدہ بھابھی کی آوازیں آ رہی تھیں یا بچوں کے کھیلنے اور چیخ پکار کی۔ رفعت سب سے بے نیاز بڑی مہارت سے ٹانکے بھر رہی تھی۔

"بھائی نظام کی جروا گھر گھر جھانکتی پھرے ہے، کیا بال بچوں سے بالکل ہی فراغت لے لی۔" بوا کو پڑوسی بھائی نظام کی بیوی ایک آنکھ نہیں بھائی تھی جو گھنٹوں گھنٹوں یہاں آ کر بیٹھی رہتی تھی۔

"ایک ہی پوت ہے، کب کا بیاہ کر دیا، پر وہ حساب ہے کہ ایک انڈا، وہ بھی گندا۔ نکما ٹھلا گھر میں پڑا رہتا ہے، نکھٹو کہیں کا۔ اس کی وجہ سے بڑی بی گھر میں زیادہ نہیں ٹکتیں، جتنی دیر گھر میں رہتی ہیں، لڑائی جھگڑا رہتا ہے۔" رشیدہ بھابھی بوا کا سر دیکھ رہی تھیں۔

"اچھا، یہ معاملہ ہے۔" بوا نے معاملہ سمجھ کر گردن ہلائی۔

"اور یہ شبن میاں کیوں سویرے سویرے الجھ بیٹھے۔ روزی روزگاری کے لیے نکلتے ہیں تو منہ ماری نہیں کرتے، رزق پر ٹوک لگ جاتی ہے۔" بوا کو اچانک آج صبح کی بات یاد آ گئی۔

"اب کیا بتاؤں بوا؟ ایک روپیہ دیا تھا بھنانے کے لیے کہ خرچے کے کام میں لے لینا۔ باقی واپس دے دینا، اب مہنگائی کا تو کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔ روپیہ تو بس ٹھیکری کے مول ہو گیا۔ ادھر بھنایا ادھر ختم، پہلے تو کبھی ایسی ناقدری نہ دیکھی روپے کی جیسی آج ہو گئی ہے۔ سوائے چند پیسوں اور دمڑی کے، سارے ہی خرچ ہو گئے۔" رشیدہ بھابھی سر دیکھنے کے ساتھ ساتھ بولتی بھی جا رہی تھیں۔

"ہاں بھنو، اب تو وقت ہی کچھ اور ہو گیا ہے، ورنہ ایک روپیہ؟ کیسی شان تھی اس کی۔ ہمیں یاد ہے کہ ایک روپے کا غلہ، ایک اکیلے آدمی سے نہیں اٹھتا تھا۔ روپے کے چھ دھڑی داؤدی گیہوں، ایسے صاف ستھرے کہ کیا بتاؤں۔ ارے ایک روپے میں تین چار سیر خالص گھی آ جاتا تھا، وہ بھی دانے دار۔ سفید براق کھانڈ پانچ سیر تو میں نے خود خریدی ہے، بیس سیر گڑ آرام سے آ جاتا تھا۔ اب تو ہر شے کو آگ لگ رہی ہے، وہ پہلا سا زمانہ ہی نہیں رہا۔ بزرگوں کے عیش بزرگوں کے ساتھ ہی چلے گئے۔"

بوا نے ایک آہ بھری، ویسے بھی اٹھتے بیٹھتے اپنا پچھلا دور یاد کرنا ان کی عادت تھی۔

اتنے میں کواڑ کی زنجیر بجی اور ساتھ ہی ایک آواز۔

"شبن میاں کا دولت کدہ یہی ہے؟" آواز میں رعب تھا اور شائستگی و تہذیب بھی۔

بوا ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئیں، اندر کرتا سیتی رفعت کو یوں لگا، ایک لمحے کو دل کی دھڑکن رک گئی ہو جیسے......

☆☆☆

عبدالمعید کا اندازہ بدقسمتی سے درست تھا۔ ہیری کی ایما پر اور اس کی حوصلہ افزائی پر ماریہ بلیک میلنگ پر اتر آئی تھی۔

"میں آپ کی بیوی کو جا کر سب کچھ بتا دوں گی۔" ماریہ کی سبز آنکھوں میں خود غرضی اور بے گانگی تھی۔

"میرے احسانوں کا یہ بدلہ ہے؟" عبدالمعید کو ماریہ کے رویے پر دلی صدمہ ہو رہا تھا۔

"اگر میں نہیں ہوتا تو تمہارا ٹھکانا کہاں

Google

ہوتا؟“

”میں لیکچر نہیں سننا چاہتی، آپ کا جواب چاہتی ہوں۔“ ماریہ بے حد بدتمیزی سے بول رہی تھی۔

”میں کسی کی بلیک میلنگ میں آ کر ایک پینی بھی نہیں دوں گا۔“ عبدالمعید کا تنتنا ماریہ کو بالکل بھی متاثر نہ کرسکا۔

”منہ بند رکھنے کی جو قیمت آپ سے میں مانگ رہی ہوں، وہ بہت چھوٹی ہے۔ اس قیمت کے مقابلے میں، جو میرا منہ کھل جانے کی صورت میں آپ کو ادا کرنی پڑے گی۔“

”وہ بے ہودہ لڑکا تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے، جو کچھ تم مجھ سے مانگ رہی ہو۔ وہ تم سے چھین کر پھر سے بھاگ جائے گا۔“ عبدالمعید اسے سمجھانے میں ناکام ہوا تو ڈرانے کی کوشش کی۔

”یہ آپ کا دردسر نہیں ہے۔“ ماریہ نے بے رخی سے جواب دیا۔

”تم ہیری سے پیچھا چھڑالو، جو مانگو گی۔ تمہیں مل جائے گا۔“ عبدالمعید نے ایک آخری کوشش اور کی۔

ماریہ چند لمحے باپ کو گھورتی رہی۔

”آپ کو اپنے بیوی بچوں کا ساتھ اور پیار اچھا نہیں لگتا؟“

”اور تمہیں اپنی زندگی میں یہ آسانیاں اور عیش و آرام اچھا نہیں لگ رہا، جو میں نے دیا ہے، ٹھیک ہے جو تمہارا دل چاہے کرو۔ میں ایک پھوٹی کوڑی تم پر خرچ کرنے والا نہیں۔“

عبدالمعید کا خاندانی جاہ و جلال اس پر غالب آ گیا۔ ماریہ کو بڑی حقارت سے اس نے گیٹ آؤٹ کیا تھا۔

اس کے جانے کے بعد وہ سوچ رہا تھا کہ گناہ کر کے وہ اتنا پشیمان نہیں ہوا تھا جتنا اسے قبول کر کے پریشان ہو رہا تھا مگر خیر اتنا بڑا مسئلہ بھی نہیں تھا یہ، ہیری جیسے دو کوڑی کے لڑکے سے نمٹنا کوئی مشکل نہیں تھا اور اس کے بعد ماریہ کو بس میں کرنا بھی شاید اتنا مشکل نہ ہوتا۔ دوسری صورت میں وہ ماریہ سے جان چھڑانے کی تراکیب پر بھی غور کر رہا تھا۔

☆☆☆

شام سے وہ کچن میں گھسی ہوئی تھی، بہت سے مسالا جات کے ڈبے اور دیگر اشیا کاؤنٹر پر ڈھیر تھیں۔ بالوں کو اونچی پونی کی شکل میں باندھے ایپرن پہنے بے حد مصروف اور مختلف نظر آ رہی تھی۔

گرینڈ پا کھٹر پٹر سن کر اپنے کمرے سے باہر نکلے، ویسے بھی اس وقت وہ چائے یا کافی پیتے تھے مگر کچن سے آتی آوازیں سن کر دس پندرہ منٹ پہلے ہی نکل آئے۔

”خدایا خیر، آج سورج مشرق سے ہی نکلا تھا نا؟“ وہ کچن کاؤنٹر کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔

”سورج تو مشرق سے ہی نکلتا ہے۔ یہ تو ہم انسان ہی ہیں جو اپنے محور سے ہٹ جاتے ہیں یا بھٹک جاتے ہیں۔“ ایپرن پہن کر کھانا پکاتی ہوئی نور فاطمہ اور اس کا فلسفہ، بڑا دلچسپ منظر تھا۔

”تو آج کی تازہ ترین خبر کیا ہے؟“ وہ وہیں اسٹول پر ٹک گئے۔

”داؤد آ رہا ہے ڈنر پر اپنے پیرنٹس کے ساتھ۔“

”اوہ۔“ گرینڈ پا نے سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”تم نے ذکر نہیں کیا؟“

”دراصل پروگرام تو اگلے ہفتے کا تھا۔ میں بتا دیتی آپ کو، مگر صبح داؤد کا فون آیا تھا۔ کہنے لگا کہ اگلے ہفتے اس کے ممی ڈیڈی مصروف ہیں تو ڈنر آج کا رکھ لیتے ہیں۔“ نور فاطمہ ایک ڈبے سے مسالا نکال کر مچھلی کے قتلوں پر لگا رہی تھی۔ جھینگے اور مشروم کے پیکٹ بھی رکھے تھے۔

”سی فوڈ؟“

”داؤد کو پسند ہے، پیرنٹس کو انگلش اور اٹالین پسند ہے۔“ نور فاطمہ نے گرینڈ پا کی طرف دیکھا۔ ”آپ کی اور ان کی پسند ایک ہے۔“

Digitized by Google

''ہاں، مگر شاید خیالات الگ ہیں۔'' گرینڈ پا نے کندھے اچکائے۔

''کسی سے ملے بغیر، بات کیے بغیر آپ کیسے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں؟''

''کم سے کم ایک معاملے کے بارے میں تو وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے خیالات بالکل مختلف ہیں۔''

''کس معاملے میں؟''

''تمہارے اور داؤد کے معاملے میں، وہ یقیناً اپنے بیٹے کی مرضی اور خوشی پوری کرنا چاہتے ہیں اور میں......''

''آپ ایسا کیوں نہیں چاہتے گرینڈ پا؟'' نور فاطمہ نے بے حد رسان سے سوال کیا۔ وہ اس موضوع پر بات کرنا چاہتی تھی، اچھا ہوا گرینڈ پا نے خود ہی یہ موضوع چھیڑ دیا۔

''کوئی ٹھوس وجہ تو مجھے بھی نہیں معلوم، بس میری چھٹی حس کچھ بے چین ہے اس معاملے میں۔'' گرینڈ پا نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

''باقی حواس خمسہ تو ٹھیک ٹھیک سگنل دے رہے ہیں نا؟''

''آنکھ وہی دیکھتی ہے جو اسے دکھایا جاتا ہے۔ کان وہی سنتے ہیں جو انہیں سنایا جاتا ہے، ظاہر دیکھ کر فیصلہ کرنا اتنا مشکل نہیں ہوتا۔'' گرینڈ پا نے جواب دیا۔

''آخر آپ کی سکس سینس کہتی کیا ہے؟'' نور فاطمہ نے اتنی دیر میں ان کے اور اپنے لیے کافی بنالی تھی۔ ایک بھاپ اڑاتا مگ ان کے سامنے رکھا اور ایک اپنے لیے لائی تھی۔

''سکس سینس کہتی کچھ نہیں بس خطرے کا الارم دیتی ہے۔''

''آپ کا وہم تو نہیں ہے؟''

''بڑھاپے میں انسان بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ وہمی، شکی، جھکی، خبطی اور سنکی۔ مگر مجھ پر ابھی اتنا بڑھاپا نہیں آیا کہ محض وہم کی بنا پر ایسی باتیں کروں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ داؤد میں کوئی بڑی خرابی ہے یا وہ بہت برا ہے۔ بس مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ تمہارے لیے ٹھیک نہیں ہے، تم ایک دوسرے سے میچ نہیں کرتے۔'' گرینڈ پا کی نظریں کسی غیر مرئی نقطے پر جمی ہوئی تھیں۔

''اور مجھے کیوں لگتا ہے کہ جیسے ہم ایک دوسرے کے لیے ہی بنے ہیں؟'' نور فاطمہ کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے بڑبڑائی۔

''محبت میں ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔'' گرینڈ پا تک اس کی بڑبڑاہٹ باآسانی پہنچ گئی تھی۔ گرم گرم کافی انجوائے کرتے ہوئے وہ مسکرائے۔

''گرینڈ پا! کیا آپ اپنی سکس سینس سے سمجھوتا نہیں کر سکتے؟'' نور فاطمہ کا لہجہ ملتجی تھا۔

''ڈارلنگ، آئی لو یو ویری ویری مچ۔''

''اینڈ آئی لو ہم ویری مچ۔'' نور فاطمہ کافی کے دونوں مگ لے کر دوبارہ کچن میں گھس گئی، مگ دھو کر رکھے اور دوبارہ اپنی کوکنگ کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''جتنی محبت میں تم سے کرتا ہوں، تم کسی سے نہیں کر سکتیں، نہ داؤد سے، نہ مجھ سے۔''

''جانتی ہوں مگر یہ کتنی عجیب سی بات لگتی ہے کہ ایک محبت کو وجہ یا بنیاد بنا کر دوسری محبت سے دست بردار ہوا جائے۔ آسان تو نہیں ہوتا۔'' پیکٹ سے جھینگے نکال کر اس نے ایک بڑے پیالے میں ڈالے۔

''کچھ دن اور سوچ لو۔'' گرینڈ پا کو وہ کچھ آزردہ سی لگی اور انہوں نے ہمیشہ نور فاطمہ کے لیے خوشی اور مسکراہٹ تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔

''میں جتنا بھی سوچ لوں، وہ نہیں سوچ سکتی جو آپ سوچ رہے ہیں۔'' نور فاطمہ کے لبوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ تھی۔

''کھانا خوشی خوشی بناؤ، پریشان ہو کر نہیں۔ دنیا میں ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ہوتا ہے۔'' گرینڈ پا اٹھ کھڑے ہوئے۔

''مگر وہم کا تو کوئی علاج نہیں ہوتا۔'' کمرے

میں جاتے ہوئے گرینڈ پا کی پشت دیکھتی نور فاطمہ سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

جس قیامت کا اندیشہ تھا وہ آہی گئی۔ زہرہ اگرچہ بہت نرم خو، متحمل مزاج اور شائستہ عورت تھی مگر تھی تو آخر عورت ہی نا جس نے شوہر کو ساری عمر محبوب سمجھا اور محبوب بنا کر رکھا اور عبدالمعید نے بھی تو شادی کے ان پندرہ سولہ سالوں میں ہر دن اس کے ناز نخرے یوں اٹھائے تھے جیسے نئی نویلی محبوبہ ہو کوئی۔

ماریہ کے جانے کے بعد اس کے بیڈ روم کا نقشہ وہ نہ رہا، جو تھا۔ گل دان، آرائشی لیمپ، پینٹنگز ساری چیزیں دیوار پر پھینک کر ماری گئیں اور اب بکھرے کانچ اور ٹکڑوں کی شکل میں قالین پر پڑی تھیں۔ عبدالمعید بیڈ روم میں داخل ہوا تو بھونچکا رہ گیا۔ ایک نظر اس نے زہرہ کو دیکھا جس کے بے حد خوب صورت چہرے پر اتنی اذیت کے آثار تھے کہ عبدالمعید کا دل چاہا خود کو شوٹ کرلے، چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا، وہ زہرہ کے قریب آکر بیٹھا۔

''زہرہ!'' اس نے زہرہ کا شانہ چھوا۔

''ڈونٹ ٹچ می۔'' زہرہ بدک کر دور ہٹی تھی۔

''تم دنیا کے آخری آدمی تھے جس پر میں شک کرسکتی۔ تم نے میرے پیار کو، میرے اعتبار کو اتنا بڑا دھوکا دیا۔ میڈی! تم نے سب کچھ ختم کردیا۔'' صدمے کے مارے زہرہ کی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔

''تم پلیز کول ڈاؤن ہوکر میری بات سنو اور سمجھنے کی کوشش کرو۔'' عبدالمعید کا لہجہ ملتجی تھا اور خوف زدہ بھی۔

''تم نے مجھ سے کیوں چھپایا کہ ماریہ تمہاری بیٹی ہے؟''

''مجھے کچھ عرصہ پہلے ہی علم ہوا تھا، سارہ کولسن نے مرنے سے پہلے میرے نام خط لکھا تھا، وہ خط مجھ تک پہنچا تو......''

''تم شروع سے جانتے تھے کہ وہ تمہاری بیٹی ہے، جب ہماری شادی ہوئی تم تب بھی جانتے تھے۔'' زہرہ اسے کٹہرے میں کھڑا کیے سخت سوالات کررہی تھی۔

''مجھے اس وقت یقین نہیں تھا کہ سارہ سچ بول رہی ہے۔'' عبدالمعید کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ زہرہ سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔

''اب یقین آگیا؟''

''ایک مرتا ہوا انسان جھوٹ نہیں بول سکتا۔''

''میڈی! تمہاری ایک غلطی نے ہم سب کی زندگی تباہ کردی۔'' زہرہ کے آنسو پھر بہنے لگے۔

''ہمارے بچے نہ اتنے چھوٹے ہیں کہ اس بات سے لاتعلق رہیں نہ اتنے سمجھ دار کہ اس معاملے کے حوالے سے دوسروں کو فیس کرسکیں۔ ان کی سائیکی پر کتنے برے اثرات مرتب ہوں گے۔ تمہیں اندازہ ہے؟''

''بچوں کو میں سنبھال لوں گا، تم پلیز میرا ساتھ دو۔ میں بہت مصیبت میں ہوں۔'' عبدالمعید نے زہرہ کے ہاتھ تھامنے چاہے۔

''پیچھے ہٹو۔'' وہ کسی شیرنی کی طرح غرائی۔

''تم ساتھ دینے کی بات کررہے ہو، مجھے ایک پل کے لیے تمہارا وجود برداشت کرنا مشکل ہورہا ہے۔''

''اتنی سنگ دل مت بنو زہرہ! وہ میری حماقت تھی شادی سے پہلے کی۔ شادی کے بعد میں نے ایک پل کے لیے بھی تمہیں دھوکا نہیں دیا۔''

میڈی سچ کہہ رہا تھا مگر زہرہ کے اعتبار کا شیشہ ایسا چکنا چور ہوا تھا کہ وہ خود بھی بکھر کے رہ گئی تھی۔ عبدالمعید کی التجائیں اور معافیاں بھی اس کا دل پگھلانے میں ناکام رہیں۔ زہرہ کا دل ہی پتھر نہیں ہوا تھا بلکہ وہ سراپا سنگ بن گئی تھی۔

اس نے وہ عالی شان گھر چھوڑ دیا تھا جسے اس نے بڑی چاہت اور محبت سے سجایا تھا، سنوارا تھا۔ زہرہ نے اب اس گھر میں رہنا گوارا نہ کیا، عبدالمعید

Digitized by Google

کا ساتھ، اس کا قرب، اس کی محبت۔ زہرہ کو کچھ بھی گوارا نہ تھا، کچھ بھی طلب نہ رہی۔ حوصلہ بھی نہ رہا کہ بار بار معافیاں مانگنے پر ایک پشیمان شخص کو معاف ہی کر دیتی۔

''میری محبت کی جھیل بڑی صاف شفاف تھی میڈی! تم نے اسے گدلا کر دیا۔ گندا کر دیا اس کے شفاف پانی کو، میں اسے دوبارہ صاف نہیں کر سکتی۔ نہ تمہیں معاف کر سکتی ہوں۔''

زہرہ چلی گئی۔ بچوں نے ماں کے ساتھ جانے کو ترجیح دی۔ زہرہ کا میکہ تمول میں، عزت و جاہ میں، معاشرتی حیثیت میں کسی طرح بھی مہر ولی کے گھرانے سے کم نہ تھا۔ زہرہ اور بچوں کے لیے معاشی مسئلہ کوئی نہ تھا، مسئلہ اگر تھا تو جذبات کا تھا، دل کا تھا، اعتبار کا تھا جن کا خون ہو گیا تھا۔

☆☆☆

''یہ آواز......؟'' بوا ہڑبڑا کر کھڑی ہوئیں اور آنچل سر پر ڈالا۔ ڈیوڑھی پر جا کھڑی ہوئیں۔

''کون ہے؟'' ان کی آواز لرز رہی تھی۔

''ہم مرزا سکندر بیگ ہیں۔ میرٹھ سے آئے ہیں، شبن میاں سے......''

آنے والے کی بات ادھوری رہ گئی۔ بوا نے کانپتے ہاتھوں سے کواڑ کھولا تھا۔

''سرکار؟''

رفعت اور طیبہ کوٹھڑی سے اتنی تیزی سے باہر آئیں کہ چوکھٹ پر منہ کے بل گرتے گرتے بچیں۔ آنے والا نو وارد مہمان ڈیوڑھی عبور کر کے صحن میں کھڑا تھا اور دونوں بہنوں کی چیخیں نکل گئیں۔

''بھائی صاحب!'' دونوں بے تحاشا مرزا سکندر بیگ کے چوڑے چکلے سینے سے لپٹ گئیں۔ اتنا روئیں، اتنا روئیں کہ رفعت کو غش آ گیا۔

''اللہ تیری شان جل جلالہ۔'' بوا کی کیفیت کچھ ایسی تھی جیسے سوکھے دھانوں پر پانی پڑ گیا ہو اور وہ آن کی آن میں ہرے بھرے ہو گئے ہوں۔

حواس کچھ بحال ہوئے تو ایک دوسرے کو اپنی رام کہانی سنائی۔ رفعت بہت نازک مزاج تھی، اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنی تباہی و بربادی کی دلدوز داستان دہراتی۔ کچھ طیبہ بیگم نے کچھ بوا نے آپ بیتی سنائی۔

بھائی صاحب نے سب کچھ سنا اور سر جھکا لیا۔ قیامت ایسی نہیں ہوگی تو اور کیسی ہوگی؟

''بھائی صاحب! گھر کے سب لوگ......''

طیبہ نے بڑی ہمت کر کے یہ سوال کیا تھا۔ اندر سے دل بہت سہا ہوا تھا پھر بھی وہ بہادر بن گئی۔ پوچھنا تو تھا، ماں باپ، بہن بھائی، بھابھیاں، بچے۔ ماشاء اللہ بھرا پرا کنبہ تھا، جسے میکے میں چھوڑ کر دونوں بہنیں سسرال آئی تھیں۔

''بھابھیاں اور بہنیں ہیں۔ ہماری چاروں بیٹیاں ہیں۔'' وہ بولے۔

''امی حضور؟'' رفعت نے بے تابی سے بھائی کا چہرہ دیکھا' ایسے تو وہ کبھی نہ تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ صدیوں کا سفر کر لیا ان چند مہینوں میں۔

''ایک ماہ ہوا ہے انہیں گزرے۔'' بھائی میاں کی نگاہیں خلا میں کسی موہوم سے نقطے پر جمی ہوئی تھیں۔

''یا اللہ۔'' رفعت کا چہرہ فق ہو گیا اور طیبہ نے دکھ اور کرب کی شدت سے آنکھیں میچ لیں۔

''اور...... باقی سب؟'' آواز ٹوٹ ٹوٹ کر طیبہ کے منہ سے نکلی۔

بھائی میاں نے ایک نظر دونوں بہنوں کو دیکھا، پھر بوا کو۔ جن کے چہرے کی جھریوں میں بہنے والے آنسو اٹکے ہوئے تھے۔

''میں اور مرزا اسد بیگ، ہم دو ہی مرد بچے ہیں۔'' بھائی صاحب چپ ہوئے تو صحن میں قیامت کا سناٹا چھا گیا تھا۔

☆☆☆

ماریہ کے فون پر فون آ رہے تھے، ایک دو بار اس نے آفس آنے کی کوشش کی مگر عبدالمعید کے حکم کے مطابق اسے اندر بھی نہیں آنے دیا گیا۔

Google

معید کو جو تھوڑی بہت ہمدردی اس سے تھی، اب وہ بھی ختم ہوگئی تھی۔ اس کی گھریلو زندگی، اس کا گھر، سب تباہی کے دہانے پر کھڑا تھا۔ اس کے خیال میں اس تباہی میں ماریہ کا ہاتھ تھا، نہ وہ بلیک میلنگ پر اترتی نہ ہی یہ سب ہوتا۔

''میری طرف سے جہنم میں جاؤ، تم اس قابل ہی نہیں ہو کہ کوئی تمہارے لیے کچھ کرے۔''

ماریہ کے بار بار فون کرنے پر عبدالمعید نے بہت متنفر ہو کر اسے جواب دیا تھا۔ یہ دو دن پہلے کی بات تھی۔ دوسری طرف وہ مسلسل زہرہ کو منانے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ بات کرنے پر ہی آمادہ نہیں تھی تو منانے کی نوبت کب آتی۔

آج بھی وہ آفس سے واپس اپنے محل نما گھر میں آیا تو سب کچھ جیسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔

وہ پیانو پر بیٹھ گیا اور یوں ہی اس پر ایک انگلی ماری، فضا میں مترنم آواز نے خاموشی کو توڑ دیا۔ پھر وہی سکوت، اس نے دوبارہ انگلی ایک اور ''کی'' پر ماری، پھر دوسری پر پھر تیسری پر۔ فضا میں جلترنگ سا بجنے لگا۔

زہرہ بہت عمدہ پیانو بجاتی تھی، میڈی تو اس کے آگے اناڑی تھا اور اس وقت تو اپنی سدھ بدھ بھی کھویا ہوا تھا۔ پاگلوں کی طرح وہ پیانو کی کنجیوں پر ہاتھ مار رہا تھا۔ پیانو سے ایک مربوط، سریلی اور مترنم موسیقی کے بجائے ایسی بھیانک اور خوف ناک آوازیں آرہی تھیں جن کا ایک دوسرے سے کوئی تال میل نہ تھا۔ موسیقی کا یہ آلہ، خواب ناک سروں کے بجائے ایسے خوف ناک سر بکھیر رہا تھا جیسی عبدالمعید کی زندگی ان دنوں ہوگئی تھی۔ دیوانوں کی طرح ہاتھ مارتے مارتے اس نے انتہائی وحشت کے عالم میں اپنا سر پیانو پر ٹکا دیا۔

''کیا تھی زندگی اور کیا ہوگئی؟'' ایک خوب صورت خواب کی تعبیر کسی بھیانک سپنے میں بدل گئی تھی۔ آسمان کی وسعتوں میں پرواز کرتے کرتے وہ نیچے آن گرا تھا۔ ایسی جگہ جہاں سہارا دے کر اٹھانے والا بھی کوئی نہ تھا۔

ایسی دلدل میں گرا تھا کہ دھنستا ہی چلا جا رہا تھا۔ خود کو بچانے کے لیے جتنے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا، اتنا ہی دلدل میں اندر جا رہا تھا۔ اس کے بچنے کا ہر راستہ جیسے مسدود ہو چکا تھا۔

وہ ایک بہت کامیاب زندگی گزار رہا تھا، ہر طرح سے بھرپور اور کامیاب زندگی۔ بزنس کے معاملے میں وہ اپنے باپ مہرولی کے نقش قدم پر تھا، ان ہی کی طرح دولت مند، مشہور اور کامیاب۔ ازدواجی زندگی کے معاملے میں ہر شناسا اسے خوش نصیب گردانتا تھا۔ انتہائی حسین، تعلیم یافتہ مہذب اور جان چھڑکنے والی بیوی، دو بچے جو ذہانت اور خوب صورتی میں اپنے والدین ہی کا عکس تھے۔ اچھی بھلی زندگی میں ماضی کی ایک غلطی نے ایسا زہر گھولا تھا کہ سب کچھ ختم ہو رہا تھا۔

زندگی میں پہلی بار وہ خود کو اتنا بکھرا اور ٹوٹا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ کتنی دیر ہوگئی تھی اسے، اسی عالم میں بیٹھے بیٹھے، جب اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کے قریب کھڑا کچھ کہہ رہا ہے۔ اس نے سر اوپر اٹھایا اور دیکھا، بٹلر کھڑا تھا۔

''یس؟'' عبدالمعید بے زار ہوا۔

''ایکسکیوزمی سر۔'' بٹلر کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا جیسے اس کی مصروفیت میں خلل ڈالنے کی معافی چاہتا ہو۔

''دو پولیس والے آئے ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''پولیس؟'' عبدالمعید نے حیران ہو کر پہلے بٹلر کو دیکھا، پھر ہتھیلی سے اپنی پیشانی دبائی۔

''بٹھاؤ انہیں، میں ابھی آتا ہوں۔''

عبدالمعید نے فریش ہو کر اپنے لباس کا جائزہ لیا، ٹائی کی گرہ درست کی، بال سلیقے سے جمائے۔ آئینے میں اپنا ایک ناقدانہ جائزہ لیا۔ کوئی کمی اور خامی بظاہر نظر نہیں آئی تھی۔ اب وہ ایک پراعتماد بزنس مین نظر آ رہا تھا۔ ساری تیاری کے دوران یہ

Digitized by Google

الجھن اس سے نہیں سلجھی کہ پولیس کے آنے کا کیا مقصد تھا۔ کیس کے سارے معاملات وہ کلیئر رکھتا تھا۔

اسی ادھیڑ بن میں وہ بڑے سے ہال میں پہنچا جہاں دو پولیس والے صوفے پر بیٹھے تھے۔ عبدالمعید ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

''مسٹر عبدالمعید؟'' سرخ رنگ اور طوطے جیسی ناک والے انسپکٹر مرفی نے اپنے مخصوص برٹش لہجے میں دکوڈی بنا کر اس کے نام کی تحریف کی۔

''یس۔''

''میں انسپکٹر مرفی اور یہ میرا اسسٹنٹ، مائیکل۔'' انسپکٹر مرفی نے شائستگی سے اپنا تعارف کراتے ہوئے اپنا بیج اور کارڈ دکھایا اور ساتھ ہی جیب سے ایک تصویر نکالی۔

''اسے پہچانتے ہیں آپ؟''

عبدالمعید ساکت رہ گیا۔ وہ ماریہ کی تصویر تھی۔

عبدالمعید کی پیشانی پر پسینے کی نمی آنے لگی۔ جھوٹ بولنا بے کار تھا، ذرا دیر میں ہی سچ کا پتا چل جاتا، اس لیے اس نے تھوک نگلتے ہوئے اپنی گردن ہلائی۔

''یس۔'' عبدالمعید کا لہجہ محتاط تھا۔

''کیسے جانتے ہیں آپ اور کب سے؟''

''یہ......'' عبدالمعید نے خود کو سنبھالا اور کہنا شروع کیا۔ ''یہ میری بیٹی ہے مگر دو ماہ پہلے ہماری ملاقات ہوئی تھی، دراصل......''

عبدالمعید نے مختصراً سب کچھ سچ سچ بتادیا۔ انسپکٹر مرفی اس کی بات بڑے غور اور دھیان سے سن رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اور اس کا اسسٹنٹ عبدالمعید کا چہرہ اور اس کے انداز بغور دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ دونوں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ عبدالمعید کتنا سچ بول رہا ہے اور کتنا جھوٹ۔

''میں پوچھ سکتا ہوں کہ معاملہ کیا ہے؟'' عبدالمعید نے اپنی بات ختم کرکے بڑے نرم لہجے میں سوال کیا تھا۔

''مسٹر معید! مجھے یہ بتاتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ ماریہ اپنے فلیٹ میں کل رات مردہ پائی گئی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق وہ سات ماہ کی حاملہ تھی اور اس کے ساتھ تین افراد نے زیادتی کی۔ اس کے فلیٹ سے اس کی جو ڈائری ملی ہے اس میں چند افراد کے نام، پتے اور فون نمبرز تھے۔ آپ کا نام بھی ان ہی میں شامل تھا، آپ چوتھے شخص ہیں جس سے تفتیش کی جا رہی ہے۔ کیا آپ اس کے دوستوں میں سے کسی کو جانتے ہیں یا کوئی قریبی ساتھی، بوائے فرینڈ وغیرہ؟'' انسپکٹر مرفی نے اچانک سوال کیا تھا۔

''اس کے بوائے فرینڈ ہیری آئزک سے ملاقات ہوئی تھی میری اور میں اس کے حلقہ احباب میں کسی سے واقف نہیں ہوں۔''

عبدالمعید نے بڑی مشکل سے اس کے سوال کا جواب دیا تھا۔

اس پر تو یہ خبر بجلی بن کر گری تھی۔ وہ اپنے حواس مجتمع کرنے کی کوشش کر رہا تھا، بے شک اسے ماریہ سے کوئی خاص محبت تو کیا لگاؤ بھی نہیں تھا۔ اس نے محض انسانی ہمدردی اور کچھ اپنے ضمیر کی آواز پر کان دھرتے ہوئے اسے سپورٹ کرنے کی کوشش کی تھی مگر جب ماریہ نے ہیری کے ساتھ مل کر اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کی تو اس کے دل میں جو رہی سہی ہمدردی اور مروت تھی وہ بھی دم توڑنے لگی تھی مگر یہ سانحہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

عبدالمعید کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ انسپکٹر مرفی اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ غور سے دیکھ رہا تھا۔

''کیا ماریہ اکیلی یا اپنے ساتھی کے ساتھ مل کر آپ کو بلیک میل کر رہی تھی؟''

''جی ہاں۔'' عبدالمعید نے ایک گہری سانس لی۔

''یہ دراصل سب ہیری کی چال تھی۔ اسی کا

Digitized by Google

دماغ کام کر رہا تھا ان سب کے پیچھے اور ماریہ آنکھیں بند کر کے اس کے کہنے پر چل رہی تھی۔"
"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کل پورا دن اور رات میں آپ کی روٹین کیا رہی؟ آپ کہاں تھے؟"
"میں اپنے معمول کے مطابق دن بھر آفس میں تھا۔ شام میں گھر آیا ہوں، رات ایک پارٹی میں مدعو تھا لیکن میں وہاں نہیں گیا تھا۔ شام کے بعد سے میں اپنے گھر پر ہی تھا۔"
"کوئی ملاقات یا فون وغیرہ؟"
"ملاقات تو کسی سے نہ کی، نہ ہوئی۔ البتہ میں نے اپنی بیوی کو فون کیا تھا، رات دس بجے کے قریب۔" عبدالمعید نے سوچتے ہوئے کہا۔
ایک دو اور سوالات کے بعد انسپکٹر مرفی اٹھ کھڑا ہوا۔
"بہت شکریہ مسٹر عبدالمعید! اگر ضرورت پڑی تو مجھے آپ کے ملازموں کے بیان لینا ہوں گے۔ امید ہے آپ تعاون کریں گے۔" دونوں پولیس مین اس سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے۔
ان کے جانے کے بعد عبدالمعید صوفے پر جیسے گر سا گیا۔
"یہ کیا ہو گیا؟ اف خدایا۔ یہ کیا ہو گیا؟" اپنی پیشانی مسلتے ہوئے وہ مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔

☆☆☆

وہ وکٹورین طرز کا بنا تقریباً سو سال سے بھی زیادہ پرانا مکان تھا۔ مخروطی چھت والا، چھ کمروں کا مکان جس میں سیمنٹ، ریت، بجری سے زیادہ لکڑی کا استعمال تھا۔ باہر ہری بھری گھاس کے قطعات، پھولوں کے تختے اور کھڑکیوں میں رکھے روایتی جیریَنیم کے گملے۔ ساٹن یا جالی کے جھالردار پردے کھڑکیوں میں لگے ہوئے تھے۔ اندر اصفہانی غالیچے اور قالین جب کہ دیوار پر ہاتھ کے بنے قالین کے ٹکڑے جن پر قرآن کی کوئی آیت، قالین کی بناوٹ میں نمایاں تھی۔
گرینڈ پا کے لیے یہ گھر اور اس کی سجاوٹ آرائش اور تواضع بہت پرانے اور مانوس مناظر تھے۔ اپنی جوانی میں وہ اس کنبے سے متعارف ہوئے تھے اور اب ان پر بڑھاپا آ گیا تھا۔ ان کے دوست بھی بوڑھے ہو گئے تھے مگر دوستی اور تعلقات اب بھی جوان تھے۔ سامنے رکھی میز پر فنجان میں قہوہ رکھا تھا۔ ایرانی روایتی قہوہ، خشک میوہ اور سکھائے ہوئے گوشت کے تلے ہوئے ٹکڑے۔
"منوچہر! میں ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔" گرینڈ پا نے کاجو کا دانہ منہ میں رکھا۔
"تب ہی تم اپنے اعتکاف سے باہر نکلے ہو۔" منوچہر جمشید نے ایک قہقہہ لگایا۔
وہ ستر سے اوپر تھے، بھاری بدن، گوری رنگت، سنہری بڑی بڑی مونچھوں والے ایک خوش باش اور زندہ دل آدمی۔ ان کی پھولوں کی دکان تھی۔ چھوٹی موٹی نہیں، ٹھیک ٹھاک بڑی سی فلاور شاپ اور خوب چلتا ہوا کام۔ دو بیٹے تھے، ایک امریکہ چلا گیا، دوسرا لندن میں ہی تھا۔ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ علیحدہ رہتا تھا۔ دونوں کبھی کبھار ملنے آ جاتے تھے۔
منوچہر اپنی بیوی فروغ جمشید کے ساتھ مل کر اپنی دکان سنبھالتے تھے۔ انیس سو پچاس کی دہائی میں جب وہ ایک نوجوان تھے، پڑھائی کے لیے لندن آئے تھے پھر یہیں کے ہو رہے۔ یہیں فروغ سے ملاقات ہوئی، محبت ہوئی پھر شادی۔ وہ یہیں مقیم ہو گئے۔ تیس سال نوکری کی، ریٹائر ہوئے تو پھول بیچنے لگ گئے۔ دونوں میاں بیوی شاہ ایران اور اس کی ملکہ کے مداحوں میں شامل تھے۔ آخری بار دونوں میاں بیوی انیس سو سرسٹھ میں ایران گئے تھے جس سال اسرائیل نے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا تھا اور اردن، مصر، شام کے جتھے کو شکست دی تھی۔
اس کے بعد دونوں آج تک کبھی اپنے وطن ایران نہیں گئے۔ اس عرصے میں ایران میں کیا کیا کچھ ہو گیا۔ امام خمینی کا اسلامی انقلاب، شاہِ ایران

Digitized by Google

احمد رضا شاہ پہلوی وہاں سے فرار اور پھر پناہ کے لیے جگہ جگہ مارے مارے پھرنا مگر کہیں امان نہ پائی۔ پناہ ملی تو پھر موت کے بازوؤں میں ملی۔ شاہی خانوادے کی ملکائیں، شہزادیاں، شہزادے مختلف ملکوں اور شہروں میں بکھرے ہوئے تھے۔ کوئی قاہرہ میں، پیرس میں، نیویارک میں، جنیوا میں' سب تتر بتر ہو گئے تھے۔ پتا نہیں کیا کیا کچھ ہو گیا مگر منوچہر اور فروغ کا نوجوانی کا جو رومانس شاہ ایران سے وابستہ تھا وہ اپنی جگہ قائم و دائم رہا۔

شاہ اور ملکہ کا ایک بڑا سا پورٹریٹ ان کے ڈرائنگ روم میں آج بھی لگا ہوا تھا۔ گرینڈ پا اور ان کے خیالات اور پسند ناپسند بہت سے معاملات میں بہت الگ تھی، مختلف تھی مگر ان لوگوں کی دوستی ان اختلافی معاملات سے بہت اوپر تھی۔

''نور کیسی ہے، اسے بھی لے آتے۔ کتنے ماہ ہو گئے اسے دیکھے ہوئے۔''

فروغ حسب معمول نٹنگ کر رہی تھی، گود میں رکھے شاپر میں، اون کا گولہ اور ہاتھوں میں سلائیاں جنہیں بڑی مہارت اور تیزی سے چلا رہی تھیں۔

''نور ٹھیک ہے، بس ذرا مصروف ہے آج کل۔ میرے ساتھ آئے گی کسی دن، آپ دونوں سے ملنے۔'' گرینڈ پا نے گرم گرم قہوے کی پیالی منہ سے لگائی۔

''وہ شادی کب کر رہی ہے؟ میں چشم براہ ہوں اس دن کے لیے۔'' فروغ جمشید عموماً انگریزی میں بات کرتی تھیں۔ گرینڈ پا سے گفتگو کے لیے خاص طور پر اردو بولنے کی کوشش کرتیں اور اس میں جا بجا فارسی کے محل یا بے موقع ٹانکے لگاتیں۔ منوچہر نے حسب عادت اونچا سا قہقہہ لگایا۔

''خانم! آپ اردو اور فارسی کی ٹانگ توڑنے کے بجائے اسے بخش دیں۔''

''کیا یہ المیہ نہیں کہ ہم اپنی زبان، اپنی بولی، اپنے بچوں تک منتقل نہ کر سکے بلکہ الٹا اسے خود بھی فراموش کر گئے۔'' خانم فروغ کی بڑی بڑی بے حد حسین آنکھوں میں اداسی ہلکورے لے رہی تھی۔

''پودا اسی زمین میں جڑ پکڑتا ہے۔ جس زمین میں بویا جاتا ہے اور پلتا بڑھتا ہے۔ اسے المیہ کہیں یا معاشرے اور زندگی کے ارتقاء کا اصول، بچے اپنے اردگرد کے ماحول سے سیکھتے ہیں۔ وہی ماحول زندگی بھر ان پر اثر انداز ہوتا ہے۔ گھر کے ماحول اور تربیت کے اثرات اگر پکے ہوں تو ان کا رنگ بچوں پر گہرا ہوتا ہے، یہ رنگ اگر کمزور اور کچے ہوں تو باہر کا رنگ غالب آجاتا ہے۔''

''ہم اپنے بچوں کو اپنا تہذیبی ورثہ ٹھیک سے منتقل نہیں کر پائے۔ اب ہماری تیسری نسل ایرانی کلچر کے بجائے انگلش کلچر کی نمائندہ نسل ہے۔'' فروغ کے لہجے میں احساس زیاں بول رہا تھا۔

''ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے جو اس شے کے بدلے میں ادا کرنی ہوتی ہے۔ ہم نے ایک بہتر محفوظ اور پر آسائش و پرامن زندگی کی تمنا میں اپنے قدم یہیں گاڑ لیے۔ واپس اپنی سرزمین پر نہیں گئے۔ اس کی قیمت یہی ہے کہ ہماری آئندہ نسلیں ہمارے اس ملک، زبان، ثقافت سے ناآشنا اور لاتعلق رہیں گی۔ جس سے ہم تعلق رکھتے تھے۔'' منوچہر نے گرم اور تلخ قہوے کا گھونٹ بھرا اور سچائی بیان کی۔

''اور مذہب؟'' فروغ نے مضطرب انداز میں سوال کیا۔

''وقت کے ساتھ ساتھ، آہستہ آہستہ اس کے اثرات بھی معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ اہمیت ختم ہوتی جا رہی ہے۔'' منوچہر نے بظاہر لاپروائی سے جواب دیا تھا مگر اس کی تہ میں ایک اضطراب ہلکورے لے رہا تھا۔

''بہت سارے رنگوں کے درمیان رہتے ہوئے اپنا رنگ قائم رکھنا اور نمایاں رکھنا بہت کٹھن کام ہے۔'' گرینڈ پا نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''پھر سب سے بڑی اور اہم بات یہ ہے کہ ہمارے بچے شادی کے لیے صرف اور صرف اپنی

Digitized by Google

پسند اور مرضی کا خیال رکھتے ہیں اور کسی بات کا نہیں۔ شریک حیات چاہے کسی قوم کسی مذہب سے ہو۔ کوئی پروا نہیں کرتا، ایسی شادیوں کے نتیجے میں جو اولاد دنیا میں آتی ہے اس کے لیے مذہب کا چناؤ، والدین نہیں کرتے، اس بچے کی اپنی مرضی پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ بڑا ہو کر جو بھی مذہب اختیار کرے یا کچھ لوگ بچے کو اپنے مذہب کے مطابق چلانے کی کوشش کرتے بھی ہیں تو ناکام رہتے ہیں۔ کیونکہ ایک تو وہ خود اپنے مذہب سے بہت دور اور بیگانگی کا رویہ رکھتے ہیں۔ پھر بچے خود بھی ایک کنفیوز نسل بن جاتے ہیں کہ ماں کے مذہب کو اپنائیں یا باپ کے؟ اس کشمکش میں وہ کہیں کے نہیں رہتے۔''

گرینڈ پا نے ایک مختصر سا تجزیہ ان دونوں کے سامنے پیش کر دیا۔ دراصل یہ معاملہ بھی ان اہم مسائل میں سے ایک تھا جس کا انہوں نے اپنی پہلی کتاب میں بڑی تفصیل سے ذکر کیا تھا۔

''تو ہماری نسلوں کی بہتری کے لیے تم نے جو فیصلہ کیا وہ غلط تھا؟''

''فیصلہ غلط نہیں تھا، شاید جگہ غلط تھی۔''

گرینڈ پا نے باری باری دونوں کا چہرہ دیکھا۔ اب عمر کے اخیر میں تھے۔ دونوں میاں بیوی کو جانے کون کون سے احساس زیاں ستاتے رہتے تھے۔ جس کا اظہار وہ ایک دوسرے سے بھی کم ہی کرتے تھے۔ گرینڈ پا آئے تو دونوں کو دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا۔

منوچہر جمشید نے ایک نظر اس سٹنگ روم پر ڈالی جہاں وہ بیٹھے تھے۔ ہلکی سی نیلاہٹ لیے ان کی آنکھیں تھوڑی سی اداس لگ رہی تھیں۔ ان کی نظریں سابق شاہ اور اس کی ملکہ کی تصویر پر تھیں، جو اپنی حکومت اور انداز حکمرانی کی بدولت مقبول ہو نہ ہو، مشہور بہت تھا، بعد میں مشہور شاہ مجبور اور مشہور شخصیات کے زمرے میں آ گیا تھا۔

''سچ تو یہ ہے دوست، کہ اگر ہمارا ارادہ کبھی واپس جانے کا تھا بھی تو انیس سو ستر کے انقلاب کے بعد بالکل ہی ختم ہو گیا تھا۔ جبر کے ساتھ مذہب کی پاس داری ہمارے جیسی آزاد روحوں کے لیے قابل قبول نہیں تھی۔ اس لیے ہم نے ہمیشہ کے لیے یہیں بسنے کا فیصلہ کر لیا اور ایک حقیقت اور بھی ہے جس کے متعلق میں اب کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ ہم جیسے لوگ جو تیسری دنیا کے ایسے ترقی پذیر ممالک سے تعلق رکھتے ہیں جو مختلف مسائل میں گھرے ہوئے ہیں ہم وہیں رہ کر تبدیلی اور بہتری کی کوشش اور جدوجہد کرنے کے بجائے وہاں سے جان چھڑا کر بھاگتے ہیں اپنی بہترین صلاحیتیں اور کوششیں دوسرے ممالک کو دیتے ہیں۔ بے شک اس کے بدلے میں ہمیں بہت کچھ ملتا ہے۔ مگر بہت کچھ ہم کھو بھی دیتے ہیں۔''

منوچہر جمشید کا لہجہ تلخ نہیں تھا مگر جو سچائی انہوں نے بیان کی تھی، وہ بہت تلخ تھی۔

''اور تم جو اتنے عرصے بعد آئے ہو تو ہم یہ فرسٹریشن لے کر بیٹھ گئے۔ لو یہ کھاؤ اور کہو کیسے دن گزر رہے ہیں اور ہاں راتیں بھی۔''

منوچہر نے تلے ہوئے گوشت کا ٹکڑا ان کی پلیٹ میں رکھتے ہوئے شرارت سے ایک آنکھ دبائی۔ وہ یکایک اپنی جون میں واپس آ گئے تھے۔ گرینڈ پا اپنے دوست کے اس انداز سے خوب واقف تھے، چپکے سے مسکرا دیے، خانم فروغ کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے مگر ان کے خیالات کہیں اور بھٹک رہے تھے۔ جانے کہاں؟

''مجھے ترجمہ کروانا ہے۔ کچھ تحریریں ہیں فارسی میں، بلکہ قدیم فارسی میں ہیں، ان کا ترجمہ شاید تم کر سکو۔'' گرینڈ پا نے ایک پیکٹ بہت احتیاط سے میز پر رکھا۔

''کاغذات بوسیدہ ہو چلے ہیں۔ انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ میں یہ کام کر لوں گا، اگر کوئی مشکل ہوئی تو ایک بڑے میاں ہیں مشہد کے، عرصہ ہو گیا ہے یہاں۔ میرے واقف کار ہیں۔

Digitized by Google

فارسی کے عالم ہیں۔ گالیاں دینے کے لیے قدیم فارسی کا ہی استعمال کرتے ہیں۔ میں ان سے مدد لے لوں گا۔"

"بڑے میاں ہیں؟ اس کا مطلب تمہارے ہم عمر ہوں گے؟" گرینڈ پا نے انتہائی سنجیدگی سے سوال کیا تھا۔

"آں......ں......!" منوچہر جمشید نے اپنی انگلی سے گرینڈ پا کی طرف اشارہ کیا اور پھر وہی ہاتھ اپنے سینے پر بائیں طرف مارا۔

"جب تک یہ جوان ہے میں بوڑھا نہیں ہوں گا۔ سمجھے تم۔"

"سمجھ گیا۔" گرینڈ پا کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ تھی اور منوچہر جمشید نے اپنے مخصوص انداز میں بھرپور قہقہہ لگایا تھا۔

☆☆☆

ہیری آئزک کا باپ ایک پولش یہودی تھا۔ خمیدہ ناک اور گہری نیلی آنکھوں والا کشیدہ قامت شخص، جو لندن کی سڑکوں پر کام کی تلاش میں مارا مارا پھرتا تھا۔ بلکہ کام تو اکثر اسے مل ہی جاتا تھا بس یوں ہے کہ اسے لگ کر کام کرنے کی عادت نہیں تھی۔ اسے نوکری کرنا، دوسرے لفظوں میں کسی کی غلامی کرنا بالکل بھی پسند نہیں تھا، وہ اپنا کام کرنا چاہتا تھا، مگر اس کے لیے رقم کی ضرورت تھی اور جو تھوڑے بہت پاؤنڈز وہ کماتا تھا، وہ گھر کے کرائے اور کھانے پینے میں ہی پورے ہو جاتے تھے۔ انہی دنوں اس کی ملاقات این سے ہو گئی۔ بلونڈ بالوں اور شہد رنگ آنکھوں والی این اپنے بوائے فرینڈ سے علیحدگی کے بعد اپنا ٹوٹا ہوا دل لیے گھوم رہی تھی۔

آئزک بے شک بہت ہینڈسم نہ سہی مگر خوش لباس، شیریں گفتار اور بلا کا چرب زبان تھا۔ این کی ایک بوڑھی آنٹی ــــ عنقریب فوت ہونے والی تھیں اور این کو ترکے میں ایک ٹھیک ٹھاک رقم ملنے کی توقع تھی۔ وہ انتظار کر رہی تھی بڑی بی کے مرنے کا، آئزک بھی اس انتظار میں اس کے ساتھ شامل ہو گیا کہ متوقع رقم سے فائدہ اٹھا کر اپنے کاروبار کے خواب دیکھ رہا تھا۔

این کو بہت جلد اس نے شیشے میں اتار لیا تھا اور پھر دونوں نے الگ الگ جگہ کرایہ دے کر رہنے کے بجائے ایک ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا، کرایہ کی بچت ہو گئی اور اس وقت کی بھی جو آئزک کو اس کے پیچھے پیچھے خوار ہونے میں صرف کرنا پڑتا تھا، اب این اس کے قریب تھی۔ ہر طرح سے اس کی دسترس میں تھی۔

تین ماہ گزر گئے تھے۔ این کی بانوے سالہ آنٹی اس فانی دنیا سے رخصت ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ این مایوس تھی، آئزک اس سے زیادہ مایوس تھا، این نے آنٹی کی طرف سے مایوس ہو کر شادی کے لیے زور دینا شروع کر دیا مگر آئزک ایسا کیسے کر سکتا تھا۔ وہ ایک سچا اور پکا یہودی تھا اور ایک سچا اور پکا یہودی کبھی غیر یہودی سے شادی نہیں کرتا۔ ہاں دوستی تو کر سکتا ہے۔ تعلقات رکھ سکتا ہے۔

این کو اپنے اندر ایک اور وجود کا علم ہوا تو اس نے شادی کے لیے آئزک کا پیچھا ہی لے لیا۔ آئزک بے زار ہو گیا اس رات دن کی چیخ چیخ سے۔

ایک روز وہ اپنا سامان سمیٹ کر خاموشی سے نکل گیا گھر سے بھی اور این کی زندگی سے بھی، این نے چھ ماہ بعد ہیری آئزک کو جنم دیا اور اسے چرچ کے زیر اہتمام ایک آرفن میں چھوڑ دیا۔ این کی آنٹی بالآخر اس جہان فانی سے رخصت ہو ہی گئیں اور جانے سے قبل اپنی وصیت میں ایک معقول رقم این کے لیے چھوڑ گئی تھیں۔

این اپنی زندگی نئے سرے سے اور ذرا شاندار طریقے سے شروع کرنا چاہتی تھی۔ اس نے پہلی فرصت میں بچے سے چھٹکارا حاصل کیا اور کچھ عرصے بعد اسے ایک معقول ساتھی بھی مل گیا۔ جس کے ساتھ وہ مانچسٹر میں آباد ہو گئی۔ آئندہ بیس سالوں تک وہ ایک خوش و خرم زندگی گزارنے والی تھی اپنے شوہر اور دو بچوں کے ساتھ۔

ہیری آئزک یتیم خانے میں پلا بڑھا۔ چرچ کے زیر اہتمام اسکول میں اس کی تعلیم ہوئی۔ ہائی اسکول کے بعد اس نے مزید تعلیم کا تکلف نہیں کیا۔ حالانکہ عمومی یہودی قوم کی طرح وہ بہت ذہین اور ہوشیار تھا مگر وہ اپنی ذہانت، ہوشیاری اور صلاحیت کو منفی انداز میں استعمال کر رہا تھا۔ وہ اعلا درجے کا نوسر باز بن گیا تھا، لوگوں کو دھوکا دے کر بے وقوف بنا کر ٹھگنا، رقوم بٹورنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل بنتا جا رہا تھا۔ ایک بار پولیس کے ہتھے بھی چڑھا، نوعمر ہونے کی وجہ سے اسے اصلاحی جیل میں رکھا گیا مگر وہاں بھی اس کی کوئی خاص اصلاح نہ ہو سکی۔

جیل سے آنے کے بعد اس کی شاطرانہ چالوں میں کئی نئی چالوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ شیریں گفتاری اور چرب زبانی اسے باپ سے ورثے میں ملی تھی اور خود غرضی کی حد تک بے نیازی اور لاپروائی ماں کی طرف سے جہیز میں آئی تھی۔

ماریہ سے ملاقات ہوئی تو وہ ماریہ کی محبت میں مبتلا ہو گیا۔ شاید اس لیے بھی کہ ماریہ اچھی خاصی خوبصورت تھی اور اس لیے بھی کہ اس کا خیال تھا کہ ماریہ ایک اچھی اسامی ہے پیسے والی مگر کچھ عرصے بعد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ ماریہ ایسی تگڑی اسامی نہیں۔ جس کی وہ توقع کر رہا تھا پھر وہ پریگننٹ ہو گئی۔ ایک نئی مصیبت، ہیری اس جنجال میں نہیں پڑنا چاہتا تھا اس لیے ایک رات وہ بھی خاموشی سے اسے سوتا چھوڑ گیا۔

تاریخ نے خود کو دہرایا تھا مگر تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ، آئزک، این کو چھوڑ کر ایسا بھاگا کہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ہیری کا بھی یہی ارادہ تھا مگر ایک روز اتفاق سے اس نے ماریہ کو شاپنگ مال میں دیکھا اور اور دیکھتا رہ گیا۔ دو سو پاؤنڈ کا جوڑا، سو پاؤنڈ کا جوتا۔ مہنگے ریسٹورنٹ میں کھانا، ہیری اس کا پیچھا کرتے کرتے حیران ہو رہا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ ماریہ کے ہاتھ ایسا کون سا خزانہ یا خزانے کی کنجی لگ گئی ہے کہ وہ اس طرح بلا جھجک اور بنا سوچے سمجھے نوٹ خرچ کر رہی ہے۔ ہیری بڑے آرام سے اس کا تعاقب کرتا رہا اور سوچتا رہا۔

اسے اپنے دیکھ لیے جانے یا پہچان لیے جانے کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ ماریہ کے سامنے بھی کھڑا ہوتا تو شاید ہی وہ پہچان سکتی، کلین شیو ہیری کی داڑھی، مونچھیں اور سر کے بال بے ہنگم طریقے سے بڑھے ہوئے تھے۔ سنہرے بال اب سرخ تھے، سر کے بھی اور داڑھی مونچھوں کے بھی۔ کلائی سے لے کر کہنی تک اور تقریباً پوری کمر پر ٹیٹوز بنوائے ہوئے تھے اس نے، خیر اسے اب ماریہ کے وجود سے ایک بڑی رقم کی بو آ رہی تھی۔ وہ اپنا حلیہ درست کر کے فوراً ماریہ کے پاس پہنچ گیا۔ ماریہ اسے دیکھ کر حیران کم اور ناراض زیادہ تھی۔

''اب کیا کرنے آئے ہو؟''

''ٹھیک ہے تمہارا ناراض ہونا بنتا ہے مگر پہلے میری پوری بات سن لو، پھر چاہے مجھے دھکے دے کر باہر نکال دینا۔''

شاطر ہیری آئزک کی چرب زبانی اپنے عروج پر تھی، وہ پوری کہانی پہلے سے تیار کر کے لایا تھا۔ جس کے مطابق وہ ایک کام کے سلسلے میں برمنگھم چلا گیا تھا۔ بہت اچھی آفر تھی اس کا ارادہ تھا ماریہ کو سرپرائز دینے کا مگر وہاں جا کر بدقسمتی سے اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور ایک ماہ لگا زخموں کو مندمل ہونے میں، پھر وہ وہاں سے لندن آیا اور یوں وہ آج ماریہ کے سامنے تھا۔

''تم فون کر سکتے تھے مجھے۔'' ماریہ کے انداز سے کچھ پتا نہیں لگ رہا تھا کہ وہ اس کی کہانی سے متاثر ہوئی ہے یا نہیں۔

''میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایسی حالت میں تمہارا پریشان ہونا بالکل بھی ٹھیک نہیں۔ میرا ارادہ تھا کہ ایک اچھی سی جاب کے بعد ایک شاندار سی رنگ کے ساتھ تمہیں پرپوز کروں۔ مگر...... پتہ نہیں کیا ہو گیا میرے ساتھ۔'' اس نے بے بسی سے اپنے ہاتھ آگے کی طرف پھیلائے۔

Digitized by Google

اور وہ ایک بہت اچھا ایکٹر تھا۔ ماریہ پھر سے اس کی باتوں میں آگئی، اس پر بھروسہ کر بیٹھی اور اس یقین کے سہارے اس نے عبدالمعید کے بارے میں ہیری کو بتایا۔ ہیری کو زیادہ وقت نہیں لگا تھا عبدالمعید کے بارے میں، سب کچھ جاننے میں اور وہ سب کچھ جان کر ہیری کی تو رال ہی ٹپک پڑی۔ اسے لگا کہ قدرت نے اس کے لیے ایک جیک پاٹ کا انتظام کردیا ہے جو بس لگنے ہی والا ہے۔

اس نے ماریہ کو سکھایا، وہ کچھ جو اپنے فائدے کے لیے اسے سکھا سکتا تھا۔ مگر عبدالمعید اس کے لیے لوہے کا چنا ثابت ہوا۔ نہ آسانی سے، نہ مشکل سے، وہ عبدالمعید کو چبانے میں بری طرح ناکام ہو رہا تھا، پھر ماریہ بھی کچھ ڈھلمل سی ہو رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ جو کچھ مل رہا ہے، وہ کافی ہے۔ زیادہ کے لالچ میں کہیں یہ بھی نہ ہاتھ سے چلا جائے، مگر ہیری اتنے کم پر راضی نہیں تھا۔

"تمہارا باپ ایک ملینر ــــ ہے۔ سمجھنے کی کوشش کرو ماریہ! چند لاکھ پاؤنڈز اس کے لیے کوئی بڑی بات نہیں۔ اس کا کچھ نہیں بگڑے گا مگر ہماری اور ہمارے بچے کی لائف بن جائے گی۔ تم بات کرو اس سے۔ دھمکی دو کہ اس کے بیوی بچوں کو سب کچھ بتادوں گی۔"

ہیری روزانہ توتے کی طرح اسے سکھاتا پڑھاتا تھا۔ اور ماریہ نے یہ دھمکی بھی دے دی تھی، ہیری کو پوری امید تھی کہ اپنا گھر بگڑنے کے خوف سے وہ ضرور بلیک میل ہو جائے گا۔

ویک اینڈ پر اس نے ایک چھوٹی سی پارٹی رکھی تھی۔ آنے والی متوقع کامیابی اور خوشی میں اپنے دو آوارہ اور لوفر دوستوں کے ساتھ وہ ماریہ کے فلیٹ میں تھا اور ماریہ غائب تھی۔ کتنی دیر ماریہ کے انتظار میں اس نے اور اس کے دوستوں نے بھی کئی بوتلیں چڑھالی تھیں۔ رات گئے ماریہ آئی، تھکی ہوئی اور مایوس۔

"تم کہاں تھیں اب تک، کب سے انتظار کر رہا ہوں تمہارا۔" ہیری فوراً اس کی طرف لپکا۔

"میں نے مسٹر معید کی بیوی کو سب کچھ بتادیا۔" ماریہ بہت دل شکستہ لگ رہی تھی۔

"کیا؟" ہیری کے اوپر تو ایسا بم گرا تھا کہ اس کے پرخچے اڑ گئے۔

"تم سے کس نے کہا تھا یہ حماقت کرنے کو۔" وہ بری طرح چنگھاڑا۔

"تم نے ہی تو کہا تھا۔ طوطے کی طرح رٹ لگائی ہوئی تھی دھمکی دو۔" ماریہ کو بھی اس کے چیخنے پر غصہ آگیا۔

"دھمکی دینے کو کہا تھا۔ دھمکی پر عمل کرنے کو نہیں۔ بےوقوف جب تک اس کی بیوی کو پتا نہیں چلتا، تمہارے باپ پر خوف طاری رہتا۔ اور اس خوف میں، وہ ہمارا ہر مطالبہ مانتا، میں اس کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیل رہا تھا۔ تم نے سارا کھیل بگاڑ کے رکھ دیا۔ اب کیا کہتا ہے وہ کمینہ؟" ہیری غصے کے مارے بےقابو ہو رہا تھا۔

"وہ ایک پینی بھی نہیں دے رہا اب، جو پہلے دے رہا تھا، وہ بھی منع کردیا۔" ماریہ اسی لیے بری طرح دل گرفتہ تھی، ساری بساط ہی جیسے الٹ گئی تھی۔

"کس نے کہا تھا اتنی زیادہ عقل استعمال کرنے کے لیے، کتیا ــــ" ہیری کے سامنے سے وہ خزانہ غائب ہو گیا تھا جسے بس ہاتھ بڑھا کر اٹھانے کی دیر تھی۔ طیش کے مارے اس کا برا حال تھا۔ غیض و غضب نے اسے دیوانہ بنا دیا تھا۔

"یو سن آف پگ، تیری جرأت کیسے ہوئی مجھے گالی دینے کی۔" ماریہ پہلے ہی انتہائی مایوس اور مشتعل تھی، ہیری کے رویے نے اس کا اشتعال اور بھڑکا دیا۔ غصے میں اس نے میز پر رکھا مشروب کا گلاس اٹھا کر ہیری کو دے مارا جو سیدھا اس کی پیشانی پر لگا۔ گلاس ٹوٹ کر کانچ اندر گھس گیا۔ ہیری نے کانچ کا ٹکڑا کھینچ کر نکالا۔ وہ خون میں لتھڑا ہوا تھا خون اس کے چہرے پر بھی بہہ رہا تھا۔ تکلیف اور

غصے کی زیادتی نے اسے پاگل بھیڑیا بنا دیا۔

وہ ماریہ پر جھپٹ پڑا۔ اس کے لفنگے دوست جو ایک طرف کھڑے خاموش تماشا دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ بھی اپنے دوست کا ساتھ دینے آگے بڑھ آئے۔

دنیا کے بہت سے خطے ایسے ہیں جہاں شیطان کو زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی انسان پر حاوی آنے کے لیے، انسان خود ہی شیطان کا روپ دھار کر وہ سب کر لیتا ہے جس سے انسانیت کی روح تک کانپ جاتی ہے اور ابلیس مارے خوشی کے رقصاں، شاداں وفرحاں رہتا ہے۔

☆☆☆

کمرہ وہی تھا۔ اس کی ہر شے وہی تھی جو ایک گھنٹہ قبل تھی۔ اس کا دروازہ، کھڑکیاں، مشینیں، بیڈ، اس پر لیٹا وہ مرجھایا ہوا وجود جس کے بدن سے مختلف مشینیں تاروں کے ذریعے منسلک تھیں۔

عبدالمعید عرف میڈی نے سر اٹھا کر دیکھا۔ کارڈیک مانیٹر میں ''اوسلواسکوپ'' پر دل کی سیدھی لکیر بغیر کسی رکاوٹ کے چل رہی تھی۔ اپنی کلائی اٹھا کر اس نے آنکھوں کے سامنے کی اور وقت دیکھا۔ ابھی ایک گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا مگر جیسے صدیاں گزر گئی تھیں۔

صدیوں کے عذاب، سراب، خواب سب گزر گئے تھے مگر خود عبدالمعید کے لیے زندگی وہیں ٹھہری ہوئی تھی جہاں آج سے پانچ سال قبل زہرہ اسے چھوڑ گئی تھی۔ وہ پھر نہیں لوٹی، اس کا واپسی کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ وہ نرم خو زہرہ اک دم ہی اتنی کٹھور بن گئی تھی جیسے کوئی سنگلاخ چٹان، اپنی جگہ جمی ہوئی، نہ اسے جگہ سے ہلا سکتے ہیں نہ اس میں اتنی سی بھی جھری بنا سکتے ہیں۔

عبدالمعید نے بہت کوشش کی مگر زہرہ نہ مانی، رہی سہی کسر ماریہ کے بہیمانہ قتل نے پوری کر دی۔ رپورٹرز کو ایک چٹ پٹی کہانی مل گئی تھی۔ خوب مرچ مسالے لگا کر ماریہ کی داستان، مشہور ملینئر ــــــ عبدالمعید کے حوالے سے اخباروں میں چھاپی گئی، جن کو اب تک بھنک بھی نہیں پڑی تھی اس معاملے کی، انہیں بھی پتا چل گیا۔

عبدالمعید راتوں رات ایک بار پھر مشہور ہو گیا مگر یہ شہرت ایسی تھی کہ جو اس کے چہرے پر کالک تھوپ کے، اسے داغ دار کر کے اور اس کی زندگی کو تباہ کرنے کے بعد بھی اس کے ساتھ ساتھ رہی۔

زہرہ جیسی نفیس اور انتہائی نازک مزاج عورت کے لیے یہ سب ناقابل برداشت تھا۔ وہ بچوں کو لے کر، زیورچ منتقل ہو گئی تھی۔

مہر ولی اور زرتاج مہر کسی خاموش تماشائی کی طرح ایک طرف کھڑے جیسے سارا تماشا دیکھ رہے تھے۔ مہر ولی نے بیٹے سے کوئی باز پرس کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کا زور اور طنطنہ پہلے اگر کبھی تھا تو وہ اب نہیں رہا تھا پھر اس معاشرت میں ایسا کوئی رواج بھی نہیں تھا کہ اولاد کو کٹہرے میں کھڑا کر کے اس سے کسی بھی معاملے میں جواب طلبی کی جائے، باز پرس کی جائے، بے محابا آزادی جو یہاں پر شہری کو میسر تھی۔

ان کی اولادیں بھی اسی وافر آزادی کے ساتھ پلی بڑھی تھیں۔ جن معاملات کو معاشرے کا اور انسانی فطرت کا حصہ اور جوانی کا تقاضا سمجھا گیا تھا۔ اس کا شاخسانہ سالوں بعد اب سامنے آیا تھا تو شکایت کریں تو کس سے کریں؟ ذمہ دار ٹھہراتے تو کیسے ٹھہراتے؟

زرتاج مہر خود سکتے کے عالم میں تھیں۔ اس لیے نہیں کہ ماریہ کا وجود ایک سوالیہ نشان کیوں بنا بلکہ اس لیے کہ یہ سوالیہ نشان اس طرح دنیا کے سامنے آیا کہ ان کی ساری عزت، شان شوکت اور جاہ و حشمت پر بٹہ لگ گیا تھا۔ وہ خود ایک نامور مصورہ تھیں مگر بیٹے کے اس اسکینڈل نے ان کی شہرت کا بھی سارا مزا کرکرا کر دیا تھا۔ اخبارات میں کئی دن تک یہ داستان، یہ کیس متواتر چھپتا رہا۔ جب تک کہ ہیری آئزک کو گرفتار کر کے سزا نہ دے دی گئی۔

مہرولی نے زرتاج مہر کو مخاطب کرکے کہا۔
"پچھلی نسلوں کا سارا وقار ہماری اس نسل نے خاک میں ملا دیا۔"

عبدالمعید جھلا کر وہاں سے اٹھ گیا وہ ممی کے پاس آیا تھا ان سے مدد مانگنے کہ زہرہ کے معاملے میں وہ کچھ مدد کردیں مگر زرتاج مہر بھی اس معاملے میں بے بس اور لاچار تھیں۔ بیٹے کے کہنے پر انہوں نے زہرہ سے بات کی مگر زہرہ اتنی بپھری ہوئی تھی کہ انہیں بھی خاطر میں نہ لائی۔

عبدالمعید اٹھ کھڑا ہوا، زرتاج مہر کے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔

"ممی! میں بہت اکیلا ہوگیا ہوں۔ بالکل خالی ہوگیا ہوں اندر سے۔"

اس کے بے آواز لب ہلے اور وہ باہر نکل آیا۔ واپسی کے سفر میں بھی اس کا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا رہا۔

گزرے وقت نے ماریہ کے معاملے پر دھول ڈال دی تھی۔ مجرم پکڑا گیا اور اسے سزا بھی ہوگئی تو اخبار کی دلچسپی اور توجہ بھی ختم ہوگئی۔ دنیا میں ہر روز کوئی نہ کوئی چٹ پٹی اور سنسنی خیز خبر ٹی وی اور اخبارات کی منتظر ہوتی ہے۔ ایک قصہ اپنے اختتام کو پہنچا۔ ایک قصہ اپنے انجام کو پہنچا۔ اس کے ساتھ ساتھ عبدالمعید کی زندگی بھی جیسے اپنے انجام کو پہنچ گئی تھی حالانکہ اس کے پاس ہر وہ شے تھی جس کی مدد سے وہ ایک زندگی شروع کرسکتا تھا۔ دولت اور وجاہت کی موجودگی میں ایک نئے ساتھی کی تلاش کوئی مشکل کام نہیں۔

جس اسکینڈل کا وہ شکار ہوا تھا وہ اس معاشرے کے لیے کوئی اتنا خاص معاملہ نہیں تھا۔ وہاں پر ایک عام بات تھی۔ پھر کہانی پرانی ہوجائے تو لوگ بھول جاتے ہیں۔ فراموش کردیتے ہیں۔ تو عبدالمعید کے لیے مشکلات اب اتنی نہیں تھیں مگر لاکھ چاہنے پر بھی وہ خود کو ایک نئی ڈگر پر چلنے کے لیے آمادہ نہ کرسکا۔

زہرہ اس کے دل سے نہیں نکل رہی تھی۔ اگرچہ وہ اس کی زندگی سے نکل چکی تھی۔ بچے، اپنے بہت پیارے اور لاڈلے بچے اسے بہت یاد آتے تھے۔ کئی بار اس نے سوچا بچوں کے معاملے میں عدالت سے رجوع کرے مگر یہ سب کرکے زہرہ کو خود سے اور متنفر کرلیتا پھر زہرہ نے یہ مہربانی کی تھی کہ بچوں سے ملنے پر پابندی نہیں تھی۔ چھٹیوں میں بچے اس کے پاس آجاتے تھے یا کبھی وہ زیورچ چلا جاتا مگر اس کی کاروباری مصروفیات ایک آدھ دن سے زیادہ اسے مہلت اور فرصت نہیں دیتی تھیں۔

زندگی کا شیرازہ بری طرح بکھر چکا تھا۔

اس کے پرکھوں نے اپنی آئندہ نسلوں کے لیے دولت، وجاہت اور شہرت کی تمنا کی تھی۔ ان کے حصول کے لیے کوششیں کی تھیں پرکھوں کا خیال تھا کہ جس کے پاس یہ تینوں خزانے ہوں۔ عزت اور خوشیاں خودبخود اس کے پاس کھنچی چلی جاتی ہیں۔

انہیں قانون قدرت کا علم نہیں تھا کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی انسان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا، تہی دست، تہی داماں رہ جاتا ہے۔ کتاب قدرت میں اسے زوال کا نام دیا جاتا ہے۔ ایسا زوال جسے جو عمومی نگاہوں سے اوجھل دیتا ہے۔ اور جسے "دیدہ بینا" رکھنے والے ہی دیکھ سکتے ہیں اور شعور کی آنکھ رکھنے والے ہی اس کا احساس کرتے ہیں۔

☆☆☆

پہلے درویش کی کہانی ختم ہوئی، اب دوسرے درویش کی کتھا سنو اور اس بحث کو ہم رہنے دیتے ہیں کہ یہ کردار جنہیں درویش کا نام دیا جارہا ہے اس لفظ کی تعریف پر پورا اترتے ہیں یا نہیں، تو اب تھوڑی دیر کے لیے عبدالہادی عرف ہیڈی اپنی ماں کے کمرے میں آیا تھا اور بستر علالت پر لیٹی زرتاج مہر کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ اس مریضہ کے پاس اب جو وقت بچا ہے وہ بہت قلیل ہے۔ ہیڈی اسپیشل کمانڈو کے تحت پھیرے میں یہاں

آیا تھا۔ اس کی جان کو خطرات لاحق تھے۔ کن لوگوں سے؟ یہ پڑھنے والوں کو آگے جا کر پتا چل جائے گا۔
تو ہیڈی کی درخواست پر حکومت کی طرف سے اس کی سیکورٹی کا خاص بندوبست کیا گیا تھا۔
یہ ملک پناہ حاصل کرنے والوں کے لیے جنت ہے۔ سیاست، مذہب، معاشرت کہیں پر بھی بغاوت کر کے آپ یہاں پناہ لے سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ بغاوت اس ملک اور اس کی عوام کے خلاف نہ ہو۔ عبدالہادی اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح ہی تھا۔ وجاہت، ذہانت اور بے پناہ صلاحیت کی دولت سے مالا مال، اپنے بھائیوں کے مقابلے میں اس کی شہرت بہت زیادہ تھی اور واقعہ یہ ہے کہ اسے مشہور ہونے کا لپکا بھی بہت تھا۔
عبدالمعید کی طرح وہ زیادہ دیر اس کمرے میں نہیں ٹھہرا۔ اس کی زندگی جیسی بھی تھی اس کے لیے بری نہیں تھی۔ اس کی شہرت بہت سوں کے نزدیک متنازعہ اور منفی تھی مگر اسے لوگوں کی کوئی پروا نہیں تھی۔ نہ ان کے رویے کی، نہ تبصروں کی۔
ہاں بس ایک بات تھی جو اس نے آج تک کسی سے نہ کہی تھی مگر آج وہ زرتاج مہر سے کہنا چاہتا تھا۔
انہیں بتانا چاہتا تھا اپنے خوابوں کے بارے میں جنہوں نے اسے الجھن میں ڈال رکھا تھا بلکہ کبھی کبھی تو بے حد خوف زدہ بھی ہو جاتا تھا حالانکہ بنیادی طور پر وہ ایک نڈر انسان تھا۔ کسی کی بھی پروا نہ کرنے والا، نہ بندوں کی، نہ اللہ کی۔ وہ مشتعل عوام کے بڑے بڑے ہجوم سے، جلسوں سے، دھمکیوں سے کبھی کسی سے مرعوب نہیں ہوا۔ کبھی کسی سے نہیں ڈرا مگر عجیب بات تھی۔ اپنے محفوظ قلعے نما محل کے بیسمنٹ میں سوتے ہوئے اسے وہی مخصوص انداز کے خواب نظر آجاتے اور وہ اک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا۔ وہ پسینے پسینے ہو رہا ہوتا۔
انتہائی خوف کے مارے اس کے دل کی دھڑکن اتنی بڑھ جاتی جیسے کوئی خوفناک عفریت اسے پیچھے سے بس دبوچنے ہی والا ہے۔ بے داری کی حالت میں بھی اسے، اس آگ کی، ہولناک آگ کی تپش اپنے آس پاس محسوس ہوتی جسے اس نے خواب میں دیکھا تھا۔
"ممی! میں جانتا ہوں آپ مجھے نہیں سن رہیں۔ نہ ہی سن سکتی ہیں۔ مگر پھر بھی میں وہ خواب آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ جنہوں نے میری نیند اور بے داری دونوں حرام کردی ہیں۔" وہ دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔
"ان خوابوں کا سلسلہ کچھ عرصہ پہلے شروع ہوا تھا اس نے دیکھا کہ وہ کسی میدان میں ہے۔ جہاں کہیں کہیں درخت، کوئی جھاڑی اور تھوڑا بہت سبزہ ہے۔ اچانک اسے ایک انتہائی سیاہ، چمک دار، بہت موٹا اور بہت لمبا ناگ نظر آیا۔ ناگ اسے اتنا خوب صورت اور اتنا پرکشش معلوم ہو رہا تھا کہ بے اختیار اسے پکڑنے کے لیے وہ ناگ کے پیچھے بھاگا۔
عام زندگی میں وہ ایک بہت ماہر شکاری تھا اور بہت بہادر بھی۔ لومڑی اور ہرن کے شکار سے شروعات ہوئی تھی۔ پھر تو اسے ایسا چسکا لگا کہ افریقہ کے گھنے جنگلوں میں اور ہندوستان جہاں اس کے پرکھوں کی جائیدادیں اور قبریں تھیں۔ اس نے شیر، چیتے اور ہاتھی شکار کیے، طرح طرح کے سانپ زندہ پکڑنے میں اسے ایسی مہارت ہوگئی تھی جیسے کوئی بچوں کا کھیل ہو۔
یہی وجہ تھی کہ جب خواب میں اس نے وہ سانپ دیکھا تو اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔ ناگ یوں آہستہ خرامی سے آگے جا رہا تھا، جیسے اسے اپنے پیچھے پیچھے آنے کی دعوت دے رہا ہوں۔ ہیڈی اس پر نگاہ رکھے ہوئے بھاگ رہا تھا۔ میدان ختم ہوگیا۔
اچانک ہیڈی نے خود کو ایک صحرا میں پایا لق ودق وسیع وعریض صحرا، جہاں وہ ناگ کنڈلی مارے جھوم رہا تھا۔ وہ اس ناگ کے قریب گیا اور اس کے منہ کے قریب سے پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وہ ناگ اچھل کر اس کے پیروں سے — لپٹنا شروع ہوگیا۔

Digitized by Google

ہیڈی کے منہ سے ایک خوف ناک چیخ نکلی مگر اس ناگ نے انتہائی سُرعت کے ساتھ خود کو اس کے جسم کے گرد یوں لپیٹا کہ اس کا چہرہ، آنکھیں، پیشانی، سر تک اس کے شکنجے میں تھا۔ ہیڈی کو ناقابل بیان تکلیف ہو رہی تھی۔ روم روم میں ایسی جلن تھی جس کا بیان کرنا ناممکن تھا۔ وہ نیچے گر پڑا، پھر آہستہ آہستہ ناگ نے اپنے بل کھولنے شروع کیے، ہیڈی کے پورے جسم پر خوفناک آبلے پڑے ہوئے تھے۔ خون اور پیپ سے بھرے ہوئے۔ وہ آبلے پھٹنا شروع ہو گئے اور سر سے پاؤں تک وہ اس خون اور پیپ میں لتھڑ گیا جس کی تکلیف بھی اذیت ناک تھی اور بدبو بھی۔

اک دم ہی اس کی آنکھ کھلی تھی اور اندھیرے میں بے اختیار وہ اپنا جسم ٹٹول رہا تھا، خواب کی دہشت کا اثر ایسا تھا کہ بےدار ہونے پر بھی اسے اپنا جسم خون اور پیپ سے چپچپاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اپنے چہرے پر سر پر بار بار ہاتھ پھیر کر خود کو یقین دلا رہا تھا کہ وہ ایک خواب تھا جس سے وہ جاگ چکا ہے مگر اس کا دہشت زدہ دل اور وحشت زدہ آنکھیں بے داری میں بھی گویا خواب کے اس منظر کو اپنی سامنے دیکھ رہے تھے۔

اس کے بعد تو جیسے تانتا بندھ گیا تھا۔ کبھی وہ خواب میں خود کو پہاڑ کی چوٹی پر دیکھتا کہ وہ وہاں سے لڑھکتا ہوا نیچے آ رہا تھا اور پتہ نہیں وہ پہاڑ ہی بہت اونچا تھا یا زمین بہت نیچے تھی کہ کتنی دیر ہو گئی اسے لڑھکتے لڑھکتے نیچے آتے آتے مگر زمین بہت نیچے بھی کہیں دکھائی نہیں دیتی کہ اس کے گرنے کا عمل تمام ہو۔

کبھی وہ بے حد خوف ناک آگ اپنے چاروں طرف دیکھتا جو ہر طرف سے اسے گھیرے میں لے رہی ہے۔ وہ بھاگنے کی کوشش کرتا ہے مگر ناکام رہتا ہے۔ آگ ہر طرف سے اسے گھیر کر جلا رہی ہے۔ ناقابل بیان تپش، جلن اور اذیت کے ساتھ وہ نیچے گر پڑتا ہے۔ آگ کے اونچے اونچے شعلوں کے پار اسے ایک آئینہ دکھائی دیتا ہے جس میں اسے اپنا چہرہ بہت واضح دکھائی دیتا ہے۔ اتنا سیاہ جلا ہوا ہیبت ناک چہرہ۔

خوف کے مارے اس کی چیخ نکل جاتی ہے آنکھ کھلتی ہے تو خود کو بستر پر پاتا ہے اور اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس ہولناک آگ کی تپش ابھی تک اس کے آس پاس ہو۔ اے سی کی کولنگ بڑھا کر وہ ٹھنڈی یخ بیئر کی بوتل منہ سے لگاتا ہے پھر بھی اس اذیت جلن اور تپش کے احساس سے نجات نہیں ملتی۔

''ممی! یہ سب کیا ہے؟''

''خوابوں کو لاشعور کی تحریک قرار دیتا ہے یا بے داری کی حالت میں وقوع پذیر ہونے والے معاملات واقعات کا ردعمل، مگر۔'' ہیڈی بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔

''آپ جانتی ہیں۔ مجھے کئی سال ہو گئے ٹرنکو لائنزر کے بغیر نیند آئے ہوئے اب یہ دوائیاں بھی اپنا اثر کھونے لگی ہیں۔ کبھی کبھی میں اتنا تنگ آ جاتا ہوں کہ سونا ہی نہیں چاہتا۔ ان خوف ناک خوابوں کی وجہ سے میں نیند کی بانہوں میں جانا ہی نہیں چاہتا۔''

ہیڈی بے بسی سے زرتاج مہر کا چہرہ تک رہا تھا۔

''آپ کے سامنے کھڑے ہو کر کچھ کہنا نہ کہنا دونوں برابر ہے۔ پھر بھی نہ جانے کیوں میں یہ سب بتا رہا ہوں آپ کو؟'' ہیڈی نے عجیب سے لہجے میں کہا اور باہر نکل گیا۔

اندر زرتاج مہر کا شعور سو رہا تھا مگر لاشعور بیدار تھا۔ وہ سب دیکھ رہا تھا۔ سن رہا تھا اور سمجھ رہا تھا اور ان کا لاشعور انہیں وہ سب دکھا رہا تھا جس کی وجہ سے ہیڈی کی نیند اور بے داری دونوں اس کے لیے اذیت ناک بن گئی تھیں۔

☆☆☆

داؤد کے ساتھ گاڑی میں بیٹھے اسے قریباً ایک گھنٹہ تو ہو گیا تھا عمارتیں، پارکس، میوزیم، آرٹ

Khawateen Digest December 2018
Digitized by Google

گیلریز، ویسٹ اینڈ کے تھیٹرز، دریائے ٹیمز کا پل، پکاڈلی، ٹریفلگر اسکوائر، ریسٹورنٹ، ہوٹل، ہر وہ جگہ گزر چکی تھی جہاں وہ داؤد کے ساتھ خوشی خوشی جاتی تھی۔ اب بس سیدھی لمبی چوڑی سڑک، داؤد کی کار اور ان کا سفر۔

''ہم کہاں جارہے ہیں داؤد؟''

کوئی چھٹی بار اس نے سوال کیا تھا اور اس بار بھی سوال کے جواب میں ایک مسکراہٹ نظر آئی تھی۔

''اف۔''

نور فاطمہ نے انتہائی کوفت کے عالم میں اسے گھورا۔ ہلکے زرد رنگ کے لانگ اسکرٹ کے ساتھ اس نے سفید رنگ کا بلاؤز پہنا تھا۔ کانوں میں ڈائمنڈ کے ٹاپس اور گلے میں لہریے دار سفید اور زرد رنگوں کا اسکارف ڈالا ہوا تھا۔ تراشیدہ بال اب ذرا بڑھ چکے تھے اور کمر تک پہنچ رہے تھے۔ جنہیں باندھنے کا تکلف نہیں کیا تھا۔ ریشمی سلکی بالوں کو وہ ہر تھوڑی دیر بعد انگلیوں سے سنوارتی رہتی اور کوفت کے عالم میں کبھی کھڑکی کے بند شیشے سے باہر دیکھتی، کبھی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے داؤد کو گھورتی۔

''سچ سچ بتاؤ، تم مجھے کہیں اغوا کر کے تو نہیں لے جارہے؟'' نور فاطمہ کے صبر کا پیمانہ بالآخر لبریز ہوگیا تھا۔

''ہاہاہا!'' داؤد بے اختیار ہنسا تھا۔ اسٹیئرنگ بے قابو ہوگیا اور کار ذرا لہرسی گئی۔

''سنبھل کے۔'' نور فاطمہ چلائی۔

''خاصا رومانٹک آئیڈیا ہے، حیرت ہے مجھے یہ خیال پہلے کیوں نہیں آیا؟'' داؤد اس کے سوال سے بہت محظوظ ہوا تھا۔

''نہیں بتارہے؟ مت بتاؤ، اب میں نہیں پوچھوں گی تم سے بلکہ بات ہی نہیں کروں گی۔'' نور فاطمہ، بچوں کی طرح منہ پھلا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

''اس اولڈ فیشن ڈریس میں تم انیس سو ساٹھ کی دہائی کی کوئی پرانی ہیروئن لگ رہی ہو۔'' داؤد نے جان بوجھ کر اسے چھیڑا۔

''اور تم انیس سو ساٹھ کی فلموں کے کوئی مسخرے جاسوس لگ رہے ہو۔'' نور فاطمہ نے تپ کر فوراً حساب برابر کیا۔

''خواتین اگر پانچ منٹ خاموش رہیں تو میں ان کے لیے خصوصی آسکر ایوارڈ کا اعلان کروں۔'' داؤد نے پھر اسے چڑانے کی کوشش کی۔

نور فاطمہ نے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا اور بدستور کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔

''ویری گڈ، بس دس منٹ اور اسی پوز میں رہ لو، پھر ہم اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔''

''اگر اگلے دس منٹ کے بعد گیارہویں منٹ پر تم نے گاڑی نہیں روکی تو میں دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگادوں گی۔'' نور فاطمہ اس پر غرائی اور اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔

''تمہارا وقت شروع ہوتا ہے، اب......''

اور ٹھیک دس منٹ بعد داؤد نے گاڑی روک دی اور دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ دوسری طرف جاکر اس نے نور فاطمہ کی طرف کا دروازہ کھولا۔

''آؤ!'' داؤد نے ہاتھ بڑھایا۔ نور فاطمہ اس کا ہاتھ تھام کر باہر آگئی۔ چہرے سے نمکین ٹھنڈی ہوا ٹکرارہی تھی۔ فضا میں سمندر کی لہروں کا شور، پرندوں کی چہکار اور ناریل کے درختوں کی خوشبو نمایاں تھی۔

وہ درختوں کے جھنڈ سے گزرتے ہوئے کچھ دور چلے جہاں ساحل سے ذرا فاصلے پر ایک بہت خوب صورت کاٹیج تھا، سفید ستونوں والا برآمدہ اور سٹنگ روم کی دیوار جو ساحل کے رخ پر تھی پوری شیشے کی بنی ہوئی تھی۔ داؤد مکان کے اندر داخل ہوگیا۔ وہ تین بیڈ روم کا بہت خوب صورت مکان تھا، جس میں اعلیٰ ساگوان کی لکڑی اور شیشے کا بے دریغ استعمال ہوا تھا۔ کشادہ اور جدید سہولیات سے آراستہ کچن، باتھ رومز پچھلے حصے میں بنا ہوا گیرج۔

Digitized by Google

داؤد اسے پورا گھر دکھارہا تھا۔ وہ دوبارہ سٹنگ روم میں آئے تو نور فاطمہ اس کے گلاس وال سے قریب ہو کر باہر دیکھنے لگی۔ سامنے ہی نیلے، گہرے بپھرتے سمندر اور چلبلی موجوں کا بے حد خوب صورت نظارہ موجود تھا۔

''تم نے کہا تھا نا کہ تمہیں سمندر کے کنارے رہنا پسند ہے۔ لہروں کا نظارہ کرتے ہوئے۔ ان کا شور سنتے ہوئے تم اپنا دن گزارنا چاہتی ہو۔ میں نے یہ مکان خرید لیا ہے۔ ہم شادی کے بعد یہیں رہیں گے۔''

داؤد اس کے قریب کھڑا کہہ رہا تھا، اس کی نظریں بھی نور فاطمہ کی طرح پھیلے نیلے سبز سمندر پر تھیں۔

نور فاطمہ نے رخ موڑ کر اسے دیکھا۔ داؤد کے چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی، دل موہ لینے والی۔

''تم نے میری خواہش پوری کرنے کے لیے یہ گھر خریدا ہے؟'' نور فاطمہ کے انداز میں بچوں سی حیرانی اور مسرت تھی۔

''خواہش پوری کرنے کے لیے نہیں، خوشی پوری کرنے کے لیے۔ میں نے ہمیشہ تمہیں دیکھا ہے کہ سمندر پر جا کر تم کچھ عجیب دیوانی دیوانی سی ہو جاتی ہو۔'' داؤد نے انتہائی سنجیدگی سے کہتے ہوئے اپنی مسکراہٹ دبائی۔

''کیا تمہیں سمندر اچھا نہیں لگتا؟'' نور فاطمہ کی سحر زدہ نگاہیں اب سمندر پر تھیں۔

''مجھے وہ سب کچھ اچھا لگتا ہے۔ جو تمہیں اچھا لگتا ہے۔'' داؤد نے اس کا ہاتھ تھاما اور باہر ساحل کی طرف جانے لگا۔

''مثلاً مائیکل جیکسن؟''

''اف ف......!'' داؤد نے ہتھیلیاں مضبوطی سے اپنے دونوں کانوں پر رکھ کر دبائیں۔

''آئس کریم؟''

''عوو......'' داؤد نے گردن پر ہاتھ رکھ کر ابکائی کی آواز نکالی۔

''بلیک کافی؟''

''آخ تھو۔''

''میں تمہارا گلا دبا دوں گی۔'' نور فاطمہ نے اس کی گردن کے گرد اپنے ہاتھ بڑھائے۔ وہ آگے بھاگ نکلا۔

''تو تمہیں وہ سب اچھا لگتا ہے جو مجھے اچھا لگتا ہے؟''

نور فاطمہ اس کی گردن دبوچنے کے لیے پیچھے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ پرندوں کی چہکار اور لہروں کے شور کے ساتھ ساتھ دونوں کی ہنسی بھی فضا میں پھیل رہی تھی۔

☆☆☆

سنبھل کا ایک شریف کنبہ تھا، درمیانے درجے کی زمین داری تھی، عبدالرشید، عبدالوحید دونوں بھائیوں کا کنبہ ایک ہی جگہ آباد تھا۔ اس بڑی سی حویلی میں، جہاں بے شمار کمرے، دالان، صحن اور بگیچیں تھے۔ درخت تھے، پھلواری تھی، ڈھیروں ملازم تھے۔ کنگورے دار جھروکے تھے اور ان سب کے درمیان عبدالرشید اور عبدالوحید کی اکلوتی یتیم بھانجی تھی، سطوت جہاں، سولہ برس کی خوبصورت، بھولی بھالی اور کمسن بٹیا، جس کے بیاہ کے لیے ایک جگہ سے پیغام آیا تھا۔

گھر کے بڑے سر جوڑ کر فیصلہ کرنے بیٹھے تھے۔ بڑوں سے مراد، کنبے کے مرد حضرات، جن کے نزدیک عورتیں ناقص العقل ہونے کے باعث مشاورت کے لائق ہی نہیں۔ بس ایک بہت بوڑھی تائی اماں درمیان میں بیٹھی تھیں۔ جن کے سفید جھک بالوں کے احترام میں انہیں بھی فیصلہ سازی میں شریک کر لیا گیا تھا۔ ویسے ان کی حیثیت ایک معذول ملکہ سے زیادہ نہیں تھی۔

دونوں بھائی جا کر قاسم علی سے مل آئے تھے۔ عمر کا جوڑ تھا۔ شکل صورت بھی اچھی تھی۔ رتبے اور سماجی حیثیت میں قاسم علی کا پلہ بھاری تھا، دونوں بھائی کچھ مرعوب ہو کر واپس آئے تھے۔

Digitized by Google

"تو پھر کیا خیال ہے؟"

عبدالرشید نے عادتاً اپنی مونچھ کو تاؤ دیا اور حقے کی نلی منہ میں دبائی۔

"بڑھیا رشتہ ہے، اتنی بڑی جائیداد کا اکیلا وارث ہے۔" عبدالوحید ابھی تک مرعوبیت کے حصار سے باہر واپس نہیں آئے تھے۔

تائی اماں کی بوڑھی مگر جہاندیدہ نگاہیں دونوں بھائیوں پر جم گئیں۔ ان کے چہرے کی جھریوں میں سالوں کا تجربہ گندھا ہوا تھا۔

"منشی جی بتا رہے تھے کہ دولت، جائیداد، رتبہ حیثیت سب کچھ بہت ہے مگر اگا پیچھا بھی کچھ معلوم ہے کہ نہیں؟ شجرہ کیا ہے۔ کچھ تو پتا چلے۔" وہ اپنی باریک لرزتی ہوئی آواز میں بولیں۔

"افغان ہیں پیچھے سے، محمود شاہ غزنوی کے لشکر میں تھے ان کے پرکھے، پھر دہلی میں آباد ہوگئے۔"

عبدالرشید نے گڑ گڑ گڑ حقے کا ایک طویل کش لیا۔ بڑے سے پگڑ تلے نوکیلی مونچھوں والا بھاری بھرکم چہرہ اور بھی بارعب معلوم ہو رہا تھا۔

"میاں جی، انہیں جہیز نہیں چاہیے نہ کچھ اور بس ایک ہی شرط ہے کہ دلہن خوب صورت ہو۔" منحنی سے منشی جی اپنی زکام زدہ آواز میں گویا ہوئے۔

"اے ہائے، صورت شکل تو کسبیوں اور رنڈیوں کی دیکھی جاتی ہے۔ شریفوں میں شکل کون دیکھتا ہے! ہڈی اور خون دیکھتے ہیں۔" تائی اماں ذرا تڑخ کر بولیں۔

"ہڈی جوڑ کی ہے، خون بھی برابر کا ہے، پھر یہ بھی ہے کہ جتنا چھانو اتنا ہی کرکرا نکلتا ہے۔ منشی جی! ان کو کہلوا دیں، باقاعدہ پیام لے کر آئیں۔ ان شاء اللہ منظور ہوگا۔" میاں عبدالرشید نے فیصلہ سنا دیا۔

فیصلہ تو وہ پہلے ہی کر چکے تھے۔ بس اعلان کرنا تھا، سو کر دیا بھانجی کے جوڑ کا رشتہ کنبے میں کہیں ہوتا تو ضرور کر دیتے مگر جو بھی لڑکے یہاں تھے یا تو شادی شدہ تھے یا بہت چھوٹے تھے، پھر قاسم علی کا رشتہ منظور کرنے کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی زمین داری بس اب نام کی ہی رہ گئی تھی۔ مہاجن کے سود در سود قرضے تلے دبی ساری شان و شوکت گھن کھایا عصا بن چکی تھی۔

قاسم علی نے جہیز نہ لینے کی خواہش کر کے ان کی بہت بڑی مشکل آسان کر دی تھی۔ پیغامات تو اور گھرانوں سے بھی آئے تھے مگر وہاں انہیں ہزاروں کا جہیز بھی دینا پڑتا اور زمین بھی جو سطوت جہاں کی ماں کے حصے میں آئی تھی۔ قاسم علی سے رشتہ ہو جانے کی صورت میں زمین بچ جاتی اور شاید ان کی گرتی ہوئی دیوار کو کچھ سہارا بھی مل جاتا۔

آنے والے عید کے چاند میں بیاہ طے کر دیا گیا اور بالآخر وہ دن بھی آ گیا جب سطوت جہاں کو بیاہنے کے لیے خان بہادر قاسم علی بڑی دھوم دھام سے بارات لے کر آئے۔ دولہا ہاتھی پر سوار ہو کر آیا تھا۔ جس کا ہودہ چاندی کا تھا اور اس پر جھولداری تھی۔ وہ سونے چاندی کے تاروں کی کشیدہ کاری سے مزین تھی۔ دولہا نے جو لباسِ فاخرہ زیب تن کیا ہوا تھا اس پر بھی سونے کے تاروں کا کام بنا ہوا تھا۔ باراتی حضرات حسب، حیثیت اور حسب مراتب بیل گاڑی، رتھ، بہلی اور اس نوع کی دوسری سواریوں پر سوار تھے۔ پالکیوں، ڈولیوں اور چوپہلوں میں بیٹھے افراد بھی بارات کی رونق بڑھا رہے تھے۔ بارات ایک دن ٹھہر کر پھر اگلے روز دلہن کو ساتھ لے کر واپس ہوئی۔

☆☆☆

عبدالہادی عرف ہیڈی بچپن سے ہی بہت پیارا اور من موہنا بچہ تھا۔ سب کی توجہ فوراً اپنی طرف مبذول کرانے والا، مگر اس کی بھولی بھالی صورت کے پیچھے ایک انتہائی شرارتی بلکہ خرافاتی دماغ تھا۔

بلی کے بچوں کی دم پکڑ کر انہیں تیز تیز گھمانا اور پوری قوت سے کسی بھی طرف اچھال دینا اس کا محبوب مشغلہ تھا، جال ڈال کر پرندے پکڑتا اور چاقو

Digitized by Google

سے انہیں ذبح کرکے دیکھنے کی کوشش کرتا کہ اندر ایسے کون سے غبارے ہیں جن کی مدد سے یہ اڑتے ہیں۔ پھولوں پہ منڈلاتی خوب صورت رنگوں کی حسین تتلیوں کو اپنی مٹھی میں اس وقت تک قید رکھتا، جب تک ان کے دلکش رنگ ہتھیلی پرنہ اتر آتے۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ کوئی سرکش، باغی یا نفسیاتی قسم کا بچہ تھا۔ اپنی شرارتیں اور شیطانی قسم کے شوق وہ عموماً چھٹیوں میں پورے کرتا تھا۔

عام دنوں میں وہ ایک ذہین، مہذب اور فرماں بردار بچہ تھا۔ جس کی رپورٹ کارڈ پر تخلیقی سرگرمیوں کے حوالے سے جن صلاحیتوں کی نشان دہی کی گئی تھی۔ ان میں ڈائننگ پاور بھی شامل تھی۔ اس میں لکھنے کی صلاحیت تھی، مختلف موضوعات پر کہانیاں، مضامین بہت بہترین انداز میں تحریر کرتا تھا مگر حیرت کی بات تھی کہ ہائی اسکول ختم ہونے تک اس کی یہ صلاحیت اسکول میگزین یا کورس کیلیبس تک ہی محدود رہی۔

اپنی پہلی کہانی اس نے کالج کے آخری سال میں لکھی تھی، وہ بھی بے حد متنازعہ موضوع پر، جس نے پڑھنے والوں کی توجہ فوراً اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ اس کی کہانی کا موضوع کالج میں چلنے والے افیئر ز تھے۔ اسٹوڈنٹس کے درمیان نہیں بلکہ استاد اور شاگرد کے درمیان یونی ورسٹی کی تعلیم مکمل کرنے تک اس نے چند افسانے ہی لکھے تھے مگر موضوعات کے چناؤ اور کہانی کی بنت کے لحاظ سے بہت منفرد تھے۔

مہر ولی اپنے پراپرٹی کے بزنس میں اسے ایڈجسٹ کرنا چاہتے تھے۔ نوعمری کے زمانے سے ہی وہ اپنے بیٹے کی صلاحیتوں اور ذہانت کو بھانپ چکے تھے۔ مگر کالج کی تعلیم کے دوران جب بیٹے کا رجحان ادب کی طرف دیکھا تو وہ کچھ مایوس سے ہوگئے۔ اپنی مرضی اور خواہش اولاد پر ٹھونسنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پھر ہادی سب سے چھوٹا اور لاڈلا بیٹا تھا۔ اس کا شغف کتاب، قلم سے دیکھ کر انہوں نے ہیڈی کو اس کی مرضی پر چھوڑ دیا۔

پھر بھی انہیں فکر تھی کہ ہیڈی اپنے اس پروفیشن میں اس طرح کامیابی اور دولت نہیں سمیٹ سکتا جس طرح وہ اپنے دوسرے بیٹوں کے ساتھ اپنے بزنس میں سمیٹ رہے تھے۔

انہیں اندازہ نہیں تھا کہ آنے والے چند برسوں میں ان کا بیٹا اپنے پروفیشن میں بہت دولت اور ڈھیروں شہرت کمائے گا اور کبھی نہ ختم ہونے والا گناہ بھی۔

☆☆☆

زندگی کو پھر نئے سرے سے شروع کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ گھونسلہ بکھر جانے کے بعد تنکا تنکا اکٹھا کرکے دوبارہ آشیانہ بنانا کتنا کٹھن اور صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے۔ کوئی مرزا اسکندر بیگ سے پوچھے جو اپنے ریزہ ریزہ وجود کو سمیٹ کر تنکا تنکا آشیاں ایک بار پھر اکٹھا کر رہے تھے۔

اٹھارہ سو ستاون کی قیامت آئی تو ان کے گھرانے کے لیے بھی حشر قائم ہوگیا تھا۔ ان کا چھوٹا بھائی اس لڑائی میں انگریز کے خلاف تلوار اٹھا کر کھڑا ہوا تھا۔ اور خود ان سب بھائیوں نے کمپنی بہادر کے خلاف لڑنے والے سپاہیوں کی دامے، درمے، سخنے ہر طرح سے مدد اور اعانت کی تھی، ان سب کا خیال تھا کہ اس جہاد میں فتح مسلمانوں کی ہوگی اور ان غاصبوں کو اس خطے سے نکال باہر کریں گے۔

سارے اندازے غلط ثابت ہوگئے اور فاتح نے مفتوح کو سبق سکھانے اور اچھی طرح کچلنے کے لیے ظلم وجور کا بازار گرم کردیا، مرزا اسکندر بیگ کسی طرح بچ نکلے۔ تینوں بھائیوں کو نہ بچاسکے۔ باغیوں کی مدد اور اعانت کے جرم میں ان پر مختصر دورانیے کا مقدمہ چلا اور پھانسی کی سزا ہوئی۔ زمین جائیداد سب ضبط ہوگئی۔ چار نوعمر بھتیجوں نے باپ اور چچاؤں کو بچانے کی کوشش کی اور سپاہیوں کی سنگینوں کا نشانہ بن گئے۔

مرزا اسکندر کئی ماہ روپوش رہے۔ ایک بااعتماد اور وفادار ملازم ان کے اور ان کے بقایا کنبے کے

Digitized by Google

درمیان پل بنا ہوا تھا۔ سکندر بیگ کے زندہ بچ جانے کی اطلاع ان کے کنبے کو دی تھی جس میں فقط پانچ عورتیں نو لڑکیاں بچیاں اور ایک چار سالہ بچہ مرزا اسد بیگ تھے۔ اسی ملازم نے اتنے بڑے کنبے کی رہائش کا بندوبست کر رکھا تھا۔

سونے کے چند زیورات بیچ کر گزر بسر کا ذریعہ بھی ہو گیا تھا۔ اٹھارہ سو اٹھاون کے آخری مہینے شروع ہوئے تو ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے باغیوں کے لیے عام معافی کا اعلان ہو گیا۔

مرزا اسکندر بخت قریباً ایک سال روپوش رہنے کے بعد میرٹھ واپس پہنچے اور تنکا تنکا آشیانہ بنانا شروع کیا۔ رفعت اور طیبہ کی بھی ڈھونڈ ہوئی۔ نہ جانے کتنی خاک چھاننے اور در در ڈھونڈنے کے بعد انہیں کامیابی ملی۔ دوسرے ہزاروں مسلمان کنبوں کی طرح وہ بھی آسمان سے زمین پر آ گئے تھے۔

شیرازہ ہستی بری طرح بکھر چکا تھا۔ بیوی نے سب گہنوں کی پوٹلی شوہر کے سامنے رکھ دی جسے اپنے ساتھ بچا لانے میں کامیاب ہوئی تھیں۔ بارے کچھ رہنے کا ٹھکانا بھی ہو گیا۔ رفعت اور طیبہ بھی نور فاطمہ کو لے کر ان کے ساتھ آ گئی تھیں۔ بوا بھی ساتھ تھیں۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر سب کے زخموں کے ٹانکے پھر ادھڑ گئے۔ غم تازہ ہو گئے اور آنسو بے قابو۔

زندگی دھیرے دھیرے اپنی ڈگر پر چل نکلی۔ اچھا برا، خوشیوں کو غموں کو اپنے دامن میں سمیٹے وقت گزرتا گیا۔ گزرتا چلا گیا۔ بوڑھے ایک ایک کر کے قبروں میں جا سوئے۔ جوان بوڑھے ہوئے اور بچے جوان ہو گئے۔

چودہ سالہ نور فاطمہ کا بیاہ بڑی سادگی کے ساتھ اٹھارہ سالہ مرزا اسد بیگ کے ساتھ ہو گیا۔ نکاح کے موقع پر چھوٹی بہن کی جواں مرگی یاد کر کے طیبہ بیگم کی آنکھیں بھر آئیں۔

دس سال پہلے بھری جوانی میں رفعت جہاں نے اس دنیا سے کوچ کیا تھا۔ بوا نے دس سال پہلے انکشاف ہی ایسا کیا تھا کہ غم و غصے اور بے پناہ حیرت کی زیادتی سے رفعت جہاں کا دل دھڑکتے دھڑکتے اک دم ہی رک گیا۔ اس کا دل بھی تو اسی کی طرح نازک مزاج تھا۔

☆☆☆

سولہویں صدی کے اواخر میں جب بھاپ کا انجن ایجاد ہوا اور ساتھ ہی برطانیہ میں جاگیرداری نظام زوال پذیر ہوا تھا تو اس کے نتیجے میں تجارتی حلقے ابھر کے سامنے آئے اور معیشت و سیاست میں کامیابی، مضبوطی اور فوائد اٹھانے کے لیے نئی منڈیوں کی تلاش شروع ہوئی۔ انگریز کی چالاک اور دوربین نظر خطہ ہندوستان پر پڑی، جو سونے کی کان تھا۔ اس دور میں فرانسیسی، پرتگالی، ولندیزی (ہالینڈ) بھی اس منڈی پر قبضہ کرنے کے چکر میں تھے مگر کامیابی برطانیہ اور انگریز کو ہوئی، جو "ایسٹ انڈیا کمپنی" مغلیہ خاندان کے زوال اور مقامی سطح پر انارکی سے فائدہ اٹھا کر اجناس، ریشمی و سوتی کپڑے اور دیگر مصنوعات میں کاروبار کرنے لگی اور دھیرے دھیرے ہندوستان کی معیشت پر پوری طرح قابض ہو گئی۔

انگریز نے جب برصغیر پر تجارتی مفادات اور منڈی کے قبضے کے ارادے سے قدم رکھا، اس وقت ہندوستان پس ماندہ نہیں تھا۔ اس خطے میں جاگیرداری نظام نہیں تھا بلکہ اس خطے کے مختلف معاشرے خود کفیل دیہاتوں پر مشتمل تھے، ان معاشروں میں اراضی اور پیداوار کا زیادہ تر حصہ مشترکہ ملکیت کے دائرے میں تھا۔ اس دور کا برصغیر اپنے خام مال کو استعمال کر کے اپنی ضروریات کا سامان خود بناتا تھا۔

ہندوستان بھر میں جو کپاس پیدا ہوتی تھی، اسے دھاگے اور پھر کپڑے کی صورت میں ڈھالنے کے لیے برصغیر کے طول و عرض میں کھڈی کی صنعت وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی تھی۔ ڈھاکہ کی ململ مشہور زمانہ تھی، اس کے علاوہ جہاز سازی، فولاد کی بھٹیاں اور دیگر چھوٹی چھوٹی صنعتیں برصغیر کے مختلف حصوں

Digitized by Google

اور خطوں میں تھیں۔
انگریز نے برصغیر میں جاگیردارانہ طبقہ پیدا کیا، جن کو اراضی دی گئی۔ اس طبقے کا کام انگریزوں کے مفاد میں کام کرنا تھا۔ اس کے بدلے انہیں انعام واکرام ملتے تھے، اس سلسلے میں کپاس کی تجارت میں جس نوعیت کا استحصال ہوا وہ بھی تاریخی ہے۔
برصغیر کے بادشاہوں، نوابوں، راجوں کے مابین تضاد اور عیاشیوں اور آنے والے وقت کی طرف سے آنکھیں بند کر کے زندگی گزارنے کی روش نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو معاشی اور سیاسی تسلط قائم کرنے میں مدد دی۔ ان معاشی حملہ آوروں نے تجارت کے خراج اور تیار مال کی بھرمار کو فروغ دیا۔ انہوں نے ہندوستان کا خام مال اپنے ہاتھوں میں لے کر برطانیہ بھیجا جہاں سے تیار شدہ مال واپس ہندوستان کی منڈیوں میں آتا اور کئی گنا قیمت پر فروخت ہوتا۔ (تجارتی اور معاشی استحصال کی یہ شکل آج بھی پاکستان سمیت تیسری دنیا کے بہت سے ترقی پذیر ممالک میں رائج ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ برطانیہ کی جگہ آج اس صدی میں، امریکہ نے لے لی ہے)۔
ہندوستان کو اس طرح منڈی بنا کر دست کاروں، ہنرمندوں اور کاشت کاروں کو بے روزگار کیا گیا۔ برصغیر کی معاشی بربادی کا آغاز تب ہی سے ہو چکا تھا۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے درمیانی عرصے میں انگریز، ہندوستان کے سوتی اور ریشمی کپڑے کی صنعت پر قبضہ کر چکے تھے۔
برطانوی سوتی مصنوعات کو تحفظ دینے کے لیے ہندوستانی چھینٹ پر 78 فیصد درآمدی ڈیوٹی لگا دی گئی۔ برطانوی تجارت کے تحفظ اور مفاد کے لیے لازمی ہو گیا تھا کہ ہندوستانی مصنوعات پر 70 سے 80 فیصد ڈیوٹی لگا دی جائے۔ (یہ سلسلہ، مال دار ممالک آج بھی جاری رکھے ہوئے ہیں)۔
گرینڈ پا نے پیرا گراف مکمل کر کے قلم میز پر رکھا۔ اپنا چشمہ اتارا اور ہتھیلی سے اپنی آنکھیں دھیرے دھیرے دبانے لگے۔ کچھ عرصے سے انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ لکھنے اور پڑھنے کے دوران کاغذ پر مسلسل نظریں جمائے رکھیں تو کچھ دیر بعد آنکھوں میں تھکن سی محسوس ہونے لگتی تھی۔ ایسا پہلے نہیں ہوتا تھا، مگر اب ہونے لگا تھا۔
''شاید میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔'' یہ سوچتے ہوئے وہ مسکرائے۔

☆☆☆

ایک ہجوم تھا جو ویسٹ منسٹرایبے پر جمع تھا۔ تاحد نگاہ تک سر ہی سر نظر آتے تھے۔ اس ہجوم میں نور فاطمہ بھی اپنی سہیلی لیزا کے ساتھ تھی، یہ دونوں پھول رکھ کر اب واپس جا رہی تھیں۔
''مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ شہزادی، پریوں کے دیس چلی گئی ہے کبھی نہ لوٹنے کے لیے۔'' لیزا بہت افسردہ تھی، اس کی بھوری آنکھیں سامنے چیری کے درختوں پر تھیں جن پر شگوفے آ گئے تھے۔
''ہوں۔'' نور فاطمہ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس کے ہم راہ تھی مگر دماغ کہیں اور بھٹک رہا تھا۔ وہی عادت کہ خیالات اور سوالات اس کی ذہن کا احاطہ کر لیتے اور پھر جب تک اسے ان کے جوابات نہ مل جاتے، وہ بے چین ہی رہتی تھی۔
اپنی دھن میں چلتے ہوئے سامنے آتی، ایک بڑی بی سے وہ تقریباً ٹکرا ہی گئی تھی۔
''سوری۔'' نور خجل ہوئی، بڑی بی اور لیزا نے ایک ساتھ اسے گھورا۔ بڑی بی آگے نکل گئیں۔
''کہاں گم ہو؟''
''یوں ہی، کچھ سوچ رہی تھی۔'' نور فاطمہ نے اپنا نچلا لب دانتوں میں دبایا۔
''کیا؟''
''اتنی خوب صورت عورت کو اپنے شوہر کی توجہ اور محبت کیوں نہیں ملی؟''
''اس چڑیل نے پیچھا جو نہیں چھوڑا۔'' لیزا نے گویا دانت پیسے۔ عام روایتی برطانویوں کی طرح وہ بھی لیڈی ڈیانا کے مقابلے میں کمیلا پارکر کو ناپسند

کرتی تھی۔

لیزا کے جواب سے نور فاطمہ کی تسلی نہیں ہوئی، یہی سوال اس نے داؤد سے کیا۔

"یہ بات تو ساری دنیا کو معلوم ہے۔"

داؤد نے کچھ الجھ کر اسے دیکھا۔ سورج کی سنہری دھوپ میں دریائے ٹیمز کا پانی چاندی کی طرف چمک رہا تھا۔ وہ دونوں بوٹنگ پر آئے تھے اور اردگرد اور بھی کشتیاں اور بوٹس تھیں، جن میں متوالے اور من چلے نظر آ رہے تھے۔

"تو کیا یہ سچ ہے کہ محبت نصیب سے ملتی ہے، قسمت میں ہو تو انسان کو چاہا جاتا ہے، سراہا جاتا ہے۔"

"اگر نصیب کی ہی بات ہے تو شہزادی کو ساری دنیا سے پسندیدگی اور چاہت ملی ہے، سوائے اپنے شوہر کے۔ اگر سارا ملبہ نصیب پر ڈال دیں تو اس کا شوہر اور وہ عورت دونوں بری الذمہ ہیں ہر بات سے۔ ویسے میں نصیب پر یقین نہیں رکھتا، زورِ بازو پر یقین رکھتا ہوں۔ عزم، ارادے، کوشش اور محنت سے انسان وہ سب کچھ حاصل کر سکتا ہے جو وہ چاہے۔" داؤد نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔" نور فاطمہ بدستور الجھی ہوئی تھی۔

"کبھی کبھی میری بھی سمجھ میں نہیں آتے تقدیر کے معاملات۔ قسمت؟ محبت؟ جتنا سوچتی ہوں اتنا ہی الجھ جاتی ہوں۔" نور فاطمہ نے داؤد کو دیکھا اس کے چہرے پر، آنکھوں میں بے بسی تھی۔

"اگر تم ابھی تک شہزادی کے بارے میں سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی ہو تو پلیز یہ سوچنا بند کرو اور خود کو پریشان مت کرو۔ تمہاری تسلی کے لیے اتنا بتا سکتا ہوں کہ انگریز قوم بہت سے معاملات میں ذرا عجیب و غریب ہے۔ تو اس قوم میں آپ کو ایسے افراد کثرت سے ملیں گے جن کے نزدیک جسمانی قرب اہمیت نہیں رکھتا بلکہ ذہنی ہم آہنگی ضروری ہے۔ اب تم پلیز دوسروں کے بارے میں سوچنا بند کرو، میرے اور اپنے بارے میں سوچو۔"

"مجھے جب تک اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوال کا جواب نہ مل جائے، میں بے چین رہتی ہوں۔" نور فاطمہ نے اعتراف کیا۔

فضا میں اڑتے ہوئے پرندے کبھی کبھی ان کے بہت قریب آ جاتے تھے، وہ انہیں غور سے دیکھنے لگی۔

"کچھ سوالات میرے ذہن میں بھی اٹھتے ہیں۔" داؤد از حد سنجیدہ تھا۔

"کس قسم کے سوالات؟"

"یہی کہ اگلے چھ ماہ کتنے ماہ میں گزریں گے اور ہم ہنی مون پر کہاں جائیں گے وغیرہ وغیرہ۔"

داؤد نے اپنے سن گلاسز اتارے۔ اس کے چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ اور آنکھوں میں واضح شرارت تھی۔

"بہت آسان سوال ہیں۔" نور فاطمہ نے اپنے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں موجود نازک سی

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول
ایک تھی شاد
رخسانہ نگار عد
مکمل ناول کتابی ش
میں شائع ہو گیا
قیمت -/500 رو
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر:
32735021

Digitized by Google

ڈائمنڈ رنگ کو گھمایا اور کہنے لگی۔

"چھ ماہ...... اگلے چھ مہینوں میں ہی گزر جائیں گے اور ہنی مون کے لیے ہم جائیں گے، سب کونٹینٹ۔"

"سب کونٹینٹ؟"

"مجھے بہت شوق ہے ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے وہ مقامات دیکھنے کا، جہاں سے ہمارے آباء واجداد اور خاندان تعلق رکھتے تھے۔ میں جب بھی گرینڈپا سے وہاں کی کہانیاں سنتی ہوں، میرا دل چاہتا ہے اڑ کر وہاں پہنچ جاؤں اور وہ سب کچھ دیکھوں جن کے بارے میں مجھے بتایا گیا ہے۔" جوش کے عالم میں بولتے ہوئے نور فاطمہ کا چہرہ گلابی ہو گیا تھا۔ داؤد نے بے حد دلچسپی سے اسے دیکھا پھر کہنے لگا۔

"تمہارے خیال میں وہ مقامات، وہ جگہیں یا وہ عمارتیں سب کچھ ویسی ہی ہوں گی جیسی تھیں؟ اور جیسی تمہیں بتائی گئی ہیں؟ سو سال پہلے کی دنیا کا نقشہ کچھ اور تھا۔ آج کچھ اور ہے جو فینٹیسی اس وقت تمہارے ذہن میں ہے، ہو سکتا ہے ان مقامات کو دیکھ کر وہ ٹوٹ جائے، بکھر جائے۔"

"ہاں، شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔" نور فاطمہ نے کچھ دیر اس کی بات پر غور کیا اور تائید میں سر ہلایا۔

"انسانوں کی طرح کبھی کبھی مقامات بھی بدل جاتے ہیں۔ کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں، دل توڑ دیتے ہیں ہمارا لیکن پھر بھی......" اس نے چند لمحے ٹھہر کر داؤد کو دیکھا۔ "میں وہاں جانا چاہوں گی۔"

"یعنی اپنا دل تڑوانا چاہو گی؟"

"تم ہو گے نا میرے ساتھ، جب جب میرا دل ٹوٹے، جوڑ دینا۔"

"میں وکیل ہوں، ڈاکٹر نہیں۔"

"دل جوڑنے کا کام نہ وکیل کرتے ہیں نہ ڈاکٹر۔ وہ لوگ کرتے ہیں جو ہم سے محبت کرتے ہوں۔" نور فاطمہ نے اس کے شانے پر سر ٹکایا۔ اس کے ریشمی بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔

"تمہارے "سب کونٹینٹ سے واپسی کے بعد ہم روم، یونان، ترکی اور فرانس جائیں گے۔" داؤد نے اعلان کیا۔

"میرا خیال ہے کہ جب ہم اپنے ہنی مون سے واپس آئیں گے تو ہماری فرسٹ میرج اینورسری قریب ہی ہو گی۔" نور فاطمہ سنجیدہ تھی۔

"اس میں کیا حرج ہے؟" داؤد بھی اسی کی طرح سنجیدہ تھا۔

☆☆☆

منوچہر جمشید کا فون ان کی سوچی ہوئی مدت سے پہلے ہی آ گیا۔ گرینڈپا حیران رہ گئے اور وہاں جا کر خوش، جب منوچہر نے ان کے ہاتھ میں مسودہ دیا۔

"لو بھئی، تمہارا کام ہو گیا اور تمہارا شکریہ وصول کرنے کے لیے ہم دونوں تمہارے گھر آئیں گے اور ڈنر ساتھ کریں گے۔ پلاؤ اور شامی کباب والا ڈنر، ساتھ میں شاہی ٹکڑے۔ ویسے تاریخ کیا کہتی ہے، پلاؤ کی طرح یہ سویٹ ڈش بھی ہماری لونڈیا کے شاہی مطبخ کی ایجاد ہے؟"

آغا منوچہر، ملکہ نور جہاں کے ایرانی تعلق کے حوالے سے ازراہ تفنن اسے مختلف القابات سے پکارتے تھے۔ گرینڈپا ان کی عادت اور انداز سے خوب واقف تھے۔ مسکرا دیے۔

"جب ہم آپ کو ڈنر کھلائیں گے تو اس کے تمام کھانوں کے تاریخی حوالہ جات بھی بیان کر دیں گے۔" کچھ دیر کے بعد وہ رخصت ہونے لگے تھے جب منوچہر کو یاد آیا۔

"ویسے یہ خاتون کون تھیں جن کی یہ ڈائری ہے؟"

"یہ میری دادی تھیں، لیڈی نور فاطمہ بنت شجاعت حسین۔" گرینڈپا نے جواب دیا۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

Google

نوشین زہرہ



گھر میں داخل ہوتی ارم ٹی وی کی خاصی بلند آواز سن کر بڑی حیران ہوئی کیونکہ شمشاد بیگم عرف شمو خالہ کی یہ عادت نہ تھی کہ ٹی وی اونچی آواز میں لگایا جائے۔ بلکہ اس بات کی وجہ سے وہ اکثر اپنے دونوں بیٹوں بلال اور طلال کو ڈانٹتیں کہ ٹی وی کی آواز کم کرو یہ گھر ہے کہ سینما اور آج خود اتنی تیز آواز میں ٹی وی دیکھ رہی تھیں لاؤنج میں داخل ہوتے ہی ارم کی الجھن سلجھن میں بدل گئی۔

شاید یہ انسان کی فطرت ہے کہ جس چیز میں اسے دلچسپی ہو وہ اس میں گم ہونا چاہتا ہے اس لیے ٹی وی چلنے والی فلم میں شمو خالہ نے خود کو گم کیا ہوا تھا اور اس قدر کہ انہیں ارم اور اس کی بھابھی کی آمد کا بھی نہ پتا چلا۔ ٹی وی پر شبنم غم زدہ انداز میں دکھی ہو کر گانا گا رہی تھی جو کہ خاصا مشہور تھا۔

"میں کیوں روؤں میری ماں کہاں ہے ساس بھی تو ماں ہے اگر مہرباں ہے ساس بھی تو......"

سولہ سنگھار کیے شبنم لہرا لہرا کر "نیر" بہا رہی تھی۔ مشہور زمانہ فلم ساس میری سہیلی کے اس دکھی گانے کو دیکھنے میں شمو خالہ بری طرح سے محو نظر آ رہی تھیں ان کی عینک میں بڑے بڑے دیدے بلکہ "چشم نم" ٹی وی اسکرین پر جمے ہوئے تھے۔ آخر ارم کو ان کے کان کے خاصے نزدیک جا کر انہیں ہوش کی دنیا میں واپس لانا پڑا۔ ان کا بھاری بھر کم وجود اس "افتاد" نما سلام پر اچھل پڑا۔ وہ کچھ بدمزا سی نظر آنے لگیں۔

ایسی فلمیں ان کی کمزوری تھیں جس میں ساس صاحبہ کا کردار ایک ظالم عورت کا ہوتا اور بہو بے چاری مظلوم، وہ بڑی دل جمعی سے ایسی فلمیں پاکستانی چینلز پر دیکھتیں۔ ساتھ ساتھ آنسوؤں کا اور ہائے ہائے کا بھی سلسلہ چلتا۔ وہ کافی نرم دل تھیں اور فلم کے آخر میں وہ بڑے جذب کے عالم میں یہ اعلان کرتیں۔

"اللہ غارت کرے ایسی ساسوں کو آخرت کا کوئی خوف ہی نہیں۔ میں تو اپنی بہوؤں کو بیٹیوں کی طرح رکھوں گی ہاں۔"

وہ کلے میں پان کی گلوری دبا کر بڑے شوق سے ہاتھ نچا کر کہتیں۔ اس کے علاوہ خاندان میں بھی کسی ساس کو ظلم کرتے ہوئے دیکھ لیتیں تو اسے بھی ہدایت کرنے سے نہ باز آتیں پھر چاہے اس کے بدلے میں انہیں چار باتیں ہی کیوں نہ سننی پڑ جاتیں۔

بے چاری شمو خالہ بھی کیا کرتیں ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھیں۔ شوہر کے گھر آئیں تو وہ بھی "بن ماں کے بچے" نکلے۔ ان کی شادی سے ۔ ہی ساس صاحبہ اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ ایک شادی شدہ نند سعودیہ میں تھی اس لیے شمو خالہ کا واسطہ ساس نامی عفریت سے (معذرت کے ساتھ) نہیں پڑا تھا۔ ان کو دعویٰ تھا کہ اگر ساس اور بہو میں حوصلہ اور برداشت ہو اور وہ دل کو بڑا کر لیں تو کبھی بھی



Digitized by Google

جھگڑے کی نوبت نہ آئے۔ ارم ان ہی کے پڑوس میں اپنے میاں اور دو بچوں کے ساتھ رہتی تھی اور اکثر ارم خالہ کی نرم اور نفیس طبیعت کے باعث ان کے گھر آجاتی لیکن اس کا آنا آج کچھ خاص نوعیت کا تھا۔

شمو خالہ کے بڑے بیٹے کو برسر روزگار ہوئے تین سال ہونے کو آئے تھے۔ بلال کسی سرکاری محکمے میں ملازم تھا جبکہ اس سے چھوٹا طلال باپ کے ساتھ کاروبار سنبھالتا تھا۔ مارکیٹ میں ان کی ذاتی تین دکانیں تھیں۔ دو دکانیں کپڑوں کی تھیں جبکہ تیسری دکان انہوں نے کرائے پر دی ہوئی تھیں۔ اللہ کی رحمتیں تھیں۔

اب وہ اپنے گھر کا سونا پن دور کرنا چاہتی تھیں اور آج اسی سلسلے میں ارم کی بھابھی کو انہوں نے بلوایا تھا۔ کیونکہ پچھلے مہینے ہونے والی محفل میلاد میں انہیں اریبہ بہت پسند آئی تھی جو ارم کی بھابھی کی سب سے بڑی بھتیجی تھی۔ ان کے ذریعے وہ رشتے کی بات آگے چلانا چاہتی تھیں۔ وہ دونوں اس وقت آئی تھیں جب وہ اپنے محبوب مشغلے میں مگن تھیں۔ بڑا بیٹا دفتر چلا جاتا اور چھوٹا اپنے ابا کے ساتھ مارکیٹ۔

ان کے جانے کے بعد صفائی والی آکر صفائی کر جاتی اور شمو خالہ تھوڑے سے برتن دھو کر ٹی وی چلا کر بیٹھ جاتیں۔ بقول ان کے ''ہمارے زمانے کی فلمیں۔'' دوپہر بارہ بجے تک وہ فلم دیکھتیں پھر دوپہر کے کھانے کی تیاری۔

اس وقت ان کی فلم درمیان میں ہی تھی کہ ارم اور اس کی بھابھی کی آمد ہوئی لیکن جب ارم نے بھابھی کے آنے کا مقصد بتایا تو چہرے پر چھائی بدمزگی خوشی میں تبدیل ہوگئی۔ جلدی جلدی فریج سے کولڈ ڈرنک نکال لائیں۔ اسنیکس وغیرہ گھر میں پہلے سے موجود تھے اور اسی ملاقات کے بعد باقی سلسلے جلدی جلدی طے پاگئے۔ سردیوں کی ایک شام میں اریبہ دلہن بن کر ان کے آنگن میں اتری۔

☆☆☆

شادی کے شروع کے دن بہت جلدی گزر گئے اور شمو خالہ کے بہو کو بیٹی سمجھنے کے دعوے بھی پھر کر کے اڑ گئے۔ پہلے دلوں میں گلے شکوے جنم لیتے ہیں، شکایات بڑھتی ہیں جو جھگڑوں کو جنم دیتی ہیں۔ ایسی ہی ایک دوپہر جب شمو خالہ کچن میں تھیں، ارم انہیں بریانی دینے آئی۔

''کیا ہوا خالہ آج آپ دوپہر کا کھانا بنا رہی ہیں۔ اریبہ میکے تو نہیں گئی ہوئی۔'' ارم نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا کیونکہ دوپہر کا کھانا اریبہ ہی بناتی تھی۔

''نہ پوچھو بی بی، نہ پوچھو۔'' کچن سے باہر آکر انہوں نے خود کو صوفے پر گرایا۔

''بہو رانی کو امید سے ہوئے صرف دوسرا مہینہ ہے لیکن حالت ان کی ''پورے دنوں'' والی ہوگئی ہے۔''

''کیوں خالہ ٹھیک تو ہے ناں اریبہ۔'' ارم آگے کو جھک کر بولی۔

''ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ کل رات سے الٹیاں ہو رہی ہیں، پڑی ہیں حجرے میں اور میاں صاحب نے ان کی ناز برداری کی خاطر چھٹی کرلی ہے۔ ابھی ڈاکٹرنی کی طرف سے ہو کر آئی ہیں۔ آرام فرما رہی ہیں۔'' انہوں نے اپنی بہو کے لیے طنزیہ انداز اپنایا۔

''سچ پوچھو تم ہم نے بھی دو بچے پیدا کیے۔ ہم پر بھی یہ وقت آیا لیکن جب الٹیاں آتیں تو لیموں پر نمک لگا کر چاٹتے رہے، ساتھ ساتھ گھر کا کام بھی کرتے رہے۔ چلو بھئی کام بھی نپٹ گیا اور طبیعت کو بھی آرام آگیا اریبہ کو یہ مشورہ دیا تو اس سے پہلے ہمارے سپوت بول پڑ گئے کہ امی ویسے ہی اریبہ کا بلڈ پریشر ہائی ہے۔ اتنا نمک استعمال کرے گی تو کہیں کوئی مسئلہ نہ ہوجائے۔ اب بات کرنے کا فائدہ۔ دونوں میاں بیوی کمرے میں کررہے ہیں آرام اور ہم کررہے ہیں کام۔''

یہ کہہ کر انہوں نے اپنا سر ہلایا جبکہ حیران

Digitized by Google

وپریشان ارم شمو خالہ سے یہ بھی نہ کہہ سکی کہ تخلیق کے عمل میں ایک عورت ہی ایک عورت کا ساتھ نہیں دیتی بلکہ اپنے اوپر گزرے ہوئے مشکل حالات بھی بھول جاتی ہے۔

☆☆☆

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ شمو خالہ کے اعتراضات بڑھتے ہی گئے۔ اریبہ بھی شروع شروع میں سب خاموشی سے برداشت کر لیتی تھی۔ اب زچ ہونے لگی تھی اور اکثر پلٹ کر جواب بھی دے دیتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لڑائی جھگڑے بڑھنے لگے اور شمو خالہ کے بہو کو بیٹی سمجھنے کے دعوے گھٹنے لگے۔

ایسے ہی ایک چھٹی والے دن بات اتنی بڑھی کہ اریبہ نے ناراض ہو کر میکے جانے کو سامان باندھ لیا۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ پچھلی ساری رات ننھے شرجیل کی جو دو ماہ کا ہو چکا تھا کچھ طبیعت خراب تھی۔ ساری رات جاگتا رہا اور ظاہر ہے اس کے ساتھ اس کے ماں باپ بھی جاگتے رہے۔ کہیں صبح کے ساڑھے چار بجے بچہ سویا تو ان دونوں کو بھی سکھ کا سانس آیا۔ پھر جو نیند آئی تو دوپہر گیارہ بجے، کے ساتھ ہی دونوں جاگے، وہ بھی شکر تھا کہ چھٹی کا دن تھا۔

ادھر شمو خالہ پیچ وتاب کھاتی ہوئی ناشتے کے بعد دوپہر کے کھانے کی تیاری میں لگی رہیں۔ ان کے غصے کی چنگاریوں کو تو اس وقت صحیح معنوں میں ہوا ملی جب دوپہر کے کھانے کے بعد اریبہ نے نہا دھو کر تیار ہو کر بچے کو بھی تیار کر کے میکے جانے کے لیے بیگ اٹھایا۔ پہلے بھی وہ زیادہ تر چھٹی کے دن ہی شوہر کے ساتھ میکے جاتی تھی اور رات کا کھانا کھا کر ہی واپس آتی لیکن آج تو شمو خالہ کا غصہ ہی عروج پر تھا۔

''پہلے دوپہر تک مہارانی سوتی رہیں۔ گھر کے کسی کام کی فکر نہیں۔ اب بیگم صاحبہ میکے کی تیاری میں ہیں۔ دیکھتی ہوں ابھی۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی لاؤنج میں نکل آئیں جہاں سے گزر کر ان میاں بیوی نے بیرونی دروازے تک جانا تھا۔

''امی جان ہم لوگ شرجیل کی نانی کے یہاں جا رہے ہیں۔ شام تک آجائیں گے آپ لوگ کھانا کھا لیجیے گا۔'' نکھرے صاف ستھرے تیار بابو بنے ان کے بیٹے نے انہیں ''اطلاع'' دی تو انہوں نے بیٹے کو آڑے ہاتھوں لے لیا۔

''میاں! کھانا تو ہم کھا ہی لیں گے۔ ہمیں تمہاری اجازت کی کوئی ضرورت نہیں۔ ویسے تو تمہاری جورو بچے کا بہانہ کر کے سوتی رہیں۔ کسی کام کو ہاتھ نہیں لگایا اور اب شرجیل کی بھی طبیعت ٹھیک ہو گئی اور تمہاری بیگم کی بھی۔''

بلال کے لیے اپنی نفیس طبیعت ماں کا مرچیں چباتا لہجہ بالکل نیا تھا۔ اس کے لیے یہ ایک حیرت کا مقام تھا کیونکہ اس نے ہمیشہ اپنی ماں کو نرم لہجے میں ہی بات کرتے دیکھا تھا۔ اب یہ کیسا انقلاب آیا جبکہ اریبہ بھی میدان میں اتر آئی بقول اس کے۔

''ابھی تو سارے ہفتے کے جمع کپڑے دھوئے ہیں۔ وہ کسی کو نہ نظر آئے۔''

اریبہ کے سوال جواب سے وہ گھمسان کا دن پڑا کہ آخر خالہ نے ارم کو بلوا بھیجا۔ اتنی دیر میں اریبہ بھی تن کرتی بچے کو اٹھائے گھر کے آگے سے گزرتے رکشے کو روک کر میکے روانہ ہو گئی جبکہ ارم اریبہ کو روکتی ہی رہ گئی۔

☆☆☆

بلال کے لاکھ کہنے پر بھی شمو خالہ اریبہ کو لینے اس کے ساتھ نہ آئیں۔ ان کا موقف تھا۔

''یہ کون سا طریقہ ہے کہ ذرا سی بات ہوئی اور بہورانی ناراض ہو کر نکل پڑیں میکے۔ بھئی سسرال میں ''سب کچھ'' برداشت کرنا پڑتا ہے۔'' انہوں نے ہاتھ نچا کر بلال کو باتیں سناتے ہوئے کہا۔ یہ سوچے بنا کہ ذرا سی ذرا سی باتیں ہی بڑھ کر بڑی بڑی ناراضیوں میں تبدیل ہوتی ہیں۔ ناچار بلال خود اریبہ کو لے آیا اور بیوی کی منت سماجت بھی کی کہ امی دل کی بری نہیں برداشت کر لیا کرو، جبکہ اریبہ سوچتی

Digitized by Google

رہ گئی کہ بڑی بڑی تاریخی شخصیات جنہوں نے لوگوں پر ظلم ڈھانے کی مثالیں قائم کی ہیں۔ دل کی وہ بھی بری نہیں تھیں۔

کچھ مہینے تو چھوٹی موٹی کھٹ پٹ کے ساتھ کچھ آگے سرک گئے لیکن اس دفعہ ہونے والا معرکہ خاصا سخت تھا۔ ہوا کچھ یوں کہ بمشکل شرجیل ابھی ساتویں مہینے میں لگا تھا کہ اریبہ دوبارہ امید سے ہوگئی۔ اس دفعہ اس کی حالت پچھلی دفعہ سے بھی زیادہ خراب تھی۔ اوپر سے چھوٹا سا بچہ اور گھر کا بھی کام۔

ایسا ہی ایک چھٹی کا دن تھا۔ اریبہ کی آزمائش کا دن۔ آج سب کی چھٹی ہوگی اور دوپہر میں خاصا اہتمام۔ ایسے میں شمو خالہ نے چھوٹے طلال کو بکرے کی تازہ کلیجی لانے کے لیے بازار بھیجنا چاہا تو اریبہ نے مدد طلب نظروں سے بلال کو دیکھا کیونکہ اس دفعہ اریبہ گوشت، کلیجی وغیرہ ان چیزوں کو کھانا تو دور کی بات ان کی بو سے بھی الرجک تھی۔ ان کی بو اس کے دماغ کو چڑھتی، وہ الٹیاں کرنے لگتی۔ وہ کرتی بھی کیا یہ سب اس کے اختیار سے باہر تھا۔

''ایسا کرو دلہن آج پلاؤ بنالو اور طلال کلیجی لے کر آتا ہوگا وہ میں پکالوں گی۔''

شموخالہ نے ''پروگرام'' ترتیب دیا۔ جبکہ اریبہ نے اس دفعہ قدرے گھور کر بلال کو دیکھا تو بالآخر ''بے چارے'' بلال کو بولنا ہی پڑا۔

وہ امی جی کلیجی نہ منگوائیں، میں آپ کے لیے ہوٹل سے بہترین سا کلیجی کا سالن لے آتا ہوں۔''

''کیوں میاں یہ آج تمہیں ہوٹل کے سالن کی یاد کہاں سے آگئی۔ جہاں تک مجھے خیال پڑتا ہے تم تو باہر کے کھانے زیادہ پسند نہیں کرتے۔'' پان کے پتے پر کتھا چونا لگاتے ہوئے وہ مخصوص انداز میں بولیں۔

''اور ویسے بھی کوئی سالن ہوتا ہے ہوٹل کا، نرا ہلدی سے بھرا ہوا۔ ہماری اماں بہشتن کہتی تھیں کہ جب بھی کلیجی پکاؤ اچھی طرح سے دھو کر ہلکی آنچ میں پکار کر اوپر سے گرم مسالہ اور قصوری میتھی چھڑکو۔'' وہ یادوں میں کھو کر بولیں تو بلال نے جلدی سے انہیں وجہ بتانے کی کوشش کی کہیں وہ ''یادوں کی بارات'' میں کھو ہی نہ جائیں۔

''وہ امی جان کلیجی پکے گی تو اس کی مخصوص بو کی وجہ سے اریبہ کا دل خراب ہوگا۔ اسے الٹیاں شروع ہوجائیں گی۔'' وہ سر جھکا کر اپنے بیٹے کو گود میں بٹھائے مصروف سے انداز میں بولا۔

''اے میاں! پہلے تو اپنا جملہ درست کرو۔ کھانے کی چیزوں کے لیے بو کا لفظ استعمال نہیں کرتے۔ سخت گناہ ہوتا ہے اور جب تمہاری بیگم گھر میں وہ پکاتی ہے کیا کہتے ہیں اسے موئے نوڈلز اور وہ مکرانی سے نگوڑ مارے۔'' انہوں نے باقاعدہ اپنے نازک دماغ پر انگلی رکھ کے زور ڈالا۔

''میکرونی امی!'' بلال۔ نے انہیں یاد دلایا۔

''ہاں ہاں وہی مکرونی تو ہم نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔ اب اگر ہم کلیجی پکار ہے ہیں تو تمہیں کیا اعتراض ہے۔ ویسے بھی ہماری بہورانی کے اعتراض اللہ ہی دور کرے گا پہلے اسے کپڑے دھونے پر اعتراض تھا کہ ''ان'' سے نہیں دھلتے کپڑے ایسی حالت میں ہم نے کپڑے دھونے کے لیے ملازمہ لگوادی اب پکانے پر اعتراض کل کو تمہاری لاڈو گھر میں ہماری موجودگی پر اعتراض کریں گی۔ بچے تم وہ اعتراض بھی دور کرنے کی کوشش کرنا۔''

وہ دور کی کوڑی ڈھونڈ لائیں جبکہ بلال نے مدد طلب نظروں سے ابا کی طرف دیکھا۔ وہ ٹی وی دیکھتے ہی صوفے پر لیٹے لیٹے خراٹے لینے لگے تھے۔ چھٹی کے دن وہ صرف سوتے ہی تھے بے شک انہیں گھر کا کوئی بھی گوشہ ملتا۔ چھوٹا طلال مذاق میں کہتا۔

''شکر ہے ابا کو باتھ روم میں نیند نہیں آجاتی۔''

آخر اپنی مدد آپ کے تحت اسے خود اٹھنا پڑا۔

''امی جان! اتنی سی بات کو کیوں اتنا بڑھا رہی ہیں۔'' وہ ماں کے پاس جا بیٹھا اور بازو ان کے گرد

Digitized by Google

لپیٹ کران کے کندھے پر سر رکھ دیا جس سے شمو خالہ کا غصہ خاصا کم ہو گیا جبکہ اریبہ پیر پٹختی ہوئی کچن میں چلی گئی۔ بلال اسے منانے کے لیے دل ہی دل میں ڈائیلاگ ترتیب دینے لگا۔

اریبہ نے دوسرے بیٹے کو جنم دیا تھا۔ اس مرتبہ کچھ پیچیدگیوں کی وجہ سے اس کا میجر آپریشن ہوا تھا۔ گھر میں کئی دن جو خوشی اور ہلچل کا سماں رہا۔ وہ آہستہ آہستہ شمو خالہ کے اعتراض سے ختم ہونے لگا بلکہ گھر کی فضا میں تناؤ کی کیفیت بڑھنے لگی۔ شمو خالہ کو کبھی اریبہ کے آرام پر اعتراض ہوتا کبھی اپنے بیٹے پر جو اریبہ کی ناز برداریاں کرتا نہ تھکتا۔

اپنے ہاتھ سے فروٹ کاٹ کر کھلاتا جبکہ شمو خالہ اپنے دور میں جی رہی تھیں۔ جب آدمی اپنی ماؤں کے سامنے بیویوں کے ساتھ اجنبیوں جیسا برتاؤ کرتے۔ انہیں یہ کھلتا کہ آفس سے آتے ہی بلال اپنے کمرے میں گھس جاتا ہے۔ اب شمو خالہ کو بھی اپنی ''اولاد'' کے چھن جانے کا افسوس کھائے جاتا۔

اس دن بھی وہ آفس سے گھر آیا تو اریبہ نے آئس کریم کھانے کی فرمائش کر دی جو ظاہر ہے بلال نے فوراً ہی پوری کر دی۔ ابھی وہ آئس کریم لے کر اندر ہی آیا تھا کہ شمو خالہ بھی اس کے پیچھے اس کے کمرے میں پہنچ گئیں۔

''خوب بھورانی خوب۔ ابھی ''چھلے'' میں آئس کریم کھاؤ پھر ''ہائے اوئی کرنا'' پھر ڈاکٹروں کی فیس بھرنے کے لیے اور تمہاری ناز برداریوں کے لیے ہو گا یہ کاٹھ کا الو۔''

کمر پر ہاتھ رکھے انہوں نے بیٹے کو گھورا لیکن آج تو بلال کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا۔

''امی آپ چاہتی کیا ہیں آخر؟ کیسے اعتراض ہیں آپ کے جو ختم ہونے میں ہی نہیں آتے۔ آپ تو ہمیشہ کہتی تھیں کہ میں بچپن ہی سے کیئرنگ ہوں۔ یاد کریں جب آپ بیمار ہوتی تھیں ہمیشہ میں آپ کا خیال رکھتا تھا۔ اس وقت تو آپ مجھے یہ نصیحت کرتی تھیں کہ بیٹا ہمیشہ ایسا ہی رہنا اور اب اگر میں اریبہ کا خیال رکھتا ہوں تو آپ کو کیا اعتراض ہے۔ اِسے تو آپ نے ہی پسند کیا تھا ناں!''

''ہاں کیا تھا پسند لیکن یہ تو نہیں کہا تھا کہ تم اس کے غلام ہی بن جاؤ۔'' شمو خالہ نے غصے سے ہاتھ نچا کر کہا اور کمرے سے باہر نکل گئیں جبکہ بلال کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

''ارے خالہ! یہ سب کیا ہے۔'' ارم نے حیران ہو کر مزدوروں کو دیکھا جو اوپر والے پورشن میں جہاں دو کمرے، ایک باتھ روم اور کچن وغیرہ تھے یہ کمرے زیادہ تر مہمانوں وغیرہ کو ٹھہرانے کے ہی کام آتے تھے۔ سامان شفٹ کر رہے تھے کیونکہ پچھلی شام ہونے والی جھڑپ میں بلال نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ وقت آنے سے پہلے کہ سب ایک دوسرے کی شکلوں سے بیزار ہو جائیں ہمیں علیحدہ ہو جانا چاہیے۔ اگر دلوں کے فاصلے مزید نہیں بڑھانے تو وجود میں فاصلہ رکھنا ضروری ہے۔ اس لیے صبح ہوتے ہی اس فیصلے پر عمل درآمد کرتے ہوئے سامان اوپر والے پورشن میں شفٹ کرنے کے لیے مزدوروں بلوا لیا تھا۔

شمو خالہ کے آنسو تھے کہ تھمتے ہی نہ تھے جبکہ ارم تاسف سے بیٹھی شمو خالہ کو دیکھتی رہی۔

''میں غلط تھی ارم جو کہتی تھی کہ وہ ساس ظالم ہوتی ہیں جو بہوؤں سے لڑتی ہیں۔ اب آ کے پتا چلا۔'' انہوں نے آنکھوں پر رومال رکھا۔

''صحیح کہتے تھے سب کہ جب بہو آئے گی تو شمو بیگم تمہیں پتا چلے گا۔'' جبکہ ارم یہ سوچتی رہ گئی کہ آخر یہ ساس بہو کا رشتہ برابر کے اصول پر کیوں نہیں چل سکتا۔ کہیں ساس ظالم تو کہیں بہو جبکہ اکثر شوہر محض دنیا کو دکھانے کو کہ ہم ''جورو کے غلام'' کی داستانیں بنیں گے جبکہ حقیقت تو صرف اتنی ہے کہ تھوڑا دل وسیع کرنے کی ضرورت ہے۔

☆

Digitized by Google

ناولٹ

"اوہ واؤ...... یہ اجنبی حسینہ کون ہے؟"

اوپری منزل کی سیڑھیوں سے ایک نازک اندام اور دلکش نقوش کی حامل لڑکی زینہ طے کرتی، نیچے آرہی تھی۔ ولی کی آنکھیں حیرت و استعجاب سے پھیل گئیں اور لب سیٹی کے انداز میں سکڑ گئے۔ وہ لڑکی اب بڑے دھڑلے سے امی کے کمرے میں گھس چکی تھی۔

"ارے یہ محترمہ ہیں کون؟ جو اتنی رات گئے ہمارے گھر میں اتنے استحقاق سے گھوم رہی ہیں؟ ہوں......اوپر والی منزل سے اتر رہی ہے تو مطلب چچی جان کی کوئی رشتہ دار ہوگی۔ مگر...... وہ امی کے

ایک تو اکلوتی اولاد اور اوپر سے خاندان بھر کی واحد لڑکی اور سب سے بڑھ کر گھر کی خواتین کا بے جا لاڈ پیار اور گھر کے کاموں سے ہمیشہ اسے دور رکھنا۔ ان تمام عوامل نے اسے خاصا آرام طلب اور سر پھرا بنا دیا تھا۔

کہتے ہیں کہ خالی دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے مگر شجر کی خود ساختہ اصطلاح کے مطابق خالی پیٹ چوہوں کا گھر ہوتا ہے اور چوہوں سے شجر صاحبہ حد درجے خائف۔ لہٰذا نہ رہے گا خالی پیٹ اور نہ رہیں گے چوہے...... سو اب بھی وہ بڑے انہماک سے فرنچ فرائز کھانے کے بعد پزا کو قریب کر رہی تھی

امبر خالد

یہ دل بڑا نادان

کمرے میں......" وہ حیرت زدہ سا واش روم کی سمت بڑھ گیا کہ جو کوئی بھی ہے، صبح امی سے دریافت کرنے پر یہ معمہ تو حل ہو ہی جائے گا۔

☆☆☆

ٹیبل پر رکھی پلیٹ میں فرنچ فرائز کا پہاڑ، ایک عدد ریگولر پزا، ڈیڑھ لیٹر کی کولڈ ڈرنک مع سموسے اور کرنکل چپس......

"نہ، نہ نہ...... آپ غلط سمجھے، یہ کسی مہمان کی ضیافت کا انتظام نہیں ہے۔ یہ سارا اہتمام شجر بنت متین خان نے 'اپنی دعوت آپ' کے تحت، خود اپنے لیے کیا ہے اور یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے۔ یہ مینیو معمولی سے ردوبدل کے ساتھ روزانہ ہی ترتیب دیا جاتا ہے۔ ماں کی پھٹکار اور تائی امی کا پیار، وہ سب کچھ سہہ جاتی مگر کھانے سے رغبت برقرار۔

کہ ولی کی آمد نے سارا مزا کرکرا کر دیا۔

"اور بھئی یو کو زونا (چائنیز ریسلر) آج کس سے مقابلہ ہے تمہارا؟" ولی نے اس کے کھانے کی رفتار پر طنز کیا۔

"فی الحال تو تم سے ہی، تیاری پکڑ لو۔" وہ کہاں کسی سے دبنے والی تھی، فوراً چمک کر بولی۔

"تیاری نہیں دل کہو۔ دل ہی پکڑنا پڑے گا کیونکہ تمہارا ایک گھونسہ بھی نہ سہ سکے گا غریب اور فوراً دار فانی سے کوچ کر جائے گا۔" ولی اس کے فربہ جسم کو کڑی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"جلتے ہی رہنا تم، میری قابل رشک صحت سے۔ تب ہی دن بہ دن تمہیں سوکھے کا مرض لاحق ہوتا جا رہا ہے۔" شجر نے اس کے اچھے خاصے اسمارٹ بدن کو سوکھا کہا تو اس کے تن بدن میں آگ



لگ گئی۔

"او ہیلو۔ لڑکیاں مرتی ہیں میری اسمارٹنس پر۔"

"اسمارٹنس نہیں، اسٹیکر۔ ہاہاہا......" ایک چھت پھاڑ قہقہہ لگا کر اس نے کولڈ ڈرنک منہ سے لگالی۔

"اونہہ۔ ڈولی بیندرے کی بہن۔" وہ نخوت سے کہہ کر وہاں سے واک آؤٹ کر گیا۔

☆☆☆

"ولی! کہاں جا رہے ہو بیٹا؟" ولی تیار ہو کر باہر نکل رہا تھا تب ہی امی کی آواز پر اسے رکنا پڑا۔

"جی، ایک دوست کی طرف جا رہا تھا۔"

"کہاں؟" امی کا "کہاں" برقرار تھا۔

"اوفوہ، پورا ایڈریس سمجھاؤں کیا؟" ویسے ہی وہ پورے پندرہ منٹ لیٹ ہو چکا تھا، اوپر سے امی کی تفتیش اسے وہ بری طرح جھنجلا گیا۔

"بس یہ بتا دو کس طرف جا رہے ہو؟" جانے بغیر امی اس کی جان کبھی نہ چھوڑتیں۔

"طارق روڈ، کیوں؟"

"وہ دراصل کچھ کام تھا۔"

"اور وہ کام یقیناً شجر میڈم کے متعلق ہو گا لہٰذا ایڈوانس سوری۔" اس نے ماں کی بات بیچ میں سے اچک کر فوراً ہری جھنڈی دکھائی اور جانے کے لیے پر تولنے لگا کہ عقب سے ایک بھاری ہاتھ نے اس کی شرٹ پشت سے دبوچ کر اس کا رخ اپنی جانب موڑ لیا۔

"طارق روڈ جا رہے ہو تو مجھے بھی ڈراپ کرتے جاؤ۔ مجھے ڈالمن مال میں کچھ کام ہے۔" ولی نے ہکا بکا ہو کر اپنی شرٹ کی جانب دیکھا جو شجر کے کھسوٹنے کے باعث پینٹ سے باہر آ کر اپنی ناقدری کا رونا رو رہی تھی۔

"یو......" وہ بے بسی سے مکا ہوا میں لہرا کر رہ گیا۔

"بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارا کام۔" وہ پھاڑ کھانے والے انداز میں بولا اور شرٹ درست کرتا باہر نکل گیا۔

"دیکھا تائی امی! آپ نے، اپنے بیٹے کو۔" شجر اس عزت افزائی پر موٹے موٹے آنسوؤں سمیت شکوہ کناں ہوئی۔

"تم بھی تو اسے غصہ دلانے والے کام کرتی ہو۔ کیا ضرورت تھی اس کی شرٹ کھینچنے کی۔" تائی امی نے اس کے آنسو صاف کیے اور پیار بھری سرزنش کی۔

"بیٹا! منگیتر ہے وہ تمہارا۔ تھوڑا لحاظ کیا کرو۔" تائی امی کی بات پر وہ زخمی نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

"ایسے ہوتے ہیں منگیتر؟ ہر وقت جلتے توے پر بیٹھا رہتا ہے۔ میرا مذاق اڑاتا رہتا ہے۔" وہ معصومیت سے آنکھیں مسلتے ہوئے بولی۔

"اچھا چلو چھوڑو ان باتوں کو، چائے پیو گی؟" وہ اس کا دھیان بٹانے کو بولیں۔

"جی، اور ساتھ میں رول اور سموسے بھی۔" وہ بچوں کی سی خوشی سے بولی۔

"اف......" تائی امی اپنی آفر پر سر پیٹ کر رہ گئیں۔

☆☆☆

ولی اپنے دوستوں کے ہمراہ کیفے ٹیریا میں بیٹھا کولڈ ڈرنک سے لطف اندوز ہو رہا تھا تب ہی کسی نے ایک زوردار ہاتھ اس کے کندھے پر مارا۔ اس نے چونک کر پیچھے مڑ کر دیکھا تو اپنے دور پار کے کزن ایفاز کو کھڑے ہوئے پایا۔ ایفاز اس یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کر رہا تھا۔ انتہا درجے کا کمینہ اور چھچھورا سا یہ شخص اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔

"اور بھئی پرنس! کیا حال ہیں؟" ایفاز مصنوعی لگاوٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے برابر

Google

براجمان ہوگیا۔ ولی نے اسے مشکوک نظروں سے گھورا۔ وہ اس کے پاس تب ہی آتا تھا جب اس کے ہاتھ کوئی دل جلانے والا نسخہ ہوتا۔

''ٹھیک ہوں، تم سناؤ۔'' ولی نے جبراً مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں سنائیں گے، ضرور سنائیں گے۔'' ایفاز پوری بتیسی باہر کرکے بولا۔

''کیا گانا؟'' ولی کے ایک دوست نے لقمہ دیا۔

''نہیں بھئی خوش خبری۔'' ایفاز سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''کیسی خوش خبری؟'' ولی کے کان کھڑے ہوگئے۔

''بھئی مابدولت کی منگنی ہوگئی ہے۔ وہ بھی خاندان کی سب سے خوب صورت لڑکی سے۔'' ایفاز نے فرضی کالر جھاڑے۔

''اونہہ...... ہمیں کیا خبر کہ یہ بات سچ ہے یا جھوٹ؟ ہم کون سا تمہارے خاندان کی لڑکیوں کو جانتے ہیں۔'' ولی کے دوست امجد نے ناک پر سے مکھی اڑائی۔

''بھئی اپنے ولی عہد تو جانتے ہیں ناں، ہمارے خاندان کو۔ مناہل کو تو اچھی طرح جانتے ہو ناں، وہی اظہر ماموں کی سب سے چھوٹی بیٹی بلکہ یہ دیکھو۔'' اس نے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور منگنی کی تصویر کھول کر موبائل ولی کے حوالے کردیا، ولی کے سارے دوست موبائل پر جھک گئے۔

تصویر میں مناہل واقعی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ ولی کے سارے دوست ایفاز کی قسمت پر رشک کررہے تھے۔ ولی بے اختیار مناہل اور شجر کا موازنہ کرنے لگا۔ مناہل گو کہ خوب صورت تھی مگر شجر کے نقوش مناہل سے زیادہ جاذب نظر تھے۔ بس یہ تھا کہ مناہل نے خود کو گروم کیا ہوا تھا اور شجر...... سرتاپا گوشت کا پہاڑ۔

ہمہ وقت تین مختلف رنگوں کے کپڑوں میں ملبوس، شلوار کسی اور سوٹ کی تو دوپٹہ کسی اور لباس کا۔ اسے اپنی ظاہری شخصیت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ فریج کھول کر تو وہ کئی کئی گھنٹے کھڑی رہ سکتی تھی مگر وارڈ روب کے آگے کھڑے ہونے میں تین سیکنڈ بھی محال لگتے۔ ادھر اُدھر ہاتھ مار کر وہ بس ایک شلوار، قمیص اور دوپٹہ برآمد کرلیتی، چاہے وہ کسی بھی رنگ و نسل سے تعلق رکھتا ہو۔

''کیا ہوا پرنس؟ کھو گئے ناں؟'' ایفاز کی تفاخر سے پُر آواز اسے خیالات کی یورش سے باہر لے آئی۔

''کھونے کی کیا بات ہے، کوئی پہلی بار تھوڑی دیکھ رہا ہوں اسے۔'' ولی نے موبائل اسے واپس دیتے ہوئے ناگواری سے کہا۔

''ویسے تم نے آج تک اپنی منگیتر کی تصویر نہیں دکھائی ہمیں۔'' امجد کو بھی بروقت یاد آیا۔

''مجھے یوں سرعام دوستوں میں منگیتر کی تشہیر کا کوئی شوق نہیں ہے۔'' ولی نے سر جھٹک کے ایفاز پر چوٹ کی۔

''تشہیر کا شوق نہیں ہے یا منگیتر ہی اس قابل نہیں کہ اس کی تشہیر کی جائے۔'' ایفاز خاندان ایک

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے
بہنوں کیلئے خوبصورت ناول
گلیاں یہ چوبارے
قیمت 400/ روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر: 32735021

Digitized by Google

ہونے کے باعث سب جانتا تھا۔ اسی لیے بڑی خباثت سے مسکرا کر اس پر طنز کیا۔

"تیری تو......" ولی اس کا گریبان دبوچنے کو آگے بڑھا ہی تھا کہ موبائل پر آنے والی کال نے اس کی توجہ کھینچ لی۔

"ابو کالنگ" دیکھ کر اسے مجبوراً ایفاز کو چھوڑ کر کال ریسیو کرنی پڑی۔ جانتا تھا کہ ابو کال ریسیو نہ کرنے پر بہت سخت سناتے تھے اور اسی ایک پل کا فائدہ اٹھا کر ایفاز وہاں سے نو دو گیارہ ہو گیا۔

☆☆☆

"سعد بیٹا شجر کو بلا کر لاؤ، سب گاڑی میں بیٹھ چکے ہیں اور وہ ابھی تک کمرے سے باہر نہیں آئی۔ ہم آل ریڈی لیٹ ہو چکے ہیں۔" امی نے سعد کو شجر کے کمرے کی جانب دوڑایا۔ آج معین صاحب اور سکندر صاحب کے کزن کے بیٹے کا ولیمہ تھا۔ نکلتے نکلتے بھی کافی ٹائم ہو چلا تھا۔ اب جو دیکھا تو شجر صاحبہ ندارد تھیں۔

"آپی آ رہی ہیں۔" سعد کا سیڑھیاں اترتے ہوئے با آواز بلند نعرہ گونجا۔

"جلدی آ جاؤ شجر!" امی نے ایک بار اور اسے تاکید کی اور سعد کے ساتھ گاڑی کی جانب چل دیں۔

ولی تھری پیس میں ملبوس نک سک سے تیار گاڑی سے ٹیک لگائے شدید کوفت کے عالم میں کھڑا تھا۔

"بس بیٹا! تم گاڑی میں بیٹھو، شجی بھی آ رہی ہے۔" امی نے اسے یوں بے زار دیکھا تو جلدی سے بولیں۔ تب ہی سامنے سے شجر بھی تیز قدموں سے آتی دکھائی دی۔ ولی نے اس کا ناقدانہ جائزہ لیا۔ وائٹ کھلے پائنچوں کا پلازو اور فیروزی جدید اسٹائل کی ایئر لائن فراک جس پر سفید موتیوں کا نہایت ہی عمدہ اور نفیس کام کیا گیا تھا۔ ڈریس بلاشبہ بہت خوب صورت تھا مگر اسے زیب تن کرنے والا سراپا بھی اس کے شایان شان ہوتا تو یقیناً اس لباس کی قدر و قیمت دو چند ہو جاتی۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹ تھا۔

اتنا ڈھیلا ڈھالا پلازو بھی موصوفہ کی ٹانگوں سے بامشکل جدا تھا اور فراک بے چاری کا عالم یہ تھا کہ مانو دس سیر گوشت کے تھیلے میں بیس سیر گوشت زبردستی ٹھونس کر سادیا گیا ہو۔ ولی کی کوفت اور بے زاری سوا ہو گئی۔ اس نے ایک قہر آلود نگاہ اس کے پھنسے ہوئے سراپے پر ڈالی اور دوسری نظر اس کے ہاتھ میں موجود بڑی سی چاکلیٹ پر...... یعنی کہ گھر سے میرج ہال تک کے مختصر دورانیے میں بھی اپنے معدے کو آرام دینا میڈم کو قطعاً منظور نہ تھا۔ ولی نے بڑے جارحانہ انداز میں ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تھی۔ شجر نے چونک کر اسے دیکھا اور لاپروائی سے کندھے اچکا دیے۔

میرج ہال میں تو جیسے رنگ و بو کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ زرق برق اور زرتار آنچلوں کی بہار نے صنف مخالف کی نگاہیں خیرہ کر رکھی تھیں۔

شجر کی متلاشی نگاہیں ولی کو تلاش رہی تھیں تب ہی وہ اسے ایک خوب صورت طرح دار لڑکی سے محو گفتگو نظر آیا۔ وقفے وقفے سے دونوں کے قہقہے بھی فضا میں گونج رہے تھے۔

"اونہہ، اپنی منگیتر سے تو بات کرنا درکنار، پیار سے دیکھنے پر بھی گویا ٹیکس لاگو ہے۔ دوسروں پر کیسے محبت کے ٹوکرے نچھاور کرنے کو تیار رہتا ہے ایڈیٹ۔" شجر نے جلتے کلستے کوئی چوتھی بار چاکلیٹ نکال کر اس کا ریپر اتارنا شروع کیا۔

"اب بس بھی کرو، کیا اسی سے پیٹ بھرنے کا ارادہ ہے؟" امی نے اس کے ہاتھ سے چاکلیٹ جھپٹ کر اپنے قبضے میں کی۔

"ارے تین چار چاکلیٹس سے کیا ہوتا ہے چچی جان! اس سے تو بے چاری آپی کے معدے کا ایک کونا بھی سیراب نہ ہوگا۔" موبائل پر مصروف فہد نے پوری سنجیدگی سے کہا۔ مگر سعد کی دبی دبی ہنسی اور پھر فہد کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر دیکھنا۔ شجر کو سارا مطلب

Digitized by Google

سمجھا گیا۔

"شٹ اپ۔" شجر نے دانتوں کو خوب کچکچا کر ان دونوں کو دیکھا۔ عام حالات میں اس طرح کے مذاق کی وہ بالکل پروا نہیں کرتی تھی مگر ابھی چونکہ ولی کی وجہ سے اس کا موڈ قدرے آف تھا۔ سو اسے ہر بات پر ہی پتنگے لگ رہے تھے۔

"سفید چوہیا، چھپکلی۔" شجر کی کینہ توز نظریں ابھی بھی ان دونوں کا احاطہ کیے ہوئے تھیں جو پچھلے آدھے گھنٹے سے باتوں میں مصروف تھے۔ کافی دیر اپنی کرسی پر پہلو بدلتے بالآخر اس کی برداشت کی حد ختم ہوگئی۔

"ایک منٹ امی! میں بس ابھی آئی۔" وہ ان دونوں کے سروں پر پہنچ گئی۔

"السلام علیکم!" اس نے مسکراتے ہوئے یوں بے تکلفی سے اس لڑکی کی جانب ہاتھ بڑھایا گویا پرانی شناسائی ہو۔

"وعلیکم السلام۔" لڑکی نے ہچکچاتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما۔

"ولی! بھئی تعارف تو کرواؤ۔" شجر نے ولی کو دیکھ کر کہا جس کے چہرے پر تناؤ صاف نظر آرہا تھا۔ کچھ دیر تک وہ اسے غصے سے گھورتا رہا پھر ذرا سنبھل کر بولا۔

"یہ میری کلاس فیلو ہیں فرحین!" اتنا کہہ کر ولی پھر اسی لڑکی کی جانب متوجہ ہوگیا۔

"ارے تعارف تو مکمل کرواؤ ناں۔ مطلب، میں کون ہوں ان کو یہ تو بتاؤ۔" شجر نے دل ہی دل میں اس کی تلملاہٹ سے محظوظ ہوکر کہا۔

"ہاں ہاں۔" ولی یک دم گڑبڑا گیا۔

"یہ کزن ہیں شجر! میرے چچا کی بیٹی۔"

"بس کزن۔" شجر اٹھلائی اور اس کی گھوریوں کی پروا کیے بغیر فرحین سے مخاطب ہوئی۔

"جی میں ولی کی کزن ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی منگیتر بھی ہوں۔" وہ اطمینان سے سینے پر ہاتھ باندھ کر بولی، جواباً فرحین کی نگاہیں استعجاب سے پھیل گئیں۔ اس نے گھبرا کر ولی کو دیکھا، اس کے چہرے پر خفت کے آثار دیکھ کر اسے شجر کی بات کی سچائی میں کوئی شبہ نہ رہا اور اب فرحین کی آنکھوں میں استعجاب کی جگہ استہزا نے لے لی۔ اس نے ہلکا سا رخ پھیر کر اپنا ہاتھ ہونٹوں پر رکھ کر امڈنے والی ہنسی کو روکا اور پھر نارمل ہو کر بولی۔

"ہاں یہ تو ہم سب فرینڈز کے علم میں تھا کہ ولی کی منگنی کم عمری میں ہی اس کی کزن سے ہو چکی ہے مگر......" اور اس "مگر" کے آگے کا مفہوم ولی اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیسے وہ شجر کی بچی پر کوئی منتر پھونک کر اسے منظر سے غائب کردے۔

"آہم......اچھا فرحین! ہم کل یونیورسٹی میں ملتے ہیں، اوکے۔" وہ اسے غائب کرنے پر تو قادر نہیں تھا سو خود ہی منظر سے ہٹ جانے کو بہتر سمجھا۔

"اوکے بائے۔" فرحین نے ایک ادا سے ہاتھ کی انگلیاں لہرائیں۔ چہرے کے تاثرات ایسے تھے کہ جیسے ان کے جاتے ہی خوب زور کا قہقہہ لگا کر ہنس دے گی۔ ولی نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر شجر کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹا۔

"چلو۔" وہ دانت پر دانت جما کر غرایا۔ کچھ دور لے جا کر وہ اسے ایک نسبتاً تنہا گوشے میں گھسیٹ لایا۔

"کیا ضرورت تھی تمہیں وہاں آجانے کی؟" تنہائی میسر آتے ہی وہ اسے پر برس پڑا۔

"کیوں نہیں تھی ضرورت۔ تم جب سے یہاں آئے ہو اسی چمگادڑ سے چپکے کھڑے ہو۔ کیوں؟ مجھے اگنور کر کے ایری غیری لڑکیوں کو مجھ پر فوقیت دے رہے ہو۔ بتاؤ کیوں کر رہے ہو ایسا؟" شجر نے غصے سے چہرے پر آئی چھیڑ چھاڑ کرتی آوارہ لٹ کو جھٹک کر پیچھے دھکیلا۔

"اوہو...... ہو...... ہو...... اگنور؟" ولی نے اس کی جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے استہزائیہ قہقہہ لگایا۔

Digitized by Google

''اگنور تو تم ایسے کہہ رہی ہو جیسے میں تو گھر میں تمہارے ساتھ پورا دن بتا دیتا ہوں۔ تمہیں لے کر لانگ ڈرائیو پر نکل جاتا ہوں، ریسٹورنٹ میں لے جا کر تمہیں چائنیز کھلواتا ہوں۔'' غصے میں اس کے جو منہ میں آ رہا تھا بکے جا رہا تھا۔

''ہاں کرتے تو نہیں ہو یہ سب مگر تمہیں فیانسی ہونے کے ناتے کرنا تو چاہیے ناں۔'' شجر نے بھی ڈھٹائی کی انتہا کر دی۔

''لانگ ڈرائیو اور تمہارے ساتھ......؟ ہاہاہا۔''

وہ پھر مضحکہ اڑاتے ہوئے ہنسا۔

''تمہیں لانگ ڈرائیو پر لے جانے کے لیے مجھے کار میں ٹرک کے ٹائر لگوانے پڑیں گے تاکہ بار بار پنکچر ہونے کا خطرہ نہ رہے بلکہ نہیں...... اس سے بہتر ہے کہ تمہارے گلے میں مضبوط سا رسہ ڈال کر تمہیں چڑیا گھر لے جایا جائے تاکہ جنگلی کرنے کا تمہارا شوق اچھی طرح سے پورا ہو جائے۔'' ولی کے طنز و تضحیک میں ڈوبے جملے اسے آج پہلی بار بُری طرح سے کھلے۔ اس سے پہلے وہ اس کی ہر بات کو ناک سے مکھی کی طرح اڑا دیتی تھی۔

شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس سے قبل وہ اس کے اور اپنے مابین بندھے بندھن کو بہت مضبوط تصور کرتی تھی اتنا کہ وہ چاہے بھی تو اس رشتے سے انحراف نہ کر سکتا تھا۔

تائی امی اور تایا ابو کے والہانہ التفات کو ہی اس نے بہت جان لیا تھا مگر آج پہلی بار اسے یوں کسی انجان لڑکی کے ساتھ گھلتے ملتے دیکھ کر جانے وہ کیوں خود کو غیر محفوظ محسوس کر رہی تھی۔

''تمہیں آخر غصہ کس بات کا ہے؟ ایک تعارف ہی تو کروایا ہے میں نے۔ کیا لوگ اپنی دوستوں میں منگیتروں کو متعارف نہیں کرواتے؟''

''منگیتر اگر اس قسم کے جثے کی مالک ہوں تو نہیں کرواتے، او کے۔'' ولی نے ہاتھ سے اس کے سراپے کی جانب اشارہ کیا۔

''بائی گاڈ، اب وہ یونیورسٹی میں چٹخارے لے لے کر سب کو بتائے گی۔ چلو یہ بھی شکر ہے کہ ایگزام نزدیک ہونے کے باعث کلاسز آف ہونے والی ہیں ورنہ سارے کلاس فیلوز نے میرا تماشا لگا دینا تھا۔'' وہ خود ہی بڑبڑائے جا رہا تھا کہ اسی اثناء میں ان دونوں پر فلیش چمکی۔

''پرفیکٹ کپل۔'' ایفاز کی آواز پر ولی نے چونک کر سامنے دیکھا۔ ایفاز بڑی پھرتی سے اپنا کام دکھا چکا تھا۔ وہ ہاتھ میں موبائل لہراتے ہوئے بڑی کمینگی سے مسکرایا۔

''بھئی یونیورسٹی کو خیرباد کہنے والے ہو۔ اپنے یونیورسٹی فیلوز کو فیانسی کا دیدار کرائے بغیر ہی رخصت ہو جاؤ گے؟ نہ نہ نہ...... یہ کم از کم مجھے منظور نہ تھا۔''

''ایفاز بھائی! کسی کی بلا اجازت تصویر لینا انتہائی لغو فعل ہے اور کسی لڑکی کی تصویر کی یوں سرِعام تشہیر کرنا اس سے بھی زیادہ غیر اخلاقی حرکت ہے۔ برائے مہربانی فوراً سے پیش تر وہ تصویر ڈیلیٹ کر دیں۔'' شجر ایفاز کا مقصد سمجھ کر بھنا کر بولی۔

''ایفاز ملک انتہائی گھٹیا انسان ہو تم۔'' ولی کی غصے سے رگیں تن گئیں۔

''کام ڈاؤن، کام ڈاؤن پرنس!'' ایفاز ولی کے روبرو آ کر کھڑا ہو گیا۔

''السلام علیکم! ملک انکل۔ کیسے ہیں آپ؟''

ولی نے ایفاز کی پشت سے جھانک کر کسی کو سلام کیا۔ ایفاز نے پلٹ کر اپنے عقب میں اپنے والد محترم کو دیکھنا چاہا اور اسی پل کا فائدہ اٹھا کر ولی نے بڑی سرعت سے اس کے ہاتھ سے موبائل اچک لیا۔ اس سے پہلے کہ ایفاز، ولی کی چال کو سمجھ پاتا، ولی نے بھی اپنی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً اپنی اور شجر کی تصویر ڈیلیٹ کر ڈالی۔

اس نے بڑے سکون کے ساتھ موبائل ایفاز کو واپس کیا اور شجر کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

دن یوں ہی پر لگا کر اڑتے چلے جا رہے تھے۔ رات دن کی آنکھ مچولی میں گزرتے وقت کا پتا ہی نہ

Digitized by Google

چلا اور ولی کا تعلیمی دور تکمیل کا مرحلہ عبور کر گیا۔ شجر نے تو بی اے کر کے کب کا تعلیم کو خیر باد کہہ دیا تھا اور ولی تعلیم مکمل ہوتے ہی نوکری کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا۔ اپنے ملک میں اچھی نوکری کا حصول تو جوئے شیر لانے کے مترادف تھا لہٰذا ایک دوست کے توسط سے اسے سعودی عرب میں آئل کمپنی میں نسبتاً بہتر جاب آفر ہوئی تو اس نے گھر والوں کی شدید مخالفت کے باوجود اسے جوائن کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

یہ نہیں تھا کہ ان کے گھر کے معاشی حالات اچھے نہیں تھے۔ باپ اور چچا دونوں بہت اچھی پوسٹ پر کام کرتے تھے۔ ان کا گھرانہ متمول گھرانوں میں شمار ہوتا تھا مگر وہ باپ کی کمائی پر انحصار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے کچھ عرصہ یہاں کوشش کرنے کے بعد بیرون ملک جانے کا قصد کر لیا۔ ولی کے دونوں جڑواں بھائی چونکہ اسکول میں زیر تعلیم تھے لہٰذا اسے یہ ہی مناسب لگا کہ وہ بیرون ملک نکل جائے۔

☆☆☆

"بیٹا! ضروری ہے کیا کہ کمانے کے لیے بیرون ملک کا ہی رخ کیا جائے۔ تھوڑا صبر سے کام لیتے تو یہاں بھی بہترین مواقع فراہم ہو ہی جاتے مگر تم نوجوانوں میں ـــ تو صبر کا عنصر ہی مفقود ہے۔ ہر معاملے میں عجلت پسندی اور راتوں رات روپوں کا ڈھیر لگانے کا جنون ایک ایک کر کے سارے باصلاحیت نوجوانوں کو دوسرے ملکوں میں منتقل کر رہا ہے۔" امی تاسف سے اسے پیکنگ کرتے ہوئے دیکھ رہی تھیں، ولی کے پیکنگ کرتے ہاتھ رک گئے۔

"میری پیاری امی جان! میں جانتا ہوں آپ کا ادا کیا گیا ایک ایک لفظ سچ پر مبنی ہے۔ پر آپ یقین جانیے میں نے آپ کی اداسی کے پیش نظر محض دو سال کا کانٹریکٹ سائن کیا ہے۔ بس پھر یہ باصلاحیت نوجوان اچھے بچوں کی طرح یہاں ہی سیٹل ہونے کی کوشش کرے گا۔" اس نے پیار سے

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیئر آئل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- نئے بال اگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت-/150 روپے

سوہنی ہیئر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہٰذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدا جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف -/150 روپے ہے، دوسرے شہر والے منی آڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوالیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے ---------- 350/- روپے
3 بوتلوں کے لئے ---------- 500/- روپے
6 بوتلوں کے لئے ---------- 1000/- روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021

Digitized by Google

ماں کے ہاتھوں کو چوما۔

"بس رہنے دو یہ طفل تسلیاں۔ باہر کی ہوا کھا کر سب کے پر نکل آتے ہیں۔ ایک دو سال بعد تم جب یہاں آؤ گے تو تمہیں اپنے ملک کی گندگی پریشان کرے گی۔ پانی آلودہ لگنے لگے گا، ہمہ وقت تمہارے ساتھ منرل واٹر کی بوتل لگی ہو گی۔ الٹیاں اور جلاب تمہیں اتنا ہراساں کریں گے کہ تم فوراً سے پیش تر ہمیں کوئی نئی رامائن پڑھا کر پھر سے بھاگ کھڑے ہو گے۔" امی کا تجزیہ کمال کا تھا۔ ولی خوب ہنسا۔

"قسم لے لیں امی! جو ان میں سے ایک بات بھی سچ ہوئی اور پھر میں کوئی ویسٹرن ملک نہیں جا رہا۔ ہاں اتنا ہے کہ وہ ہم سے کئی گنا ترقی یافتہ ہے۔"

"اچھا چلو چھوڑو ان بے کار کی باتوں کو، یہ بتاؤ کہ میں اور تمہارے بابا جان کب تک ٹالتے رہیں تمہاری چچی کو؟" تائی امی کی مبہم سی بات پر ولی نے چونک کر ماں کو دیکھا۔

"کس سلسلے میں؟"

"تمہاری چچی جان کئی بار دبے لفظوں میں تم دونوں کی شادی کے بارے میں استفسار کر چکی ہیں۔ میرے اور تمہارے بابا جان کا خیال تھا کہ جوں ہی تمہاری جاب کا مسئلہ حل ہو گا تو ہم تمہاری شادی کی ڈیٹ فائنل کر دیں گے۔" تائی امی نے گویا ولی کے سر پر بم پھوڑ ڈالا تھا۔

"کیا......؟" اس نے ہاتھ میں پکڑے کپڑوں کو بیڈ پر زور سے پٹخا۔

"شادی......اتنی جلدی کس بات کی ہے آپ لوگوں کو؟"

"جلدی...... یہ جلدی ہے؟ شجر کو تعلیم سے فراغت حاصل کیے دو سال سے اوپر ہو چکے ہیں۔ والدین اتنا عرصہ لڑکیوں کو گھر بٹھا کر تھوڑی رکھتے ہیں۔" تائی امی نے خفگی سے کہا۔ ولی کچھ پل تو خاموشی سے ماں کو تکتا رہا پھر ہمت مجتمع کر کے بولا۔

"میں کئی دنوں سے آپ سے بات کرنا چاہ رہا تھا مگر ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ اب ذکر چل ہی نکلا ہے تو سوچا وہ بات کر ہی لوں تو اچھا ہے۔" ولی نے تمہیداً کہا تو تائی امی کے چہرے پر الجھن کے تاثرات ابھر گئے۔

"وہ بات یہ ہے امی کہ میں...... میں شجر سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔" ولی نے بالآخر کہہ ہی ڈالا۔

"ولی......" تائی امی شاکڈ ہی تو رہ گئیں۔

"تم ہوش میں تو ہو؟"

"جی امی!" ولی کے اس قدر اطمینان پر تائی امی کا دماغ بھک سے اڑا۔

"ہوش میں ہوتے تو اتنی بڑی بات یوں آسانی سے نہ کہہ ڈالتے۔ میں پوچھتی ہوں آخر یہ بات تم نے منہ سے نکالی بھی کیسے؟" تائی امی اب تک انگشتِ بدنداں تھیں کہ وہ یہ بات کیسے کہہ سکتا ہے۔

"میں معذرت چاہتا ہوں امی! آپ کی طرح یقیناً چچی جان کو بھی یہ بات سن کر دھچکا لگے گا مگر میں کیا کروں امی! میرا دل اس سے شادی پر بالکل آمادہ نہیں۔" وہ ان کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

"مگر کیوں؟ اتنے سالوں بعد اچانک تمہارے دماغ میں شجر سے شادی نہ کرنے کا خناس سمایا ہی کیوں۔" تائی امی نے خفگی سے اپنے گھٹنوں پر دھرا اس کا ہاتھ پرے کیا۔

"اچانک نہیں امی! بہت سوچ سمجھ کر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔" ولی ان کے قدموں سے اٹھ کر ان کے برابر میں بیٹھ گیا۔

"مجھے کبھی کبھی بہت حیرت ہوتی ہے آپ لوگوں پر امی! کیا آپ لوگوں کو یہ رشتہ بے جوڑ نہیں نظر آتا۔" تائی امی کی خاموشی سے اسے بولنے اور بات کو آگے بڑھانے میں مزید تقویت ملی۔

"شجر کا دن بہ دن پھیلتا وجود، آپ کے ہینڈسم اور خوبرو بیٹے کے ساتھ بجتا ہے کیا؟"

''شجی کا وزن اب سے نہیں، اسکول لائف سے اتنا ہے تو پھر تمہیں اچانک اس کے وزن پر اعتراض کیونکر ہوا۔ یوں کہو کہ تمہاری نظروں میں کسی اور لڑکی کا بسیرا ہو گیا ہے۔''

''لاحول ولاقوۃ امی! آپ ایسا سمجھتی ہیں مجھے؟ اور معاف کیجیے گا امی! آپ کی آنکھوں پر تو شجر کی محبت کی پٹی بندھی رہتی ہے اس لیے آپ کو میری ناگواری اور ناپسندیدگی بھی نظر ہی نہیں آتی۔'' ولی نے شکوہ کناں نظروں سے اپنی ماں کو دیکھا۔

''ولی! تمہاری شجر سے منگنی بچپن سے طے ہے، کوئی مذاق نہیں ہے اور تم جانتے ہو کہ تمہارا انکار اس گھر میں بھونچال لے آئے گا۔ تمہارے بابا تم سے کتنے خفا ہوں گے، کچھ اندازہ ہے تمہیں اور پھر وزن کا کیا ہے بیٹا! وہ تو کم بھی ہو سکتا ہے۔'' تائی امی کو لگا اگر وہ اس پر یوں ہی برافروختہ رہیں تو معاملہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ جب ہی وہ اسے پیار اور نرمی سے قائل کرنے لگیں۔

''نہیں کم ہو سکتا اس کا وزن، کیونکہ اسے اپنا آپ کھٹکتا ہی نہیں اور رہا بچپن کی منگنی کا سوال، تو کسے خبر تھی کہ موصوفہ بڑی ہو کر گیس کا غبارا بنیں گی اور اس بات سے قطع نظر لڑکیوں والا رکھ رکھاؤ بھی سرے سے مفقود ہے محترمہ میں۔ لوگ کتنا مذاق اڑاتے ہیں میرا، جانتی ہیں آپ؟ الف نون، گیند بلا، ہاتھی میرا ساتھی اور جانے کون کون سے القابات سے نوازتے ہیں ہمارے جوڑ کو۔ مجھ پر رحم کریں امی! میں مزید مذاق کا نشانہ نہیں بننا چاہتا پلیز۔'' ولی نے ہاتھ جوڑ کر پیشانی سے لگائے۔ کئی سالوں کا غبار بھرا تھا اس کے دل میں جو اس نے آن واحد میں نکال باہر کیا۔ تائی امی ششدر سی اسے دیکھے گئیں۔

''ولی! میرے بچے دیکھو، ہوش سے کام لو۔ کیوں رشتوں میں دراڑیں ڈالنے پر تلے ہو۔ شجی بہت پیاری بچی ہے۔ شادی کے بعد جیسا تم چاہو گے وہ ویسا ہی رنگ ڈھنگ اپنا لے گی، تم اسے ایک موقع دے کر تو دیکھو میری جان۔''

''معذرت کے ساتھ امی! اسے گوشت کا پہاڑ بنانے میں آپ اور چچی جان نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ گھر کے ہر کام سے دور رکھ کر اسے حد درجہ ناکارہ بنا دیا ہے۔ اس کے پاس کرنے کو کچھ نہ رہا تو اس نے کھانے پینے میں پناہ ڈھونڈ لی۔ اتنی کلو وزن کم نہیں ہوتا والدہ...... اور پھر مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتا کہ آپ نے اپنی ہونے والی بہو کا معیار کیا رکھا ہے؟ ایک تو کمی اور سارے جہاں کی ست الوجود اور اس پر مستزاد وزن پہلوانوں کو مات دیتا ہوا۔ مائیں تو اپنے کالے کلوٹے سپوتوں کے لیے بھی دبلی پتلی اور خوب صورت لڑکیاں ڈھونڈتی ہیں اور آپ ہیں کہ......''

''بس......'' تائی امی کی اشتعال انگیز آواز پر ولی کی چلتی زبان کو یک دم بریک لگا۔

''بہت ہو گیا اور بہت سن لیں تمہاری لن ترانیاں۔''

''مگر امی؟''

''بس ایک لفظ اور نہیں۔ تمہیں اس بچی سے شادی نہیں کرنی وہ ایک الگ مسئلہ ہے مگر اس کا مذاق اڑانے کی اجازت میں تمہیں ہرگز نہیں دوں گی سمجھے۔ اب میں آگے کچھ اور بالکل نہیں سنوں گی۔ تم جلدی سے اپنا یہ کام نبٹاؤ اور ہنسی خوشی یہاں سے رخصت ہو۔'' تائی امی نے گویا گفتگو سمیٹی اور رخ پھیر کر اس کے بیڈ پر پھیلی تمام اشیاء اس کے ہینڈ کیری میں سیٹ کرنے لگیں۔ ولی بھی غصے میں سر جھٹک کر ماں کے ساتھ پیکنگ میں مشغول ہو گیا۔

یہ جانے بغیر کہ اس کی، کی گئی گل افشانیوں کے شرارے دروازے سے لگی شجر تک بخوبی پہنچ چکے تھے۔ جس سے وہ سرتاپا جھلس گئی۔

☆☆☆

اور پھر وہ اسے زلزلوں کی زد میں چھوڑ کر چلا گیا۔ اتنی تذلیل، اتنی ذلت۔ وہ اس سے اتنا بدگمان تھا، اسے پتا ہی نہ چلا۔ ٹھکرائے جانے کا عذاب کیا

Digitized by Google

ہوتا ہے، اسے آج صحیح معنوں میں معلوم ہوا تھا۔ خوش امیدی کی خوش رنگ تتلیاں بڑی بے دردی سے اس نے پیروں تلے روندی تھیں۔ آنسوؤں کی ایک جھڑی تھی جو تھمنے میں ہی نہ آرہی تھی۔

دو تین دن سے وہ کمرہ بند کیے منہ سر لپیٹے پڑی تھی۔ امی اور تائی امی حیران تھیں کہ یکا یک اسے کیا ہوا تھا۔ سعد اور فہد نے تو اس کی خاموشی کو ولی کے جانے سے جوڑ دیا تھا۔ امی نے بھی ان دونوں سے بھرپور اتفاق کرتے ہوئے اسے ڈھیروں تسلیاں دے ڈالیں۔

''بس میرا بیٹا...... ایک دو سال کی تو بات ہے اور پھر آج کل دوری...... دوری کہاں رہی ہے۔ انٹرنیٹ نے سمندر پار بسنے والوں کو بھی روبرو لا کھڑا کیا ہے۔'' شجر کے تو مانو سر سے لگی اور پیر پر بجھی۔

''وہ دو سال کے لیے جائے یا دو ہزار سال کے لیے، میری بلا سے۔ آپ لوگوں کو یہ خوش فہمی کیوں لاحق ہوگئی ہے کہ اس کے جانے سے مجھ پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں۔ انسان بغیر وجہ کے بیمار نہیں ہوسکتا کیا؟ اب میری طبیعت اس کے جانے کے بعد خراب ہوئی ہے تو اس میں میرا کیا قصور؟'' وہ تو گویا پھٹ پڑی۔ اتنے دنوں کی ٹینشن کہیں تو نکالنی تھی ناں۔

''شجی بیٹا! کیا ہوگیا ہے تمہیں؟ اتنی زود رنج تو کبھی نہ تھیں تم۔ کوئی بات ہوئی ہے تم دونوں کے درمیان؟'' امی کی ہر بات کی تان ولی کے جانے پر ہی ٹوٹ پڑی تھی۔

''امی پلیز...... ایسا کچھ نہیں ہے اور پلیز میرا سر درد سے پھٹا جارہا ہے۔ کوئی ٹیبلٹ بھجوا دیں میرے لیے۔'' اس نے جلدی سے جان چھڑائی اور کروٹ لے کر تکیہ منہ پر رکھ لیا۔

''میں ابھی چائے کے ساتھ ٹیبلٹ بھجواتی ہوں۔'' امی نے تشویش سے اسے دیکھا اور کمرے کی بتی بند کرکے باہر نکل گئیں۔

امی کے جاتے ہی اس نے تکیہ اچھال کر بیڈ سے نیچے پھینکا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سائیڈ لیمپ آن کیا اور دھیرے دھیرے چلتی آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اسے اپنا آپ کبھی اتنا ارزاں نہیں لگا تھا جتنا ان دو تین دنوں میں لگنے لگا تھا۔ سوچ سوچ کر اعصاب تھک گئے۔ کیا کچھ نہیں کہا تھا اس نے، اس کی ذات کی تذلیل کرتے ہوئے۔

جب جب سوچتی نئے سرے سے سلگنے لگتی، خیالات کی یورش بڑھی تو اس کا دماغ منفی رخ بہنے لگا۔ اس کی سوچوں نے یک دم پلٹا کھایا۔ وہ جو کئی دنوں سے اپنی عزت نفس کے کچلے جانے کا ماتم منا رہی تھی۔ یکا یک اس کے دل میں ایک جذبے نے سر ابھارنا شروع کردیا۔ وہ اس جذبے کو، کوئی نام نہیں دے پارہی تھی، بس ایک عجیب سی کیفیت خود میں سرائیت کرتی محسوس کررہی تھی۔ شاید کچھ کچھ انتقامی سی۔ وہ اپنے پھولے پھولے سیب سے سرخ رخساروں پر ہاتھ پھیر کر دل ہی دل میں ولی کو مخاطب کرکے بولی۔

''تم کیا سمجھتے ہو خود کو ولی سکندر...... تم دنیا کے کوئی آخری مرد ہو؟ میں نے تمہاری بے زاری اور چڑچڑے پن کو ہمیشہ تمہاری چھیڑ چھاڑ پر محمول کیا۔ کبھی تمہاری کسی بات کا برا نہیں مانا کہ ہونے والے شوہر کو میں یہ تمام حقوق سپرد کرچکی تھی مگر تم؟

تم کیا مجھے ٹھکراؤ گے ولی سکندر میں خود تمہیں اپنی کتاب حیات سے کسی بوسیدہ صفحے کی طرح پھاڑ کر پھینک ڈالوں گی۔ مجھ سے رشتہ استوار کرنے میں تمہیں شرم محسوس ہوتی ہے ناں تو ٹھیک ہے یوں ہی سہی۔ مجھ سے ایک بار کہتے تو سہی، اپنے سارے خیالات مجھ سے تو شیئر کرتے، مگر نہیں۔ تم نے مجھے درخور اعتنا نہ جانا۔ تم...... تم ولی سکندر......'' اس کا تنفس تیز تیز چلنے لگا۔ غصے کی حالت میں اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر نفاست سے سجی تمام اشیا ہاتھ مار کر نیچے گرادیں۔

☆☆☆

صبح ناشتے کی ٹیبل پر سب ہی اہل خانہ حیران تھے، حتیٰ کہ ابو اور تایا جان بھی۔ بات ہی کچھ ایسی تھی

ایک تو محترمہ شجر کی علی الصبح بے داری (جو عموماً ان سب کی ڈیوٹی، اسکول و کالج جانے کے بھی کافی دیر بعد عمل میں آتی تھی) اور ان سب سے بڑھ کر ناشتے کا مینیو، جوس کا ایک گلاس اور ایک بوائل انڈا اور بس......

اس نے بڑے اطمینان سے ناشتا تناول کیا اور سب کو ششدر چھوڑ کر لان کی جانب بڑھ گئی۔ یہ اور بات کہ اتنا مختصر سا ناشتا اس نے کتنے جبر کے ساتھ کیا تھا۔ کہاں دو پراٹھے مع سالن اور ایک گلاس دودھ اور ایک انڈا۔ اس کی تو داڑھ بھی گیلی نہیں ہو پائی تھی اور پھر سونے پر سہاگا جاگنگ...... جسے سوچ کر بھی اس کی روح فنا ہوتی تھی مگر ان سب پر بھاری تھا کل رات نمو پانے والا وہ جذبہ جس کو تقویت دینے کے لیے یہ سب ازحد ضروری تھا۔

بامشکل پانچ منٹ ہی ہوئے تھے اسے جاگنگ کیے ہوئے اور اس کا تھل تھل کرتا وجود مزید چلنے سے انکاری ہو گیا۔ اتھل پتھل ہوتی سانسیں الگ اسے ہراساں کیے ہوئے تھیں مگر اچانک اس کے گرد ولی کی آوازوں کا شور سا برپا ہوا۔

"گیس کا غبارا، الن ننھے کی جوڑی، گوشت کا پہاڑ......" اسے لگا جاگنگ ٹریک پر موجود ہر شخص ولی کا ہم نوا ہو کر استہزائیہ نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہا ہے۔ تب اس نے دوبارہ ہمت پکڑی اور ٹریک پر پھر سے دوڑنے لگی۔ اس کے اندر لگی آگ نے اسے پھر تھکنے نہ دیا۔ اس نے اپنی ساری توانائیاں مجتمع کر کے آدھے پون گھنٹے تک جاگنگ کی اور گھر واپسی کی راہ لی۔

☆☆☆

"شجر بیٹا! جلدی آجاؤ، چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔" امی نے گرما گرم بھاپ اڑاتے چائے کے کپ میز پر رکھتے ہوئے اسے پکارا۔ جو ٹی وی کے سامنے بیٹھی چینل سرچنگ میں مصروف تھی۔

"ارے چھوڑو بھئی اس فضول مشغلے کو۔ جلدی آجاؤ دیکھو میں نے تمہارے پسندیدہ اسنیکس بھی بنائے ہیں ساتھ میں۔" امی نے اس کے ہاتھ سے ریموٹ چھین کر ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"اوہ امی! آپ نے خواہ مخواہ تکلف کیا۔ میں آپ کو بتانا بھول گئی کہ اب میں چائے وائے بالکل نہیں پیوں گی اور یہ اسنیک وسنیک بھی مت بنایا کریں میرے لیے۔" شجر نے ایک طائرانہ نظر ٹیبل پر ڈالتے ہوئے کہا۔

گرم گرم چکن رول، شامی کباب اور مکس بسکٹ سے بھری پلیٹ، اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ جی چاہا ابھی امی کی اس ٹی پارٹی پر لبیک کہہ کر پل پڑے، مگر منہ میں آئے پانی کو جلدی جلدی حلق سے نیچے اتار کر وہ بظاہر بے نیاز بنی ریموٹ اٹھا کر دوبارہ ٹی وی کی جانب متوجہ ہو گئی۔

"ہیں......؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں بیٹا؟ یہ اچانک ڈائٹنگ کا خناس کیوں سما گیا تمہارے دماغ میں؟" امی نے متفکر ہو کر اسے دیکھا۔

"بس ایسے ہی، آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ جس بات کے لیے آپ برسوں سے مجھے فورس کرتی آرہی ہیں۔ اس بات پر میں نے ازخود فوکس کر لیا ہے۔" شجر نے چینل سرچنگ کا شغل ترک کر کے امی کی جانب رخ موڑا۔

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹا! مگر یوں ایک دم سے اتنی ٹف ڈائٹنگ تمہاری صحت کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ بتدریج کم کرتے کرتے تھوڑی غذا پر آؤ گی تو صحت بھی معتدل رہے گی۔" امی نے پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

اب وہ امی کو کیا بتاتی، اس کے اندر ولی کے الفاظ کسی بھانبھڑ کی طرح جل رہے ہیں جو اسے کسی گیلی لکڑی کی طرح لحہ لحہ سلگا رہے ہیں۔ اس کا خود پر سے جیسے اختیار سا کھوتا جا رہا ہے۔ کوئی پارہ ہے جو اسے نچلا نہیں بیٹھنے دے رہا۔ اسے اپنی ذات کی تضحیک کسی طرح بھول نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

سعد اور فہد کا میٹرک کا رزلٹ آؤٹ ہو چکا

Digitized by Google

تھا۔ دونوں نے نمایاں نمبروں سے کامیابی حاصل کی تھی۔ گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی اور اسی سلسلے میں آج تائی امی نے گھر میں ٹریٹ کے طور پر خوب اہتمام کیا ہوا تھا۔ سعد اور فہد کی تمام پسندیدہ ڈشز تیار کی گئی تھیں۔ شجر نے بھی حیرت انگیز طور پر امی اور تائی امی کے ساتھ کچن کے کاموں میں ان کی مدد کروائی تھی۔ بڑی امی تو بلائیں لیتی نہ تھکتی تھیں۔ گھر کے دونوں سربراہان کی آمد پر کھانا ڈائننگ ٹیبل پر چن دیا گیا۔

"جلدی آجائیں شجر آپی! ٹوٹ پڑیں میدان میں۔" جہاں کھانے کا دور چل رہا ہو، وہاں شجر کی پکار لازم و ملزوم تھی۔ سو اب بھی فہد نے چکن چاؤمن سے انصاف کرتے ہوئے شجر کو بھی آواز دے ڈالی۔ جانتا تھا کہ چکن چاؤمن اور فرائیڈ رائس شجر کی مرغوب غذاؤں کی لسٹ میں ٹاپ آف دی لسٹ تھیں۔

"نہیں فہد! مجھے ابھی بھوک نہیں ہے، تم لوگ کھاؤ، میں بعد میں کھاؤں گی۔" وہ دونوں بے چارے میٹرک کے امتحانوں کی تیاری میں اس بری طرح مستغرق تھے کہ انہیں شجر کی سرگرمیوں کے متعلق ذرا بھی خبر نہ تھی۔ اسی لیے فہد کا حیرانی سے منہ کھلا رہ گیا تھا، جسے شجر نے فرائیڈ رائس سے چمچ بھر کر اس کے منہ میں ٹھونس کر بند کیا۔

"امیزنگ!" سعد بھی حیرت سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"اتنے انواع و اقسام کے کھانوں کی موجودگی میں، میں آپی کی بھوک اڑی ہوئی ہے، یہ اس صدی کی بریکنگ بلکہ شاکنگ نیوز ہے۔"

"اب تو تم دونوں امتحان پھر رزلٹ کی ٹینشن سے باہر آچکے ہو ناں۔ ذرا گھر میں ٹک کر رہو تو تمہیں پتا چلے کہ آج کل آپ کی ڈیئر آپی کی بہت سی فیورٹ ڈشز شجر ممنوعہ بن چکی ہیں۔" تائی امی نے ایک اور انکشاف کیا۔

"ارے واقعی، مگر کیوں؟" استعجاب در استعجاب، آج تو واقعی خاص دن تھا۔

"تم دونوں نے غور نہیں کیا کہ تمہاری شجر آپی دن بہ دن اسمارٹنس کی جانب قدم بڑھا رہی ہیں۔" امی کے کہنے پر ان دونوں نے شجر کا بغور معائنہ کیا تو حیرت سے اچھل پڑے۔

"ارے ہاں، چچی جان آپ بالکل صحیح کہہ رہی ہیں اور شجر آپی! واقعی آپ کا وزن کافی حد تک کم ہو گیا ہے۔ کیا کوئی جادو کا چراغ ہاتھ لگ گیا ہے، یا ولی بھائی کی جدائی کا صدمہ دل پر لے لیا ہے، پر انہیں گئے ہوئے تو فقط چھ ماہ ہوئے ہیں۔ لگتا ہے جب تک ولی بھائی اپنا کانٹریکٹ پورا کر کے پاکستان آئیں گے تب تک تو آپ مس ورلڈ سشمیتا سین کی طرح ہو جائیں گی ہاہاہا۔" سعد کی فراٹے بھرتی زبان کے آگے تو گویا خندق تھی۔ شجر کی مسکراہٹ لمحوں میں غائب ہو گئی اور فوراً وہاں سے اٹھ کر کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

"سعد! بہت فضول بولتے ہو تم، کچھ بولنے سے سوچ لیا کرو۔" تایا ابو کی سرزنش پر سعد نے زبان دانتوں تلے داب لی اور اپنی پلیٹ پر جھک گیا۔

☆☆☆

پتا بھی نہ چلا اور ڈیڑھ سال کا عرصہ بیت گیا۔ گزرتے ماہ و سال کی گردش میں شجر کی شخصیت میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوتی چلی گئیں۔ لگتا ہی نہ تھا کہ یہ وہی شجر ہے، کھانا جس کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اپنی ذات سے حد درجے لاپروائی برتنے والی انتہائی ست الوجود...... اور آج ڈیڑھ سال بعد پینتالیس کلو وزن کے ساتھ، ہر وقت نک سک سے تیار خوب صورت فکر کی حامل شجر کو اب کوئی دیکھے تو انگشت بدنداں رہ جائے۔ وزن کم کرنا تو شاید بہت سے لوگوں کی بس کی بات ہو مگر شخصیت کو فطرت کے برخلاف لے جانا اصل کمال ہے اور شجر نے یہ کمال کر دکھایا تھا۔ اب چاہے اس کے پیچھے کوئی بھی جذبہ کارفرما ہو مگر اس کی زندگی کا تو پوزیٹو پوائنٹ ہی ثابت ہوا تھا۔

Digitized by Google

☆☆☆

یہ یادیں بھی ناں، انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتیں۔ ایک دروا کرنے کی دیر ہوتی ہے اور یکے بعد دیگرے دریچے کھلتے چلے جاتے ہیں اور ہم مستقبل سے دامن چھڑا کر ماضی کے سفر پر گامزن ہوجاتے ہیں۔ میں بھی یادوں کے ساگر میں غوطہ زن ان نایاب سیپیوں کا متلاشی، اس دشمنِ جاں کی یادوں کی فسوں خیزی میں گم تھا۔

جی ہاں میں...... یعنی ولی سکندر۔ شجر بنت معین خان کی محبت میں گوڈے گوڈے ڈوبنے کے باوجود صرف اس کی یادوں سے ہی دل بہلانے پر مجبور تھا کیونکہ اس تک پہنچنے کے تمام راستے میں خود ہی مسدود کرکے چلا آیا تھا مگر اسے یہ سب کون بتائے کہ میں نے اس کے ساتھ یہ سب کیوں کیا؟ چلیں میں اسے تو نہیں پر آپ سب کو تو سمجھا ہی سکتا ہوں کہ میں شجر کو ٹھکرا کر کیوں چلا آیا؟

دیکھا، دیکھا...... آپ سب بھی یہی سمجھ رہے ہیں نا کہ میں نے شجر کو ٹھکرا دیا ہے۔ درحقیقت آپ بھی شجر کی طرح لاعلم ہیں۔ دراصل میں نے جو کچھ کیا ایک چھوٹی سی معصوم سی سازش کے تحت کیا...... جی ہاں سازش۔ شجر نام کے غبارے میں سے ہوا نکالنے کی سازش۔ اب آپ لوگ اسے سازش کہیں یا منصوبہ، بہرحال اس تمام منصوبہ بندی کا ماسٹر مائنڈ میں یعنی ولی سکندر ہی ہوں۔

شجر سے میری منگنی زمانہ طفل میں ہی طے ہوچکی تھی اور ظاہر ہے بچپن سے ہی میرے شعور میں بیوی کے طور پر شجر کے علاوہ کسی اور کا تصور ہی نہ تھا۔ جیسے جیسے میں بچپن کی دہلیز چھوڑ کر شعور کے مدارج طے کرتا گیا۔ شجر سے میری انسیت اور الفت بڑھتی چلی گئی اور آج وہ الفت ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر چکی تھی مگر اتنی بے حد وحساب محبت کے باوجود میں اس کے تیزی سے بڑھتے وزن سے خائف رہنے لگا تھا۔ اسکول لائف تک تو وہ پھر بھی ٹھیک تھی۔ میٹرک کے بعد اس کا وزن اچانک بڑھنا شروع ہوگیا۔

ہر وقت گائے کی طرح چرنے کی عادت سے میں چڑنے لگا۔ میں ایک متناسب جسامت کا مالک اور منگیتر پھٹے ڈھول سے مشابہہ۔ ہمارے ملنے جلنے والے، رشتے دار سب ہی ہمارے جوڑ کا خوب مذاق کا نشانہ بنائے۔ میں اپنے سرکل میں لطیفہ بن کے رہ گیا تھا۔ اسی سبکی کے خدشے کی بنا پر میں نے دوست احباب میں شجر کے حوالے سے کبھی کوئی بات نہ کی تھی۔

اب آپ کہیں گے کہ محبت تو روح سے کی جاتی ہے جسم سے کیا لینا۔ بھئی میں ٹھہرا ایک پریکٹیکل بندہ، یہ کتابی باتیں مجھے بالکل ہضم نہیں ہوتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ کالج، یونیورسٹی میں ایک سے ایک طرح دار اور نازک اندام حسینائیں میرے حلقۂ احباب میں کثیر تعداد میں شامل رہی ہیں تاہم میں نے کبھی شجر کی محبت میں خیانت کا سوچا بھی نہ تھا۔

"بس یہ تھا کہ مجھے اس پر اپنی ذات سے اتنی لاپروائی پر شدید غصہ آتا تھا۔ اسے انڈر اسٹیمیٹ کرنے کا کوئی موقع نہیں چھوڑتا تھا میں، مگر نہ جانے وہ کس مٹی کی بنی تھی کہ ذرا اثر نہ ہوتا اس پر۔ ستم بالائے ستم کہ خاندان والوں کے کمنٹس اور دوستوں کے اچھالے گئے استہزائیہ فقرے بھی وہ ناک پر سے مکھی کی طرح اڑا دیتی تھی۔

اس پر مستزاد یہ کہ محترمہ کاہلی اور سستی میں سند یافتہ۔ امی اور چچی جان کے بے جا لاڈ پیار نے ہی اس میں یہ تمام خوبیاں پیدا کی تھیں اور اب جب کہ اس کی عادتیں پختہ ہوچکی تھیں تو وہ دونوں اسے بدلنے پر مصر تھیں۔

گھر میں کچھ دنوں سے ہماری شادی کی بازگشت سنائی دینے لگی تھی۔ میرے تو سوچ کر ہی رونگٹے کھڑے ہوجاتے کہ دولہا دلہن کے روپ میں ہم دونوں اسٹیج پر بیٹھے کیسے لگیں گے اور لوگ ہم پر دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ مختلف کمنٹس پاس کرتے ہوئے کیا کیا نہ باتیں کریں گے۔

Google

بس تب ہی میرے دل و دماغ میں یہ شاندار منصوبہ تشکیل پایا اور اس "معصوم" سی سازش میں، میں نے گھر کی خواتین یعنی امی، چچی جان کو بھی شامل کرلیا۔ پہلے پہل تو یہ دونوں خواتین سنتے ہی بدک گئیں، مگر میرے بے حد اصرار اور مختلف دھمکیوں سے بالآخر مان ہی گئیں۔

بس اب مجھے اس لمحے کا شدت سے انتظار تھا کہ کب ہم دونوں ماں بیٹے کی گفتگو کے دوران شجر صاحبہ انٹری ماریں اور میری من گھڑت بکواس شروع ہو اور پھر وہ ساعت میرے سعودیہ جانے سے ایک رات قبل آ ہی گئی۔

امی میرے ساتھ پیکنگ میں مدد کروا رہی تھیں اور ساتھ ہی ان کی ڈھیر ساری نصیحتیں بھی جاری تھیں کہ تب ہی وہ موصوفہ مجھے سامنے سے آتی دکھائی دیں۔ میں نے فوراً سے پیش تر امی کو اشارہ کیا اور دروازے کی طرف پشت کر کے بیٹھ گیا۔

امی بھی میرا اشارہ سمجھ کر بظاہر پیکنگ میں مشغول، میرے منصوبے پر عمل درآمد کرتے ہوئے گفتگو کو بڑی خوب صورتی سے میری شادی کی جانب موڑ گئیں۔ تب ہم دونوں کے مابین جو مکالمہ ہوا وہ نہ صرف شجر نے بخوبی سنا بلکہ اس کا نتیجہ بھی بقول امی کے خوب بہترین آیا۔

دراصل میں بچپن سے اس کی سائیکی سے واقف تھا کہ جب تک اس کے دل پر کسی بات سے کاری ضرب نہیں پڑتی تھی وہ اس مشکل کام کو سر انجام نہیں دیتی تھی۔ ہماری اسکولنگ کے دوران اس کی تعلیمی کارکردگی بہت واجبی سی ہوا کرتی تھی۔ چچا جان کی ڈانٹ پھٹکار اور چچی جان کی پیار و محبت کی زبان بھی وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

من کی موجی تو وہ ہمیشہ سے ہی تھی مگر ایک دن تو حد ہی ہو گئی جب وہ نویں جماعت میں دو پیپرز میں سپلی لے آئی۔ اس دن چچا جان نے پورے گھر والوں کے سامنے اس کے وہ لتے لیے کہ مجھ سمیت تمام گھر والوں کو اس کی صورت پر ڈھیروں ترس آیا۔ میں اس کے دفاع میں میدان میں کودا تو چچا جان نے مجھے بھی گھرک کر رکھ دیا۔ میں وہیں دبک گیا۔

تب شجر کے دل پر لگی ٹھیس نے کام دکھایا اور پھر سب نے دیکھا کہ کیسے اس نے دن رات ایک کر کے خود کو پڑھائی میں مستغرق کرلیا اور نتیجتاً اگلے پیپرز میں وہ نمایاں نمبروں سے کامیاب ہو گئی۔

بس اس کی اسی سائیکی کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے اس دن اپنی گفتگو میں اسے سنانے کے لیے بہت سے نامناسب الفاظ استعمال کر ڈالے تھے کہ ضرب ذرا کاری لگے تاکہ محترمہ میں کچھ تو تحریک پیدا ہو اور مجھے تو سو فیصد امید تھی کہ میری یہ کوشش رائیگاں نہیں جائے گی اور وہ اپنی ذات کو انتقاماً ہی سہی گروم کرنے پر ضرور آمادہ ہو گی۔

مجھے پاکستان چھوڑے ہوئے تقریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے اور کانٹریکٹ کے مطابق مجھے مزید چھ ماہ اور یہاں قیام کرنا ہے۔

گھر میں ہفتے میں ایک دو بار تقریباً سب سے ہی بات ہوتی رہتی ہے۔ ماسوائے شجر کے، ظاہر ہے اس کی دانست میں، میں نے اسے اتنا شدید دھچکا پہنچایا ہے تو مجھ جیسے دغاباز انسان سے ناراض ہونا تو بنتا ہے ناں۔

شجر کی پروگریس بھی مجھے امی کے ذریعے وقتاً فوقتاً ملتی رہتی ہے جو کہ مثبت ہی ہوتی ہے۔ میں نے کئی بار اصرار کیا تھا کہ میری اس سے اسکائپ پر بات کروا دیں کہ دستِ بردل (مضطرب) نگاہوں کو کچھ تو قرار آ جائے مگر وائے رے قسمت امی کا ہر بار ایک ہی جواب کہ......

"وہ تم سے ازحد خفا ہے، بات کرنا تو درکنار وہ تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔" میں نے کہا بھی کہ اس سے ناراضی کی وجہ تو دریافت کریں، دیکھیں اس کا جواب کیا ہوتا ہے مگر امی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "خوامخواہ اس کی ناراضی کو اور ہوا مت دو۔ بس ہم تمہارے کہنے پر اسے تم سے بات کرنے کے لیے بلاتے ہیں تو وہ کوئی نہ کوئی بہانہ گھڑ کر منظر

Digitized by Google

عام سے غائب ہو جاتی ہے۔ اسی چیز سے اس کی ناراضی کا اظہار ہوتا ہے۔ اب زیادہ بال کی کھال نکالنے بیٹھ گئے تو وہ کہیں اس رشتے سے ہی کھلم کھلا انکار نہ کر بیٹھے۔" امی کی بات معقول تھی سو دل پر صبر کی سل رکھ کے اپنے لوٹنے کے دن شمار کر رہا ہوں۔

سعد اور فہد نے اس کی حالیہ تصویر پوسٹ کی تھی۔ تصویر کو دیکھ کر دل کو خوش گوار سی حیرت ہوئی کہ اس نے بہت حد تک خود کو مینٹین کر لیا تھا مگر پھر بھی میری سوچ کے حساب سے ابھی اس کو مزید محنت درکار تھی مگر خیر میرے لیے تو یہ ہی بہت تھا کہ اس نے اپنی ذات میں دلچسپی تو لینی شروع کی۔

☆☆☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ وہ سب سے بے نیاز اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی دور آسمان پر چاندنی میں نہائے ٹمٹماتے خوابوں کے جگنوؤں کو اپنے نصیب کی طرح جلتے بجھتے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس بے مہر شخص کو مسلسل سوچے جا رہی تھی

اسے پتا ہی نہ چلا کہ کب اس ظالم شخص کی یاد ایک سیال مادے کی مانند اس کے گالوں پر پھسلنے لگی۔ اس نے چونک کر اپنی تر رخساروں کو چھوا اور ڈھلک آنے والے آنسوؤں کو شہادت کی انگلی سے تنفر کے ساتھ جھٹکا۔

"تم ولی سکندر...... تم ضرور مجھ تک پلٹ کر آؤ گے۔ یہ میرا پختہ یقین ہے اور تب میں بھی تمہیں ٹھیک اسی طرح نخلستان سے لق و دق صحرا میں لے جا کر دھکیلوں گی جہاں میں آج کھڑی ہوں۔ سمجھے تم۔" اس نے چشم تصور میں ولی کا گریبان جھنجوڑا

اور بستر پر اوندھے منہ گر کر رونے لگی۔ آنکھوں کا سیل رواں باوجود ضبط کے، تھمنے میں ہی نہ آ رہا تھا۔ وہ اپنی سرنوشت سے یہ شکستہ رنگ باب نوچ کر پھینک دینا چاہتی تھی مگر وہ ایسا چاہ کر بھی کر نہ پا رہی تھی۔

☆☆☆

اس نے ٹیکسی سے اتر کر کچھ دیر پیاسی نگاہوں سے اپنے گھر کے در و دیوار کو تکا۔ پھر کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ رات کے اس پہر تواتر سے بجتی گھنٹی سے شاید سعد کا دماغ جھنجھنا اٹھا تھا تب ہی اس کی خشمناک آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

"ارے کون ہے بھائی، بس کر دو۔ کیا بٹن سے چپک گئے ہو جو......" باقی کے الفاظ اس کے منہ میں ہی گم ہو گئے۔ چند ثانیے تک تو وہ ہونق بنا مقابل کو دیکھتا رہا اور پھر "بھائی جان" کا فلک شگاف نعرہ لگا کر ولی کے گلے میں جھول گیا۔

"یہ کیا اچانک آمد، کسی کو خبر تک نہ دی۔" وہ ولی کے شانوں پر بازو پھیلائے اندر کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔

"بس تم لوگوں کو سرپرائز دینا چاہ رہا تھا، کیسا لگا؟" وہ چھوٹے بھائی کے گال کھینچتے ہوئے بولا۔

"کچھ خاص نہیں۔" سعد منہ بنا کر بولا۔

"ایں...... مگر کیوں؟" ولی کی آنکھیں پھیل گئیں، اس عزت افزائی پر۔

"وہ اس لیے کہ گھر پر اس وقت کوئی نہیں سوائے میرے۔" سعد نے ولی کا ہینڈ کیری جھک کر تھاما۔

"سب ہوتے تو آپ کے اس سرپرائز کو بہت انجوائے کرتے مگر خیر خوشی تو مجھے اب بھی بے اندازہ ہوئی ہے۔ آپ کو یوں ہی تنگ کر رہا تھا۔" سعد ہنستے ہوئے بولا۔

"اچھا...... مگر سب گئے کہاں ہیں؟" ولی نے اپنے سرپرائز پر چار حروف بھیج کر تاسف سے پوچھا۔

"وہ ابو کی کزن ہیں ناں، زرینہ آنٹی! ان کی بیٹی کی شادی پر۔ چلیں خیر اب تو بارہ بج چکے ہیں، ان سب کی آمد جلد ہی متوقع ہے۔ ویسے بارات کی تقریب ہے اور کراچی میں ان تقریبات کی طوالت

Digitized by Google

کا تو اندازہ آپ کو ہے ہی، ایک تو لازمی بجے گا۔ ہوسکتا ہے اس سے پہلے ہی آجائیں۔" وہ ولی کا سامان لاؤنج میں پہنچا کر دھم سے صوفے پر گر پڑا۔

"ہوں اور باقی سب تو ٹھیک ہیں ناں، یہاں؟" ولی نے صوفے پر پھیل کر پرسکون انداز میں سر صوفے کی پشت سے لگایا۔

"اگر باقی سب سے مراد آپ کی شجر آپی ہیں تو اس کا جواب ہے۔ فٹ فاٹ، فائن اور زبردست۔" سعد نے شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور جواباً ولی کی زوردار دھپ اس کی کمر پر پڑی۔

"بہت زبان چلنے لگی ہے تمہاری۔" ان کی خوش گپیوں کے دوران سعد اور ولی نے ڈنر کیا اور پھر سعد اسے آرام کی تاکید کر کے خود بھی آرام کی غرض سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ اسے بھی سفر کی تھکان تھی سو وہ بھی لیٹ گیا اور پھر جانے کب اس کی آنکھ لگی اور تب ہی کھلی جب اسے اپنے کمرے میں کئی لوگوں کی ایک ساتھ بولنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

تھوڑے حواس بے دار ہوئے تو دیکھا امی، ابو، چچی جان اور چچا جان سب ہی اس کے کمرے میں جمع تھے غالباً سعد نے اس کے آنے کی خبر دے دی تھی انہیں۔

"سوری میری جان! تمہیں نیند سے بے دار کردیا۔ کیا کریں سعد نے جیسے ہی تمہاری آمد کی اطلاع دی تو ہم سے صبر نہ ہوسکا۔" امی جان نے اس کی پیشانی چوم کر کہا۔ وہ مسکرا کر کھڑا ہوا اور ماں کے گرد باہیں حمائل کردیں پھر فرداً فرداً سب سے ملنے لگا اور پھر سب کے تابڑتوڑ سوالات کے حملے۔

"اچانک کیوں آئے؟"

"ابھی تو کانٹریکٹ کی مدت باقی تھی پھر چھوڑ کر کیوں آگئے؟"

"کیا چھٹیوں پر آئے ہو؟"

"دو روز قبل ہی تو فون پر بات ہوئی تھی تب تو تم کہہ رہے تھے کہ چھ ماہ سے پہلے نہیں آسکتے؟"

ان سب کے سوالات کا صرف ایک ہی جواب تھا اس کے پاس۔ اس کی محبت، جس سے دوری اب مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتی جارہی تھی، تب ہی تو وہ اچانک سب کچھ چھوڑ چھاڑ بھاگا چلا آیا مگر یہ سب وہ کیسے بتاتا بس انہیں مختلف تاویلیں پیش کر کے مطمئن کرنے لگا۔

رات گئے تک وہ سب ولی کو گھیرے رہے، ادھر ادھر کی بہت سی باتوں کے بعد وہ سب اسے آرام کی تاکید کر کے اپنے رومز میں چلے گئے۔ نیند تو اس کی آنکھوں سے روٹھ ہی چکی تھی سو وہ گرم پانی سے شاور لینے کی غرض سے کمرے سے باہر نکل آیا کہ شاور لینے کے بعد اسے بہت پرسکون نیند آتی تھی۔

جوں ہی وہ کمرے سے نکل کر باہر آیا، لاؤنج میں کسی اجنبی حسینہ کو تیزی سے سیڑھیاں پھلانگ کر امی کے کمرے کی جانب جاتے ہوئے دیکھا۔ اس نے بے ساختہ سراہتے ہوئے "واؤ" کہا اور اچھنبے سے سوچنے لگا کہ وہ پری وش کون ہوسکتی ہے مگر پھر سر جھٹک کر اسے معمے کو صبح پر ٹال کر واش روم کی جانب بڑھ گیا۔

شاور لینے کے بعد وہ قدرے ریلیکس ہوا تو دھیان پھر شجر کی جانب بھٹک گیا۔

"کہیں وہ شجر تو نہیں تھی۔" اس کے ذہن میں کوندا سا لپکا مگر نہیں، یہاں آنے سے ایک ہفتہ قبل ہی تو فہد نے اس کی تصویر بھیجی تھی۔ اتنی نازک اندام نہیں ہوسکتی وہ۔ دوسرے ہی پل اس نے خود ہی اپنے اس خیال کو رد کردیا۔ چلو وہ جیسی بھی ہے میری زندگی کا حاصل ہے۔ میں اس کو جتنا بدل سکتا تھا، بدل لیا اب اور نہیں۔

☆☆☆

صبح وہ بے دار ہوا تو سب سے پہلے اسی دشمن جاں کا خیال آیا۔ رات میں اس کے استفسار پر چچی

جان نے بتایا تھا کہ وہ تھکی ہوئی تھی تو آتے ہی سو گئی ہے۔ اب پتا نہیں وہ واقعی سو گئی تھی یا چچی جان نے اس کی ناراضی کا پردہ رکھا تھا۔ بہر حال جو بھی تھا وہ اس کے لیے ہی تو بھاگم بھاگ یہاں آیا تھا۔ اس کی دید کے لیے ضروری تھا کہ وہ بستر سے چپکے رہنے کے بجائے اسے خیر باد کہہ کر فریش ہو جائے۔

☆☆☆

وہ شاور لے کر نک سک سے تیار ناشتے کی ٹیبل پر آیا تو اس کی متلاشی نگاہیں شجر کو کھوجنے لگیں مگر ناشتے پر سب ہی موجود تھے، سوائے اس ستم گر کے۔ اس نے مایوس ہو کر سب کو صبح بخیر کہہ کر کرسی سنبھال لی۔ اسی اثنا میں کل رات والی لڑکی موبائل پر بات کرتی ہوئی آتی دکھائی دی۔ وہ یوں ہی موبائل پر مصروف سر کے خفیف سے اشارے سے حاضرین کو سلام کر کے بیٹھ گی۔

ابھی وہ کشش و پنج میں مبتلا امی سے اس کے بارے میں دریافت کر ہی رہا تھا کہ چچی جان نے اسے پکارا۔

''شجر بیٹا! یہ کیا، صبح ہی صبح موبائل سے چپک گئی ہو۔ چلو بند کرو فون اور ناشتا کرو ڈھنگ سے۔ ابھی تمہاری دوست آجائے گی تمہیں پک کرنے۔'' چچی جان نے جوس پیتی شجر کو خفگی سے کہتے ہوئے گویا اس کے سر پر بم پھوڑا تھا۔

''شجر؟'' وہ ہونق بنا اسے ٹکر ٹکر دیکھے گیا۔

''یہ شجر ہے؟ امپاسبل ...... اس کا مطلب ہے کہ کل رات میں نے اسے دیکھ کر درست قیاس کیا تھا۔'' وہ حیرت و استعجاب کے سمندر میں غلطاں بت بنا، اس کے نازک اندام وجود کو دیکھے گیا۔

''اتنی دبلی پتلی بلکہ متناسب فگر کی مالک شجر ہے، پاؤ اسٹرینج۔'' اس کی تو مانو قوت گویائی ہی سلب ہو چکی تھی۔ وہ منہ کھولے اور آنکھیں پھاڑے اسے دیکھنے میں مگن تھا۔

چہرہ گول مٹول تھا تو ناک بھی پھیلی ہوئی اور آنکھیں بٹن کی جیسی دکھتی تھیں۔ فگر متناسب ہوا تو ناک ستواں اور آنکھیں بھی اپنی اصلی حالت میں یعنی روشن اور بڑی بڑی سی۔ بغور دیکھا تو پتا چلا واقعی یہ تو اپنی شجر ہی ہے، اس کی محویت کو گاڑی کے تیز ہارن نے توڑا اور وہ لہراتی بل کھاتی پرس سنبھالتی یہ جا وہ جا۔

''واپس آجائیں ولی بھائی! شجر آپی چلی گئی ہیں۔'' سعد نے پلیٹ میں چمچہ بجا کر شرارت سے کہا تب اس نے چونک کر تمام حاضرین پر نگاہ دوڑائی تو دیکھا۔ ابو، چچا جان، امی وغیرہ اس کی حالت سے محظوظ چپکے چپکے مسکرا رہے تھے اور جوں ہی ولی ان سب کی جانب متوجہ ہوا تو ان کی مسکراہٹیں قہقہوں میں بدل گئیں۔ وہ جھینپ کر سیدھا ہو بیٹھا۔

''کیوں بیٹا جی! ایک سرپرائز وہ تھا جو تم نے رات میں اپنی آمد کی صورت میں دیا اور ایک سرپرائز یہ ہے جو ہم نے شجر کی صورت میں دیا۔ اب بولو کس کے سرپرائز میں دم تھا۔'' امی نے شوخی سے کہتے ہوئے اس کے بال بگاڑ دیے۔

''اچھا...... میں شجر کے ساتھ گیم کھیل رہا تھا اور آپ لوگ میرے ساتھ ......'' وہ اب قدرے سنبھل کر بولا۔

''میں روزانہ پوچھتا امی! شجر اب کیسی دکھتی ہے تو میری گریٹ امی بڑی معصومیت سے جھوٹ بولتیں۔''

''ہاں بیٹا! تھوڑا بہت کھانا پینا کم تو کر دیا ہے مگر اتنے برسوں کی عادت ہے تو برسوں میں ہی چھوٹے گی۔ تم اس کے وزن کے بارے میں کانشس ہونا چھوڑ دو۔ جتنا وزن کم کر لیا ہے اسی کو غنیمت جانو، اس سے زیادہ کی امید مت رکھو۔'' وہ ہو بہو امی کے انداز میں بولا تو سب کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

''جی ہاں اور امی نے ہم دونوں کو بھی منع کر دیا تھا کہ شجر آپی کی اسمارٹنس کے متعلق آپ کو کچھ خبر نہ

Khawateen Digest December 2018
Digitized by Google

ہونے دیں۔" سعد دانت نکوس کر بولا۔

"تم دونوں سے تو میں بعد میں نپٹوں گا۔ تمالی کے بینگنوں...... میں نے جب بھی شجر کی فریش پک بھیجنے کو کہا ان دونوں دغا بازوں نے ساتھ، پینسٹھ کلو والی شجر کی تصویر بھیجی، یہ کہہ کر کہ یہ آپی کی بالکل حالیہ پکچر ہے۔ اب بچو! تم لوگوں کی پوری فرمائشی لسٹ تمہارے دوستوں میں نہ بانٹی تو کہنا۔" وہ منہ پر ہاتھ پھیر کر شہادت کی انگلی دکھا کر دھمکاتے ہوئے بولا۔

"اوہ نو......" دونوں یک زبان ہو کر بولے تو تمام بڑوں کے قہقہے پھر سے گونج اٹھے۔

☆☆☆

وہ کافی بنا کر جوں ہی پلٹی چوکھٹ میں فریم کی جڑے ولی کو دیکھ کر ٹھٹک کر رک گئی۔ وہ چوکھٹ پر اپنے ہاتھ دائیں بائیں رکھ کر یوں ایستادہ تھا کہ کچن سے باہر جانے کا راستہ بالکل مسدود ہو چکا تھا۔

"آپ پلیز مجھے راستہ دیں گے ذرا۔" شجر نے سپاٹ چہرے کے ساتھ اسے دیکھا۔ لہجے میں بیگانگی تھی۔ اسے یہاں آئے چوتھا روز تھا مگر اس سے بات کرنا تو درکنار اس کے سامنے آنے تک سے احتراز برتی تھی۔

اس نے زیادہ تر مصروفیات گھر سے باہر ہی پال رکھی تھیں۔ کبھی آرٹ کی کلاسز لینے اکیڈمی جا رہی ہے تو وہاں سے فارغ ہوتے ہی حال ہی میں جوائن کی ہوئی این جی او چلی جایا کرتی اور اگر گھر میں ہو تو زیادہ تر اپنے کمرے تک محدود رہتی۔

وہ ماں اور چچی سے اس کے رویے پر شاکی ہوا تو وہاں سے بھی کورا جواب آیا کہ......

"بھئی اسے ہرٹ کرنے کا آئیڈیا تمہارا ہی تھا۔ یہاں تک تو ہم نے تمہارا ساتھ دیا، اب اسے کس طرح سچائی سے آگاہ کر کے منانا ہے، یہ سراسر تمہارا درد سر ہے۔" وہ ان کے اس سارے سلسلے سے الگ ہونے پر کھولا تو بہت مگر اب اپنے پیار کی ڈوبتی نیا کو پار تو لگانا ہی تھا اور اس ڈولتی نیا کو سہارا دینے کا موقع اسے آج یوں میسر آیا کہ اسے رات اچانک پیاس سے حلق میں چبھتے کانٹوں نے نیند سے بے دار کر دیا اور جب وہ پانی پینے کی غرض سے کچن میں آیا تو اس ستم گر کو یہاں موجود دیکھ کر قدرت پر ڈھیروں پیار آیا۔

"سنا نہیں آپ نے' میں نے کہا راستہ چھوڑیں میرا۔"

"کیسے چھوڑ دوں؟ تمہارے سارے راستے مجھ تک ہو کر ہی تو گزرتے ہیں۔" وہ یوں ہی اس کی راہ میں حائل کھڑا رہا۔

"کون سے راستے مسٹر! وہ جن پر آپ نے خود ہی خار بچھائے تھے۔" شجر کا لہجہ کافی کی کڑواہٹ سے زیادہ تلخ تھا۔

"چاہے تم کوئی بھی راستہ اختیار کر لو، منزل تو میں ہی ہوں ناں۔" اس نے اپنے ہاتھ سینے پر لپیٹ کر اسے دیکھا۔

"اوہ...... واؤ!" رات کی پرسکوت ساعتوں میں اس کا طنزیہ قہقہہ گونجا۔

"میں آپ کے تعین کردہ معیار کے قالب میں ڈھل گئی تو آپ منزل بن کر میری راہ میں حائل ہو گئے چہ جائیکہ خوب۔"

"تو تم میرے معیار کے قلب میں ڈھلیں کیوں؟ پوچھ سکتا ہوں۔" اس کے اس سوال پر وہ چند لمحے اسے لب بھینچے دیکھے گئی۔

"کسی خوش فہمی میں مت رہنا مسٹر! کم از کم آپ کو خوش کرنے کے لیے میں نے یہ سب ہرگز نہیں کیا۔"

"اچھا تو پھر کس کے لیے کیا یہ سب۔"

"میں آپ کے ہر سوال کا جواب دینے کی پابند نہیں، او کے۔" اس نے ولی کو ہاتھ سے پرے کرتے ہوئے راستہ بنایا اور تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی اپنے پورشن میں پہنچ گئی۔

ولی نے ایک سرد آہ لبوں سے خارج کی اور چند ثانیے یوں ہی اپنی جگہ منجمد رہنے کے بعد سر جھٹک کر اپنے کمرے کی راہ لی۔ اسے اندازہ ہو رہا

Khawateen Digest December 2018

Google

تھا کہ اس سر پھری لڑکی کو سچ سے آگاہ کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شاید اسے وہ سب ایسے کہنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہ اس سے اتنا بدگمان ہوگئی تھی۔
جو بات کبھی نہ کہنی تھی، وہ بات منہ سے نکل گئی جو لفظ تجھ سے کہنے تھے، وہ دل کے گوشے میں رہ گئے

☆☆☆

"معین! آپ پلیز شجر کو اکیڈمی سے لے آئیں گے۔ اس کا فون آیا تھا کہ آج اس کی فرینڈ کی گاڑی خراب ہوگئی ہے تو وہ اسے ڈراپ نہیں کرسکے گی۔" معین صاحب کف کے بٹن بند کرتے بہ عجلت زینے طے کرتے اتر رہے تھے، تب ہی عقب سے شجر کی امی کی آواز آئی۔ انہوں نے کلائی پر بندھی گھڑی میں ٹائم دیکھا اور پریشانی سے گویا ہوئے۔

"اوہو، میں ویسے ہی آل ریڈی لیٹ ہوں۔ مجھے کورٹ جانا ہے، اپنے دوست کے ہمراہ، وہ انتظار کررہا ہوگا میرا۔ وہ ویسے ہی اتنی بڑی مشکل میں پھنسا ہوا ہے اور میں ہوں کہ آفس سے جلدی چھٹی لینے کے باوجود وقت پر نہیں پہنچ سکا اور اب آپ کہہ رہی ہیں کہ شجر کو جاکر لے آؤں۔" انہوں نے پیشانی کو اضطراری حالت میں مسلا، لاؤنج میں داخل ہوتے ولی نے ان کی تمام گفتگو ملاحظہ کی اور بڑی خندہ پیشانی سے ان کا یہ کام اپنے ذمے لے لیا۔

"تھینک یو بیٹا! دراصل وہ رکشہ، ٹیکسی سے سفر کرتے کتنا گھبراتی ہے، اس سے تو آپ بھی خوبی واقف ہو اور پھر اس کی اکیڈمی بھی کافی دور ہے۔" انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر رسان سے کہا۔

"ارے کوئی بات نہیں چچا جان! میں بھی تو فارغ ہی ہوں فی الحال۔" ولی نے شائستگی سے کہا۔
"جیتے رہو۔" وہ اس کا شانہ تھپتھپا کر باہر نکل گئے اور ولی صاحب دل ہی دل میں خوش ہوتے گاڑی کی جانب بڑھ گئے۔
اکیڈمی کے باہر ابو کے بجائے ولی کو اپنا منتظر پایا تو اس کی بھنویں تن گئیں۔
"چلیے بیٹھیے میڈم!" وہ خالصتاً شوفر کی طرح گاڑی کا فرنٹ ڈور کھول کر مسکرایا۔
"ابو کیوں نہیں آئے؟" اس نے تیوریاں چڑھا کر استفسار کیا۔
"وہ کورٹ جارہے تھے کسی کام سے، تو میں نے اپنی رضاکارانہ خدمات پیش کردیں۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر سر کو خم دے کر بولا۔ اس نے ولی کی بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر، فرنٹ ڈور نظر انداز کرکے آگے بڑھ گئی اور جوں ہی بیک ڈور کھول کر وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی، اچھل کر باہر آگئی۔
"یہ کیا ہے؟" اس نے خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورا۔ اکیڈمی کے باہر اس وقت لوگوں کی کافی آمدورفت تھی، تب ہی اس نے دانتوں کو بھینچ کر آواز کو قدرے پست ہی رکھا۔
"کیا ہوا......اور یہ تم باہر کیوں آگئیں؟" وہ معصومیت سے دروازے کے اندر جھانک کر بولا۔
"اوہ! یہ سیٹ تو ساری کی ساری پانی سے بھیگی ہوئی ہے۔ لگتا ہے کسی نے شرارت کی ہے۔" وہ اتنے اطمینان سے بولا کہ جیسے یہ شرارت اس کی گاڑی کے ساتھ نہیں کسی اور کی گاڑی کے ساتھ کی گئی ہو۔
"شرارت؟" وہ غضب ناک ہوکر بولی۔ "جانتی ہوں میں کہ یہ شرارت ہے تمہاری یا دانستہ کی گئی حرکت۔"
"اچھا چلو جو بھی ہے، یہ سب بعد میں ڈسکس کرلیں گے، فی الحال تو تم جلدی سے گاڑی میں بیٹھو۔ سب ہماری جانب مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔" ولی نے اس کی توجہ راہ چلتے لوگوں کی جانب مبذول کروائی جو واقعی انہیں مڑ مڑ کر دیکھ رہے تھے۔
وہ چاروناچار فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ گئی۔ اس

Digitized by Google

نے بھی سرعت کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور گاڑی فل اسپیڈ میں بھگانا شروع کردی۔

"یہ آپ مجھے گھر پہنچا رہے ہیں یا جناح اسپتال؟" شجر اس کی تیز رفتار ڈرائیونگ پر گھبرا کر چلائی۔

"آپ کی ہمراہی میں تو ہم اگر جناح اسپتال بھی پہنچ گئے تو وہ ہمیں جناح اسپتال بھی جنت جیسا دکھائی دے گا۔" وہ ایک آنکھ دبا کر لوفرانہ انداز میں بولا۔

"شٹ اپ۔" وہ غرائی۔

"اوکے۔" وہ ذرا متاثر نہ ہوا مگر کار کی رفتار دھیمی کردی۔ شجر نے سکون کا سانس لیا۔ کچھ دیر تک ان کے درمیان خاموشی بولتی رہی پھر ولی نے ہی اس جامد خاموشی کو چیرا۔

"مجھے تم سے کچھ بات کرنی تھی۔"

"ہاں وہ تو مجھے آپ کی حرکات سے ہی اندازہ ہو گیا تھا۔" وہ اب تک ولی سے بے گانگی کا لبادہ اوڑھ کر آپ جناب سے ہی بات کررہی تھی۔

وہ کچھ دیر بات کو شروع کرنے کا سرا ڈھونڈنے لگا۔ یہاں آنے سے قبل اس نے ذہن میں سارے الفاظ ترتیب دے لیے تھے مگر شجر کا یکسر اجنبی رویہ دیکھ کر اس کے سارے الفاظ دماغ سے محو ہو گئے مگر وہ یہ چند قیمتی لمحات میسر آنے پر انہیں مزید گنوانا نہیں چاہتا تھا تب ہی گلا کھنکھار کر گویا ہوا۔

"وہ میں تمہیں ایک حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔" آخر کار اس نے سرا ڈھونڈ ہی لیا۔ شجر نے اسے ابرو اچکا کر استعجابیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"دیکھو! میں اب جو کچھ بھی تمہیں بتاؤں اسے ذرا تحمل سے سننا۔" ولی کو اتنی اہم بات یوں گاڑی میں بیٹھ کر، کرنا اچھا تو نہیں لگ رہا تھا مگر وہ گھر میں اسے دستیاب بھی تو نہ ہو رہی تھی۔

"ایسی کیا بات ہے جو آپ کو یوں صبر و تحمل کا پاٹ پڑھانا پڑھ رہا ہے۔" اس کی ساری حسیات بے دار ہو گئیں۔

"پہلے تو تم یہ آپ جناب کا تکلف ختم کرو، بالکل اچھا نہیں لگ رہا مجھے اور پھر تم کب سے میرا احترام کرنے لگیں۔" وہ اب زچ ہونے لگا تھا اس کی بے رخی سے۔ اس نے طنزیہ نگاہوں سے ولی کی جانب دیکھا۔

"بے تکلفی تو دلوں کی وابستگی سے مشروط ہوتی ہے، جب وہ ہی باقی نہ رہے تو احترام از خود ہی ملحوظ خاطر ہو جاتا ہے۔"

"وہی تو میں پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ یہ تناؤ کی دیوار ہمارے درمیان کیونکر قائم ہوئی۔" وہ دھیرے دھیرے اسے اپنے مدعے کی جانب گھیرنے لگا۔

"یہ آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں؟ مجھ سے سالوں پہلے جڑے تعلق کو توڑ کر دیا رِ غیر جا بیٹھے اور معصوم بن کر مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میرے تلخ رویے کا سبب کیا ہے؟" آخر اس کے اندر کا لاوا ابل ہی پڑا۔

"میں نے کب تم سے تعلق توڑا اور کب ہمارے درمیان اس متعلق کوئی بات ہوئی، بولو۔" وہ بظاہر ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہا تھا مگر اس کی ساری توجہ اس کے جواب پر تھی۔

"آپ نے مجھ سے براہ راست کچھ نہ کہا تو کیا ہوا۔ آپ کے دل میں پلتا عناد، آپ کی نفرت اور وہ سب کچھ جو میرے خلاف آپ کے دل میں موجود تھا، ایک ابال کی صورت مجھ تک آپ کے کمرے کے باہر کھڑے کھڑے پہنچ گیا تھا۔" اس نے ایک کٹیلی نگاہ اس پر ڈالی اور آنکھوں میں در آنے والی نمی کو چھپانے کی غرض سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

"یہ ہی تو وہ حقیقت ہے جس سے میں تمہیں آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ میری وہ ساری بکواس جو تم نے سنی وہ سب ایک منصوبے کے تحت تھا۔ میرا تمہیں ہرٹ کرنے کا مقصد محض تمہاری اصلاح کے لیے تھا اور کچھ نہیں۔" اس نے ذرا خائف ہو کر اس کی سمت دیکھا کہ جانے اس بات پر اس کا کیسا ردعمل سامنے

آتا ہے۔

''وہاٹ......؟'' حسب توقع وہ پوری قوت سے دھاڑی۔

''میری ذات کے پرخچے اڑا کر، میری روح کو تار تار کرنے میں، میری کون سی اصلاح کا راز مضمر تھا، ذرا میں بھی تو سنوں۔'' اس کی آنکھوں میں دکھ اور بے یقینی کا سمندر موجزن تھا۔

اسٹیئرنگ پر مضبوطی سے جمے اس کے ہاتھ پل بھر کو کانپ سے گئے مگر پھر وہ فوراً ہی سنبھل گیا کہ ڈرائیونگ کے دوران اس کی ذرا سی بے احتیاطی واقعی انہیں گھر کے بجائے جناح اسپتال پہنچا سکتی تھی۔

''دراصل شجی! تمہارے دن بہ دن بڑھتے وزن سے میں بہت خائف رہنے لگا تھا۔ امی، چچی جان کسی کی بات پر تم سرے سے کان ہی نہیں دھرتی تھیں، حتیٰ کہ دوست، رشتے داروں کی پھبتیاں بھی تمہیں بری نہیں لگتی تھیں۔ یہ ہی نہیں گھریلو امور میں بھی تمہاری دلچسپی صفر تھی۔ ایسی خصوصیات کسی بھی لڑکی کے لیے خطرناک حد تک بگاڑ کا سبب بن جاتی ہیں، جس کا تمہیں ذرہ برابر بھی ادراک نہ تھا۔

بس تمہارے اندر اس احساس کو بیدار کرنے کے لیے مجھے یہ سب کرنا پڑا، ورنہ یقین جانو میں تمہیں ہرٹ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔'' اس نے ایک ہاتھ اسٹیئرنگ پر اور دوسرا ہاتھ اس کے سرد ہاتھوں پر رکھا، جسے اس نے بری طرح جھٹک دیا۔

''جھوٹ...... بالکل جھوٹ...... تم نے یہ ساری کہانی مجھے شیشے میں اتارنے کے لیے گھڑی ہے۔ مجھے اندازہ تھا کہ تم واپس آ کر مجھ میں اتنا بدلاؤ دیکھو گے تو اپنی پچھلی باتوں پر پشیمان ہو کر میرے پیچھے ضرور آؤ گے مگر تم کسی زعم میں مت رہنا۔ اتنی ارزاں نہیں ہوں میں، دن رات جتن کر کے یہ تبدیلیاں میں نے تمہاری خوشنودی کے لیے نہیں کیں بلکہ اسی وقت کے لیے کیں جب تم پچھتاوؤں کی آگ میں جل کر میرے پیچھے آؤ گے اور ٹھیک میں بھی تمہیں اسی طرح دھتکاروں گی جس طرح تم نے مجھے دھتکارا۔'' اس کے لہجے میں آگ کے شعلوں کی سی لپک تھی جو ولی کے تن من کو جھلسائے دے رہی تھیں۔

''میری کسی بات میں جھوٹ کی آمیزش نہیں ہے شجی! میں نے جو کچھ بھی کہا وہ سب کچھ سچ پر مبنی ہے۔ یقین نہیں آتا تو امی اور چچی جان سے جا کر پوچھ لو۔ میں نے انہیں اعتماد میں لے کر ہی یہ سب کیا۔'' ابھی وہ مزید اپنے دفاع میں کچھ کہتا مگر گاڑی گھر کے سامنے رک چکی تھی اور شجر جو اس کی آخری بات پر گنگ سی بیٹھی تھی۔ آنکھوں میں ڈھیروں آنسو لیے ایک جھٹکے سے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر بھاگتی ہوئی گھر میں داخل ہو گئی۔ ولی نے ایک سرد آہ خارج کی اور گاڑی کو سبک رفتاری سے پورچ تک لے آیا۔

☆☆☆

گھر کی فضا شجر کے رویے کے باعث کچھ دنوں سے بوجھل بوجھل سی تھی۔ (صد شکر تھا کہ گھر کے مردوں سے ولی کا کارنامہ ابھی تک مخفی تھا اور وہ اس کی ناراضی کو اس کی طبیعت کی خرابی پر ہی محمول کر رہے تھے۔ گھر پر چھائے جمود میں ارتعاش ولی کو ملٹی نیشنل کمپنی میں شاندار سی جاب ملنے پر پیدا ہوا اور وہ یہ ہی خبر سنانے ترنگ میں کی چین کو انگلی میں گھماتا لاؤنج میں داخل ہوا۔ مگر کچن سے زور زور سے اٹھا پٹخ کی آتی آوازوں پر ٹھٹک کر رک گیا۔ اس نے اچنبھے سے کچن کی جانب دیکھا اور پھر کندھے اچکا کر امی کے کمرے کی جانب بڑھنے لگا۔ اسی اثناء میں شاید کوئی کانچ کا برتن ٹوٹا گیا تھا تب ہی ایک چھناکے کی آواز سے پورا لاؤنج گونج اٹھا۔

''یاالٰہی خیر! یہ آج کچن میں کس قسم کی کوکنگ ہو رہی ہے جو اتنا شور؟'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا کچن کی جانب چل دیا اور پھر وہاں کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت کی شدت سے پھیل گئیں۔ کچن چونکہ کافی کشادہ تھا لہٰذا ایک چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل

Digitized by Google

اور دو تین کرسیاں گھر والوں کی سہولت کے پیش نظر رکھ دی گئی تھیں اور اب وہ ڈائننگ ٹیبل انواع واقسام کی اشیاؤں سے بھری پڑی تھی۔ فرنچ فرائز کا پہاڑ، سموسے، رول اور نہ جانے کیا کیا الا بلا...... مگر حیرت سے گنگ وہ شجر کو دیکھ کر ہو گیا تھا جو ندیدوں کی طرح ان پر ٹوٹی پڑی تھی۔

''شجی......'' وہ صدمے سے چُور اس تک پہنچا۔ شجر نے چند لمحے ٹھٹک کر اسے دیکھا اور پھر سے اپنے سابقہ کام میں مشغول ہو گئی۔

''یہ کیا کر رہی ہو یار؟ اتنی محنت سے تم نے اپنا وزن کنٹرول کیا تھا۔ کیا پھر سے اسے بڑھانا ہے۔'' ولی اس کے آگے سے فرنچ فرائز اور سموسوں کی پلیٹیں جھپٹتے ہوئے بولا۔

اس نے ایک خشمگیں نگاہ اس پر ڈالی اور رات کا بچا ہوا ایک پزا جو رات کو سعد اپنے دوستوں کی تواضع کے لیے لایا تھا نکالا اور ٹیبل پر پٹخ دیا۔ فریج سے آئس کریم نکالی اور شروع ہو گئی اور ولی اس کے پیچھے پیچھے، کبھی اس سے پزا چھین کر رکھتا تو کبھی آئس کریم...... اور وہ تھی کہ پاگلوں کی طرح کبھی ایک چیز نکال کر کھاتی تو کبھی دوسری......

''دیکھو شجی! میری بات سنو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم غصے میں ایسا کر رہی ہو مگر یہ سب کر کے الٹا تمہارا ہی نقصان ہے ناں۔ پلیز خدا کو مانو، ایسا مت کرو۔'' اب کے اس نے شجر کے ہاتھ سے کولڈ ڈرنک کی ڈیڑھ لیٹر والی بوتل لے کر رکھی جو وہ منہ سے لگائے غٹا غٹ چڑھا رہی تھی۔

''ہٹ جاؤ یہاں سے...... اور خبردار! جواب تم نے میرے ہاتھ سے کچھ بھی چھینا تو۔'' اس نے غرا کر کہا اور رول کو کیچپ میں ڈپ کر کے کھانے لگی۔

''پاگل ہو گئی ہو کیا؟'' ولی اچھا خاصا زچ ہو گیا۔

''بہت شوق ہے ناں تمہیں، مجھے اسمارٹ دیکھنے کا، مجھے بدلنے کا۔ کرتی ہوں تمہاری ساری خواہش پوری۔'' وہ منہ میں رول ٹھونستے ہوئے بولی تو ولی کو بالکل سائیکو کیس لگی۔

''یار دیکھو، ایک اسمارٹ سی لائف پارٹنر کی خواہش تو ہر مرد ہی رکھتا ہے ناں، تو اگر میں نے ایسی خواہش کر لی تو کیا برا کیا اور تم ذرا تصور میں مجھے فربہی مائل، موٹی توند اور تھل تھل کرتے وجود کے ساتھ دیکھو تو میں تم جیسی اسمارٹ اور خوب صورت لڑکی کے ساتھ کیسا لگوں گا۔'' ولی کے کھینچے گئے نقشے کے تناظر میں شجر کے تصور میں چھم سے ایک موٹا تازہ ولی آ گیا، جس کی توند پولیس والوں کی طرح باہر اور چہرہ لٹکے ہوئے سیب کی مانند، جو ذرا سی بھی جنبش کرنے پر بال کی طرح اچھلنے لگے۔ ولی کو چشم تصور میں ایسا دیکھ کر اسے ایک دم جھرجھری آ گئی۔

''دیکھا دیکھا...... آ گئی ناں تمہیں پھریری۔'' ولی نے پرجوش ہو کر زوردار تالی بجائی۔

''دیکھ لو تم مجھے تصور میں بھی فربہ نہیں دیکھ سکیں اور چاہتی ہو کہ تم مجسم ہو کر میرے سامنے آؤ تو میں تمہیں موسٹ ویلکم کہوں؟ واہ یہ تو کھلا تضاد ہوا ناں۔''

شجر نے کھانے کا شغل ترک کیا اور سنک میں ہاتھ دھو کر باہر آ گئی۔ ولی لپک کر اس کے پیچھے آیا اور اسے شانوں سے تھام کر اس کا رخ اپنی جانب کرتے ہوئے بولا۔

''مان جاؤ ناں شجی پلیز...... میں جانتا ہوں تم مجھ سے خفا ضرور ہو مگر تمہارے دل کی دھڑکنوں میں اب بھی میرا ہی نام بستا ہے۔ محبت کی کن من پھوار میں تمہارا وجود بھی ایسے ہی بھیگ رہا ہے۔ جیسا کہ میرا من...... پلیز خود کو اور مجھے اس پیار بھری رم جھم تلے ہی رہنے دو۔ نفرت کی آندھی میں یوں جذبوں کو تار تار مت کرو۔'' اس کی ملتجیانہ نگاہیں شجر کے چہرے پر جمی تھیں۔

''میری پچھلی تمام نامعقول باتوں کو بھلا کر صرف ایک بار میرا ہاتھ تھام لو۔ زندگی بھر تمہیں

مایوس نہیں ہونے دوں گا۔ بولو...... دو گی ناں مجھے تلافی کا ایک موقع۔"

شجر نے اس کی جانب نظریں اٹھا کے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکورے لیتے جذبے کی صداقت شفاف آئینے کی طرح منعکس ہو رہے تھے، جس دن سے ولی نے اس پر ساری سچائی منکشف کی تھی تب ہی سے وہ سینکڑوں بار اپنے دل کو ٹٹول چکی تھی۔ جہاں ولی پورے استحقاق کے ساتھ براجمان تھا۔

محبت بھلا کب تک روٹھ سکتی ہے۔ وہ تو محبوب کی کڑی سے کڑی خطا بھی بڑی آسانی سے درگزر کر جاتی ہے۔ پھر ولی کی خطا تو کوئی اتنی بڑی بھی نہ تھی۔ اتنے دنوں میں دل بارہا اسے یہ ہی سب باور کروا رہا تھا مگر دماغ اسے تسلیم کرنے میں تامل کا شکار تھا۔ مگر تاریخ گواہ ہے کہ دل و دماغ کی جنگ میں فتح ہمیشہ دل ہی کی ہوئی ہے، سو شجر بھی زیادہ دنوں تک دل کے مقابل نہ ٹھہر سکی اور پورے قد سے محبت کے سامنے ڈھیر ہو گئی۔

وہ لبوں کو کچلتی، اضطراری حالت میں ہاتھوں کو مسلتے ہوئے پیروں پر نگاہ جمائے منتشر ہوتے خیالات سے الجھ رہی تھی۔

ولی اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات کھوج رہا تھا۔ شاید وہ اس کے جذبوں کی آنچ سے پگھل رہی تھی

"ویسے سیانے کہہ گئے ہیں کہ خاموشی نیم رضا مندی ہوتی ہے۔" اس نے شرارت سے شجر کی ناک پکڑ کر کھینچی۔ جانتا تھا ناں کہ اس حرکت سے وہ کتنا چڑتی ہے اور اب بھی یہ ہی ہوا۔ حیا آلود نگاہوں نے یکا یک غصے کا لبادہ اوڑھا۔ بے اعتنائی کا خول تڑخا اور وہ پھر سے پہلی والی شجر بن کر اسے گھور کر بولی۔

"سیانے ہمیشہ ٹھیک ہی کہتے ہیں آئی سمجھ میں۔" بے اختیاری میں اس نے ولی کے کہے ہر لفظ پر اقرار کی مہر ثبت کر دی۔ ولی کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ چمکی تو اسے احساس ہوا کہ روانی میں وہ کیا کہہ گئی ہے۔ اس نے بے ساختہ زبان دانتوں تلے داب لی۔ ولی کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

"اچھا بس زیادہ دانت نکوسنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خوش تو محترم ایسے ہو رہے ہیں جیسے میں نے ان کو سیدھا سیدھا آئی لو یو بول دیا ہو۔" شجر اپنی پرانی جوان میں واپس آ چکی تھی جو اس کے دھلے نکھرے دل کی غماز تھی۔

"چلیں آپ ہمیں سیدھا سیدھا آئی لو یو نہ بولیں، مگر ہم الٹے سیدھے ہر طریقے سے آپ کو آئی لو یو ٹو، تھری، فور...... سب کہنے کو تیار ہیں۔" ولی نے شجر کی جانب قدرے جھک کر کہا تو وہ فوراً گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ولی کا جان دار قہقہہ لاؤنج میں گونجا تو شجر کی کھنکتی ہنسی بھی اس میں شامل ہو گئی۔

داخلی دروازے سے اندر آتی دونوں کی ماؤں نے یہ دل فریب منظر دیکھا تو شاپنگ بیگز وہیں فرش پر ڈھیر کر کے ایک دوسرے کے گلے لگ گئیں۔ خوشی سے سرشار دمکتے چہرے بہار کی آمد کا پتا دے رہے تھے اور اس کی دستک ان دونوں نے بھی اپنے دروازے پر سن لی تھی۔

☆

گلِ کہسار
فرح بخاری
قیمت -/400 روپے
بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار کراچی۔ فون 32216361

Digitized by Google

قرۃ العین خرم ہاشمی

"کیا تمہیں محفل میں اٹھنے بیٹھنے کے آداب معلوم نہیں ہیں؟ تمہارے اس رویئے کی وجہ سے سب کے سامنے میری کیا عزت رہ گئی؟" سلمان لاؤنج کے وسط میں کھڑا چیخ چیخ کر بول رہا تھا۔

اس کے سامنے کھڑی زویا، سر جھکائے ضبط کی کڑی منزلوں سے گزر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر شرمندگی اور آنکھوں میں نمی تھی۔

زویا جانتی تھی کہ کچھ دور کچن میں کام کرتی ملازمہ کے کان اسی طرف ہی لگے ہوئے ہیں۔ مگر وہ اپنے مجازی خدا کو کیا سمجھاتی کہ عزت صرف مرد کی ہی نہیں ہوتی بلکہ بیوی کے درجے پر فائز عورت کی بھی ہوتی ہے۔

سلمان کے منہ میں جو آیا وہ بولتا چلا گیا۔ زویا چپ چاپ سنتی رہی۔ اگر وہ کوئی وضاحت دیتی یا اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی کوشش کرتی تو سلمان کے غصے کو مزید ہوا ملنی تھی۔ وہ ایسا ہی تھا، اپنے آگے صرف زویا کی بات نہ سننے والا۔ باقی تو سب کے ساتھ اس کا رویہ بہت الگ تھا۔

آج سلمان کے کچھ قریبی دوست اپنی بیویوں کے ساتھ لنچ پر مدعو تھے۔ زویا نے ہر چیز بہترین بنائی اور سلیقے سے پیش کی مگر وہ اپنی خراب طبیعت کی وجہ سے محفل میں زیادہ ہنس بول نہیں سکی۔ اس کی خاموشی پر ہنسی مذاق میں کئی تبصرے ہوئے جو سلمان کو بہت برے لگے اور مہمانوں کے گھر سے جاتے ہی وہ زویا پر بری طرح برس پڑا۔ جب بول بول کر سلمان کا غصہ کچھ کم ہوا تو وہ وہاں سے چلا گیا۔ زویا خاموشی سے صوفے پر بیٹھ کر آنسو بہانے لگی۔

"پتا نہیں پاپا، مما نے اس شخص کو میرے ہم سفر کے طور پر کیوں چنا۔ جسے اپنی ذات کے علاوہ کسی اور کی فکر ہی نہیں ہے۔"

گزرے دس مہینوں میں زویا نے یہ سوال کئی بار خود سے کیا تھا۔ سلمان کو نرم و نازک، سلیقہ مند اور ذہین زویا سے شادی کے پہلے دن سے ہی کئی شکوے تھے۔

زویا ایسی نہیں ہے، زویا ویسی نہیں ہے۔ زویا نے یہ نہیں کیا۔ زویا نے وہ نہیں کیا، غرض سلمان کو زویا کی اتنی خامیوں کا پتا تھا کہ اکثر زویا بھی کنفیوز ہو جاتی کہ اس میں کوئی خوبی ہے بھی یا نہیں۔

زویا اکثر سوچتی کہ سلمان کے سخت رویے کی وجہ سے وہ پہلی بار ماں بننے کی خوشی کو بھی محسوس نہیں کر پا رہی تھی۔

"شاید۔ یہ سب اس وجہ سے ہے کہ سلمان اپنی پہلی منگیتر کو نہیں بھولے۔" زویا نے بے دلی سے سوچا۔

زویا سے پہلے سلمان کی منگنی تین سال لیلیٰ سے رہی مگر پھر اچانک ہی شادی کی تاریخ طے ہونے سے پہلے ان کی منگنی ٹوٹ گئی۔ سلمان کے گھر والوں نے زیادہ انتظار کرنے کے بجائے، سلمان کی جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ والا معاملہ کیا۔ زویا کو سلمان کی ٹوٹی ہوئی منگنی کے بارے میں شادی سے پہلے ہی پتا تھا مگر یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی کہ اس کو بنیاد بنا کر سلمان کے رشتے سے منع کر دیا جاتا۔

"کاش پاپا اس بات کو بنیاد بنا کر سلمان کے رشتے سے منع کر دیتے۔" زویا نے گہری سانس لے کر سوچا اور اپنے آنسو صاف کرتی ہوئی کچن کی طرف چل دی۔

کچھ دنوں کے بعد زویا نے اپنے دل میں

Digitized by Google



اٹھتے شکوے کا سرسری سا ذکر اپنی مما سے کیا تو وہ چونک گئیں۔ زویا کی آنکھوں کی نمی سے وہ انجان نہیں تھیں۔ اس لیے زویا کو تسلی دینے لگیں۔

''زویا! جب ایک بات دل سے تسلیم کرلوگی تو تمہارا یہ شکوہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے گا۔''

''وہ کیا مما؟'' زویا نے حیرت سے پوچھا۔

''زویا۔ یہ جوزمین پر رشتے بنتے ہیں نا۔ اس کا فیصلہ اوپر کہیں آسمانوں میں ہوتا ہے۔ اللہ کی حکمت کیا ہے یہ ہم نہیں جانتے مگر اللہ کسی کے حق میں برا نہیں کرتا، اس بات پر تو یقین رکھ سکتے ہیں نا۔ چھوٹی چھوٹی آزمائشیں رشتوں کو مضبوط بناتی ہیں۔

اگر آج سلمان کا رویہ تمہارے ساتھ ٹھیک نہیں ہے تو آنے والے وقت میں بہتر بھی ہوسکتا ہے۔ یہ بھی تو دیکھو کہ وہ تمہارا خیال بھی رکھتا ہے۔ تمہیں کسی چیز کی تنگی نہیں آنے دیتا۔ تھوڑا وقت دو اسے۔ اتنی اچھی بیوی سے زیادہ دیر تک وہ بے پروا نہیں رہ سکے گا۔''

Digitized by Google

ممانے آخر میں ہلکا پھلکا انداز اپنایا تو زویا کے دل میں اطمینان پھیلنے لگا اور وہ سلمان کی بہت سی اچھی عادتوں کے بارے میں سوچ کر مسکرانے لگی۔

"ہاں شاید کہ آنے والا بچہ خوشیوں کے سب موسم اپنے ساتھ لے آئے۔ ان شاء اللہ۔" زویا نے دل میں سوچتے ہوئے دعا کی تھی۔

دعا جو یقین کے پروں پر سفر کرتے ہوئے رب کی بارگاہ میں اپنے "کن" کے لیے مسلسل دستک دیتی ہے۔

☆☆☆

"ہیلو مس۔ آج کیا لنچ کرنے کا موڈ نہیں۔"

لنچ بریک میں بھی لیلیٰ کو لیپ ٹاپ پر کام کرتے دیکھ کر ولی نے پاس آکر پوچھا تو لیلیٰ نے مسکرا کر نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ بہت اہم اسائمنٹ پر کام کر رہی تھی۔ ولی سر ہلاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

کچھ دیر کے بعد اشتہا انگیز خوشبو پر لیلیٰ نے چونک کر سر اٹھایا تو ولی نے ہاتھ میں پکڑی ٹرے میز پر رکھی اور خود بھی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"جلدی سے آجاؤ۔ امی نے بہت مزے کی بریانی بنائی ہے۔" ولی نے ایک پلیٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا تو لیلیٰ نے مسکراتے ہوئے لیپ ٹاپ بند کیا۔

"ہوں۔ سچ میں بہت مزے کی بنی ہے۔" لیلیٰ نے داد دی تو ولی نے فخریہ کالر جھاڑا۔

"آخر ماں کس کی ہیں۔ ذائقہ تو ہو گا ہاتھ میں۔" ولی نے شوخی سے کہا۔

"ہر بات کا کریڈٹ خود لینا ضروری نہیں ہوتا۔" لیلیٰ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ بات آپ کہہ رہی ہیں اینکر صاحبہ؟ جبکہ خبریں پڑھتے ہوئے ہر بات کا کریڈٹ لینے کی پوری کوشش ہوتی ہے۔" ولی نے منہ بنا کر کہا۔

"ارے وہ تو ہر چینل کی مجبوری ہے نا۔" لیلیٰ نے مسکرا کر کہا۔

"واہ۔ آپ کریں تو جائز، ہم کریں تو ناجائز۔ یہ سچ میں کھلا تضاد ہے۔" ولی کی بات پر لیلیٰ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"ویسے آپ چینل میں بیٹھ کر چینل کے خلاف ہی بول رہے ہیں۔ چاہتے کیا ہیں؟" لیلیٰ نے شرارت سے پوچھا۔ ولی نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔

"تمہیں۔" ولی نے آرام سے کہا تو لیلیٰ ایک دم سنجیدہ ہوگئی۔

"پھر وہ ہی بات۔" لیلیٰ نے کہا مگر اس کے لہجے میں مزاحمت نہیں تھی۔ یہ بات ہی ولی کے لیے امید افزا تھی کہ پہلے انکار میں جو شدت تھی، وہ آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی تھی۔

"یہ بات تب تک ہوتی رہے گی، جب تک کہ تم ہاں نہیں کر دیتیں۔ میری امی نے اب بریانی بنا کر لنچ ٹائم میں آفس بھیجنے سے انکار کر دیا ہے کہ اپنی بیوی لاؤ اور اس سے فرمائشیں کرواب۔" ولی نے مظلومیت سے کہا۔

"اوہ تو آپ کو بریانی کی وجہ سے شادی کرنی ہے۔" لیلیٰ نے محظوظ ہوتے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں۔ بلکہ اپنی شادی پر مہمانوں کو بریانی کھلانی ہے۔ مان جاؤ پلیز۔ میں نے کافی پیسے جوڑے ہوئے ہیں اپنی شادی کے لیے۔ اگر تم نہیں مانیں تو مجھے خدشہ ہے کہ میں ان پیسوں سے دنیا کی سیر پر نہ نکل جاؤں اور وہاں کسی حسین گوری کی براؤن زلفوں کا شکار ہو کر ہمیشہ کے لیے اس کا اسیر نہ ہو جاؤں۔ دیکھو۔ میرے جیسے لڑکے کو ہاتھوں سے گنوا کر بڑھاپے میں پچھتاؤ گی تم۔" ولی نے اس انداز میں کہا کہ ہنستے ہنستے لیلیٰ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"ولی۔ تم کبھی نہیں سدھرو گے۔ جیسے لاابالی یونیورسٹی میں تھے، ویسے ہی آج ہو۔ احمق کہیں کے۔" لیلیٰ نے ٹشو پیپر سے اپنی آنکھیں صاف کی۔

"یہ تو اچھی بات ہے نا۔ قسم لے لو محبت میں بھی ایسا ہی رہوں گا۔ کبھی نہ بدلنے والا۔" ولی نے سادہ لہجے میں گہری بات کی تھی۔ لیلیٰ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"اس ویک اینڈ پر میرے والدین آرہے ہیں تمہارے گھر۔ تمہارا فیصلہ کچھ بھی ہو، ہماری دوستی

Digitized by Google

کے درمیان نہیں آئے گا۔" ولی نے سنجیدگی سے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا تو لیلیٰ گم صم بیٹھی رہ گئی۔

محبت میں نہ بدلنے والی بات لیلیٰ کو بہت اندر تک چبھی تھی۔

☆☆☆

لیلیٰ کا موڈ پچھلے تین دن سے سخت خراب تھا۔ وہ کسی سے بھی ٹھیک سے بات نہیں کر پا رہی تھی۔ نہ گھر والوں سے اور نہ آفس میں۔ اس کے مزاج کا روکھاپن ولی کی نظروں سے چھپا نہیں رہا تھا مگر اس نے لیلیٰ کو سوچنے کے لیے کچھ وقت دینا ضروری سمجھا۔

ایک شام لیلیٰ گھر واپس آئی تو مما کو لاؤنج میں اپنا منتظر پایا۔ لیلیٰ گہری سانس لے کر رہ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ آج یا کل اس سے جواب ضرور مانگا جائے گا۔

"تمہارے ڈیڈ کو تمہارے فیصلے کا انتظار ہے لیلیٰ۔" مما کی سرد آواز پر لیلیٰ تھک کر ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"اور مجھ سے فیصلہ نہیں ہو رہا مما۔" لیلیٰ نے بے بسی سے کہا۔

"جبکہ تم فیصلہ کرنے میں ہمیشہ آگے رہی ہو۔" مما کا سرسری لہجہ بہت کچھ جتاتا ہوا تھا۔ لیلیٰ نے گردن موڑ کر ماں کی طرف دیکھا۔

"کیا آپ بھی یہ سمجھتی ہیں کہ میں نے سلمان کو چھوڑ کر غلط کیا۔" لیلیٰ کا انداز دھیما تھا۔

"ہاں۔ اس لیے کہ سلمان کے بعد تم کسی اور کو اپنے ہم سفر کے طور پر نہیں دیکھنا چاہتیں۔" مما نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"مما۔ یہ دل کے فیصلے ہوتے ہیں۔" لیلیٰ نے تاویل پیش کی۔

"دل کا فیصلہ ہوتا تو تم کبھی اپنی منگنی نہیں توڑتیں لیلیٰ۔ مان لو کہ تم نے اس وقت دل کی نہیں اپنے دماغ کی مانی تھی۔" مما نے اسے آئینہ دکھایا تھا۔ لیلیٰ چپ چاپ ان کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔

"دیکھو لیلیٰ۔ تمہارے ڈیڈ بہت اصول پسند آدمی ہیں اور انھوں نے اپنی تمام اولاد کو یہ ہی سکھایا تھا۔ پہلی بار تمہاری وجہ سے انھیں زبان دے کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ جس کا رنج انھیں آج تک ہے۔ بڑے تینوں بچے اپنی اپنی شادی شدہ زندگی میں خوش ہیں۔

بحیثیت والدین ہم چاہتے ہیں کہ اپنی آخری ذمہ داری سے بھی سبک دوش ہو جائیں۔ تم نے جو چاہا وہ پالیا۔ اب بہتر ہے کہ تم سنجیدگی سے اپنے لیے آئے رشتوں میں سے کسی ایک کو فائنل کر کے ہمیں انفارم کر دو۔ تمہارے ڈیڈ مزید تاخیر برداشت نہیں کریں گے اور اچھی بیٹیاں وہ ہی ہوتی ہیں جو والدین کے صبر کو ان کی سزا نہیں بناتیں۔"

مما نے سنجیدگی سے کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

لیلیٰ خاموشی سے اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھتی رہی۔ قسمت کے آسمان پر کبھی محبت کا ستارہ پوری شان سے چمکتا تھا، مگر اس نے کیا کیا؟ اپنے کیریر کی خاطر محبت کو چھوڑ دیا۔

تین سال سلمان کے ساتھ منگنی کی ڈور میں بندھے رہنے کے بعد، جب اسے اپنی فیلڈ میں آگے بڑھنے کا موقع ملا تو اس نے شادی سے انکار کر دیا تھا جب کہ سلمان شادی کی تاریخ مزید آگے نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ دونوں کی ضد ہی اس رشتے کو توڑنے کی وجہ بنی اور آج دونوں ہی اپنی اپنی زندگی میں ادھورے پن کے ساتھ جی رہے تھے۔

☆☆☆

فراز عشق کی دنیا تو خوب صورت تھی
یہ کس نے فتنہ ہجر و وصال رکھا ہے

سلمان نے سگریٹ سلگا کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ رات کی خاموشی، اس کے اندر پھیلی خاموشی جیسی تھی۔

"شاید میرے اندر موت جیسا سناٹا ہے۔" سلمان نے تلخی سے سوچا۔ سگریٹ کے دھوئیں کے ساتھ اس کا وجود بھی دھواں بن کر ماضی میں چکرا رہا تھا۔

"تم نے مجھے محبت کرنا سکھایا لیلیٰ اور تم ہی مجھے

Digitized by Google

بیچ راستے میں چھوڑ گئیں۔ میں چاہ کر بھی تمہارے انداز، تمہاری باتیں، تمہاری ادائیں نہیں بھول سکتا۔ شاید ہم محبت اور اپنے احساسات کو بھی مسالا لگا کر حنوط کر لیتے ہیں۔

کاش تم جان سکتیں کہ تمہارے ساتھ گزارے ہر لمحے کو میں نے اپنے اندر حنوط کر دیا ہے۔ بھلے کتنے ہی زمانے گزر جائیں، تم میرے اندر محبت بن کر ہمیشہ زندہ رہو گی۔"

سلمان نے ہمیشہ کی طرح خود سے عہد کیا اور سگریٹ کو بجھا کر واپس پلٹا۔ خالی بیڈ پر اس کی نظر پڑی تو وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ عجیب خالی پن کا احساس اسے ہوا تھا۔ سلمان نے کمرے میں نظر دوڑائی۔ کمرے میں ہر چیز اپنی جگہ موجود تھی مگر بس اس کمرے کی سب سے خوب صورت چیز، اس کی مکین، زویا یہاں موجود نہیں تھی۔

سلمان جانتا تھا کہ وہ زویا کے ساتھ زیادتی کر جاتا ہے مگر وہ یہ بات زویا کے سامنے نہیں مان سکتا تھا۔ اس کی انا پر ضرب پڑتی تھی۔ سلمان گہری سانس لے کر آگے بڑھا اور بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظر سائیڈ میز پر رکھے فوٹو فریم پر پڑی۔ جہاں زویا دلہن اور وہ دولہا بن کر کھڑا تھا۔ دونوں کے چہرے پر ہلکی مسکراہٹ تھی۔ سلمان خاموشی سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے فریم کو الٹ کر رکھ دیا۔

زویا اس کے رویے سے تھک ہار کر، خفا ہو کر جا چکی تھی اور سلمان جانتے بوجھتے خود سے خفا ہو کر ہر رشتے کو خفا کرتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

سلمان ایکسیلیٹر (برقی سیڑھیوں) سے نیچے والے فلور پر آ رہا تھا۔ جب اس کی نظر سیڑھیوں کے اختتام پر کھڑی لیلیٰ پر پڑی۔ سلمان چونکا۔ لیلیٰ کی نظریں بھی اس پر مرکوز تھیں۔ سلمان پاس آ کر رک گیا۔ دونوں کچھ لمحے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

"کیا تمہارے پاس کچھ وقت ہے؟ بات کرنی ہے۔" لیلیٰ نے پر اعتماد انداز میں پوچھا۔

"کچھ؟ کبھی میرا سارا وقت تمہارا تھا لیلیٰ۔ خیر آؤ۔"

سلمان نے کہا تو لیلیٰ کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کے لیے اڑا تھا پھر وہ نارمل ہوتے ہوئے سلمان کے پیچھے چل پڑی۔ وہ دونوں اس وقت ایک مشہور مال میں تھے۔ فوڈ کارنر میں ایک کونے میں بیٹھ کر سلمان نے سوالیہ نظروں سے لیلیٰ کی طرف دیکھا۔

"شادی کے بعد بہت فریش ہو گئے ہو۔" لیلیٰ نے مسکرا کر اس کا جائزہ لیا۔

"ہاں۔ شادی راس آ گئی ہے۔" سلمان نے کہا تو لیلیٰ کے اندر آگ جل اٹھی۔

"اچھا۔ پھر اکیلے کیا کر رہے ہو؟" لیلیٰ نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا۔

"اکیلا کب ہوں؟ اس کا احساس میرے ساتھ ہے۔" سلمان نے اس کا داؤ اس پر الٹایا تھا۔ لیلیٰ تڑپ ہی اٹھی۔

"ویسے ایک مشہور ڈیزائنر کو میرے جیسے عام شخص سے کیا کام آن پڑا؟" سلمان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"دیکھو سلمان! جو ہونا تھا ہو گیا، میں اس پر بات کرنے نہیں آئی۔ میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ۔" لیلیٰ کہتے کہتے چپ کر گئی۔ سلمان چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔

"سلمان! کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم پھر سے ایک ہو جائیں۔ میرا مطلب ہے کہ تم مجھ سے شادی کر لو اور اپنی بیوی کو چھوڑ دو؟"

لیلیٰ نے جلدی سے کہا۔

"وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔" سلمان نے ایک اور خبر سنائی۔

"تو کیا ہوا؟ بچہ تم دونوں کے ساتھ رہ سکتا ہے۔ کچھ عرصہ تمہارے پاس، کچھ عرصہ تمہاری بیوی کے پاس۔" لیلیٰ نے خود غرضی سے کہا تو سلمان کو اس سے محبت کرنے پر افسوس ہوا تھا۔

Digitized by Google

اولاد کی محبت، دنیا کی ہر محبت سے زیادہ طاقت ور ہوتی ہے۔

سلمان کو آج پہلی بار اس بات کا اندازہ ہوا تھا۔

"پھر کیا تم مجھ سے شادی کرو گے؟" لیلیٰ نے بے صبری سے پوچھا۔

"کیوں؟" سلمان نے اطمینان سے پوچھا۔

"اس لیے کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔" لیلیٰ نے جلدی سے کہا۔

"محبت جسے تم راستے میں چھوڑ گئی تھیں۔" سلمان کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

"وہ غلطی ہو گئی۔ مگر یہ بھی دیکھو کہ میں نے آج تک تمہاری جگہ کسی کو نہیں دی ہے اور تم نے فوراً شادی کر لی۔" لیلیٰ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"تو یہ تمہاری بدقسمتی ہے لیلیٰ کہ تمہیں کوئی اچھا ہم سفر نہیں ملا ہے جبکہ میں اس معاملے میں خوش نصیب ہوں۔" سلمان نے کہا تو لیلیٰ حسد کی آگ میں جلنے لگی۔

"یہ بات نہیں ہے سلمان! میری راہ میں بھی بہت سے لوگ کھڑے ہیں مگر میں نے تمہاری محبت کو اپنے اندر زندہ رکھا ہے۔ یاد ہے تم نے مجھے بتایا تھا کہ صدیوں پہلے لوگ جسموں کو محفوظ کرنے کے لیے خاص قسم کا کیمیکل یا مسالا لگا کر حنوط کر لیتے تھے بالکل اسی طرح تم نے میری محبت کو اپنے اندر حنوط کر لیا ہے۔ میں مان ہی نہیں سکتی کہ اب تم مجھ سے محبت نہیں کرتے ہو۔" لیلیٰ نے ضدی لہجے میں کہا۔

سلمان جو اس لمحے ماضی کے سحر میں گرفتار ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ لیلیٰ کے سامنے اپنی شکست قبول کرتا۔ اس کا موبائل بجا۔ سلمان نے چونک کر فون کان سے لگایا۔ کچھ لمحے بعد بند کر دیا اور سامنے بیٹھی آج کی مشہور اور کامیاب عورت کی طرف دیکھا۔

"ہاں میں کہتا تھا لیلیٰ! اور میں آج بھی اپنی محبت پر قائم ہوں کیونکہ وہ محبت میرا سچ تھی کل بھی اور آج بھی۔ مگر۔" سلمان کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھا۔

"محبت کی صدیوں میں وہ لوگ ہی ہمیشہ زندہ رہتے ہیں جو خالص ہوں۔ تم جس دنیا میں داخل ہی نہیں ہوئیں، تم کیسے اس میں زندہ رہنے کا دعویٰ کر سکتی ہو لیلیٰ!" سلمان نے کہا تو لیلیٰ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ایک آخری مخلصانہ مشورہ دوں۔" سلمان نے گاڑی کی چابی میز سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تم خود سے محبت کا جھوٹ بولنا چھوڑ کر آج کے سچ کو دیکھو اور آگے بڑھ کر اسے اپنا لو۔ محبت کے سراب میں اپنی عمر اور جوانی ضائع کرنے کے بجائے، محبت کے سنگ زندگی گزارنا سیکھو۔ جیسے کہ میں زویا کی محبت میں جینا سیکھ رہا ہوں اور اب تو اللہ نے مجھے رحمت سے بھی نوازا ہے۔

یعنی کہ اب ہماری محبت میں خدا کی رحمت بھی شامل ہو گئی ہے۔"

سلمان خوشی سے سرشار لہجے میں کہتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ لیلیٰ نے آنکھوں سے آنسوؤں کو تیزی سے بہہ جانے دیا۔ اس لمحے لیلیٰ نے جانا تھا کہ محبت کی ہار سے زیادہ تکلیف دہ ہار، اپنی ذات کی ہار ہوتی ہے۔ واپسی کا سفر سب ہی کرتے ہیں مگر کوئی خوشی اور محبت کے احساس سے لبریز ہو کر جیسے کہ سلمان واپس لوٹ رہا تھا زویا کے پاس۔

اور کوئی دکھ اور پچھتاوے کے بوجھ تلے جیسے کہ لیلیٰ۔ ایسے لوگ جو یہ بھاری پتھر اپنے دل کے نہاں خانے کے کسی کونے میں رکھ کر بظاہر تو ساری زندگی خوش نظر آتے ہیں مگر اندر کہیں ایک بوجھ، ایک بھاری پن ہمیشہ محسوس ہوتا ہے۔

کہ محبت کی ساحرہ بھی حنوط کرتی ہے۔

کہیں اخلاص کے مسالے سے دل کی ابدی خوشی میں۔

اور کہیں پچھتاوے کے مسالے سے احساس کی ٹھنڈی قبر میں۔

اور اس کا انتخاب ہم خود کرتے ہیں۔ اپنے نصیب سے نہیں، بلکہ اپنی نیت سے۔

☆

Digitized by Google

نمرہ احمد

حالم

حالم کا بنگلہ اس ڈوبتی شام میں اپنے پورے قد کے ساتھ کھڑا تھا۔ اندر لاؤنج کے بڑے صوفے پہ بھاری بھرکم داتن بیٹھی تھی۔ اس کی گھورتی ہوئی نظریں سامنے والے صوفے پہ بیٹھے ایڈم پہ جمی تھیں۔ ٹی شرٹ اور جینز میں ملبوس' وہ سادہ سا نوجوان مسلسل گردن موڑ موڑ کے اطراف کا تنقیدی جائزہ لے رہا تھا۔

وہ دونوں تالیہ کے انتظار میں وہاں بیٹھے تھے۔ ایڈم دیکھ سکتا تھا کہ لاؤنج بہت خوبصورتی سے جدید طرز پہ آراستہ کیا گیا تھا۔ ایک طرف اوپن کچن تھا۔ اوپر جھلملاتے فانوس سجے تھے۔ دائیں طرف زینہ تھا جو اوپر جاتا تھا۔ وسط میں مخملیں صوفے چوکھٹے کی صورت رکھے تھے اور ان پہ وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ایڈم کی نظریں سائیڈ ٹیبل پہ رکھی ایک نمائشی ایش ٹرے پہ جا ٹکیں تو داتن نے ابرو بھینچ کے اسے دیکھا۔

''یہ تالیہ نے بہت محنت سے سنگاپور سے چرائی تھی۔ اس کو بری نظر سے نہ دیکھو۔''

ایڈم نے اثر لیے بغیر نظروں کا رخ دیوار کی طرف موڑا جہاں سنہرے فریم میں ایک پینٹنگ آویزاں تھی۔

بیسویں قسط





Digitized by Google

”یہ ہم نے ایک میوزیم کے کیوریٹر کی تحویل سے چرائی تھی۔ اصلی پینٹنگ کو نقلی سے بدل کے۔ وہ اصلی بیچنے جا رہا تھا۔ اس کو نہ ہی دیکھو تو اچھا ہے۔“

ایڈم نے محض ایک چبھتی ہوئی نظر داتن پہ ڈالی اور پھر گردن پوری پھیر لی۔ اب وہ کونے میں رکھے ایک گلدان کو دیکھنے لگا تھا۔

”اس کو چرانے کا سوچنا بھی مت۔ یہ ایک نیلامی کے اسٹور روم سے اٹھایا تھا ہم نے اور....“

”اس گھر میں کوئی ایسی چیز بھی ہے جو یہاں اپنی مرضی سے آئی ہو؟“ وہ جل کے بولا تو داتن نے سر سے پیر تک اسے دیکھا۔

”ہاں....تم!“

ایڈم نے سر جھٹکا جیسے بہت ضبط کیا ہو اور پھر میز پہ رکھے لیپ ٹاپ کی طرف اشارہ کیا۔ ”آپ مجھے وہ ویڈیو دکھا دیں جو وان فاتح نے پولیس اسٹیشن میں بنوائی تھی۔ چے تالیہ نے وہی دیکھنے کے لیے مجھے یہاں بلوایا ہے۔“

”مگر وہ خود ابھی تک نہیں آئی۔“ داتن مزے سے ڈھیٹ بنی بیٹھی رہی۔

”اور جب وہ آ کے یہ دیکھیں گی کہ آپ نے اتنی دیر مجھے مشکوک گردان کے فارغ بٹھائے رکھا تو ان کی نظروں میں برا کون بنے گا، ہوں؟“ معصومیت سے پلکیں جھپکائیں۔

داتن کے تاثرات بدلے۔ پہلے اس منحنی سے لڑکے پہ غصہ آیا مگر پھر خیال آیا کہ وہ درست کہہ رہا ہے۔ چپ چاپ اٹھ کے لیپ ٹاپ پہ ویڈیو لگانے لگی۔

”میں ملاکہ تین دن کے لیے آیا تھا مگر تین گھنٹے بھی نہ رک سکا۔“

وہ دونوں اب ساتھ ساتھ صوفے پہ بیٹھے تھے اور ایڈم لیپ ٹاپ پہ جھکے غور سے ویڈیو دیکھ رہا تھا جہاں اسکرین پہ فاتح اپنا بیان ریکارڈ کروا رہا تھا۔

”مگر وہ تو صرف ایک دن کے لیے ملاکہ آئے تھے۔ اور تین گھنٹے سے زیادہ رکے تھے۔“

اس کے یوں بڑبڑانے پہ داتن نے گھور کے اسے دیکھا۔

”میں ملاکہ سے واپس جا رہا تھا کہ میرا باڈی گارڈ میرے پاس آیا۔ یہ ریکارڈ ہو رہا ہے نا؟“ اسکرین پہ نظر آتا فاتح کمشنر سے پوچھ رہا تھا۔

”یہ ان کا باڈی گارڈ نہیں، باڈی مین تھا۔“ ایڈم نے خفگی سے کہا تو داتن نے زور سے پیر زمین پہ پٹخا۔ وہ چونکا۔

”تم چپ کر کے نہیں دیکھ سکتے؟ غلطی سے باڈی گارڈ بول دیا ہوگا۔“

ایڈم نے سر جھٹکا اور خاموشی سے ویڈیو دیکھنے لگا۔ سارا قصہ سنا کے فاتح کہہ رہا تھا۔ ”اس کے بعد سے میرا دماغ غنودگی کی سی کیفیت میں ہے۔ میرا باڈی مین....“ رکا اور جیسے تصحیح کی۔ ”باڈی گارڈ مجھے گھر لایا۔“

ایڈم تیزی سے سیدھا ہوا۔ ”نہیں۔ غلطی نہیں ہے یہ۔ وہ جان بوجھ کے غلط الفاظ بول رہے ہیں۔ یہ ویڈیو انہوں نے ہمارے لیے ریکارڈ کی ہے۔ اس میں کوئی پہیلی ہے۔ کوئی بات جو وہ ہمیں بتانا چاہتے ہیں۔“

اب کے داتن چونکی۔ ”واقعی۔ اس نے باڈی مین کہتے کہتے باڈی گارڈ کا لفظ بول دیا۔ یہ غلطی نہیں ہو سکتی۔“

ایڈم نے جلدی سے پینٹ سے چھوٹا سا نوٹ پیڈ نکالا اور قلم سے اس پہ الفاظ گھسیٹنے لگا۔ ویڈیو شروع سے لگا لی۔

”کیا لکھ رہے ہو؟“ اب کے داتن کے چہرے کے زاویے بھی سیدھے ہو گئے تھے۔

”ہر وہ لفظ جو وہ بول رہے ہیں۔ غلط الفاظ کا مطلب ہے وہ چاہتے ہیں ہم ان کے الفاظ پہ غور کریں۔“ ویڈیو ختم ہوئی تو اس نے کاغذ چہرے کے سامنے اٹھا کے غور سے دیکھا۔

Digitized by Google

"وان فاتح جھوٹ اور غیر ضروری الفاظ دونوں سے احتراز برتتے ہیں اور اس ویڈیو میں...." اس نے پیڈ گھٹنے پہ رکھا اور جگہ جگہ دائرے لگانے لگا۔ "یہ دو الفاظ انہوں نے بار بار دہرائے ہیں۔ "تین" اور "سوال"۔ میں تین دن کے لیے ملا کہ آیا'

تین گھنٹے سے زیادہ نہ رک سکا' وہ تین چور تھے' انہوں نے والٹ موبائل اور پیسے مانگے' وہ تین چیزیں جو چور مانگتے ہیں' یہ ویڈیو مجھے تین منٹ کے اندر اندر بھیج دو۔ ضروری نہیں کہ ہر سوال کا جواب ملے' مجھے تم سے بار بار سوال کرنا اچھا نہیں لگے گا۔" وہ جوش سے اس کے الفاظ دہرا رہا تھا۔

داتن نے گال تلے انگلی رکھے سوچتی نظروں سے اسے دیکھا۔ "تین...سوال...اور اس کا کیا مطلب ہوا؟"

ایڈم کا سارا جوش ایک دم جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ "یہ تو مجھے نہیں پتا۔"

"ہوں۔" داتن کے لبوں پہ طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ دل کو جیسے سکون پہنچا۔

دفعتاً دروازہ کھلا اور تالیہ اندر داخل ہوتی دکھائی دی۔ ہیٹ اور بیگ ہاتھ میں تھا اور چہرے کے زاویے بگڑے ہوئے تھے۔

"چے تالیہ' وان فاتح نے اس ویڈیو میں کوئی ہنٹ چھوڑا ہے اور...."

"یہ آدمی اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے' ہاں؟" اس نے آتے ساتھ ہی غصے سے ہیٹ پرے اچھالا۔ وہ دونوں ہکا بکا سے اسے دیکھنے لگے۔

"آرام سے تالیہ۔" داتن نے دونوں ہاتھ اٹھائے۔ "مانا کہ یہ لڑکا انتہائی نامعقول' منہ پھٹ اور ناقابل برداشت ہے' مگر تم آرام سے بھی اس کو گھر سے نکلنے کا کہہ سکتی ہو۔"

ایڈم نے جواباً کھا جانے والی نظروں سے داتن کو گھورا اور تالیہ نے جھنجھلا کے سیاہ پرس صوفے پہ پھینکا۔

"میں وان فاتح کی بات کر رہی ہوں۔ خود کو کوئی مہاراجہ سمجھتے ہیں وہ.....میں سارا دن ان کی خدمت کروں مگر انہیں میرے ہر کام پہ اعتراض ہوتا ہے۔"

بیگ پھینکنے سے ساری چیزیں الٹ کے زمین پہ جا گریں۔ وہ اب گلابی تمتماتے چہرے کے ساتھ

لاؤنج میں آگے پیچھے ٹہلتے ہوئے غصے سے بولے جا رہی تھی۔

"کافی میرے ہاتھ کی زہر لگتی ہے۔ ٹشو مجھ سے لینا پسند نہیں۔ شوگر لو ہو تو بھی میرا دیا بسکٹ نہیں کھائیں گے۔ اتنا غرور' اتنی حقارت۔ مسئلہ کیا ہے اس شخص کے ساتھ۔"

جب کوئی جواب نہ ملا تو وہ کراہ کے پلٹی اور غصے سے ایڈم کو دیکھا۔ "تم دو منٹ میری ہاں میں ہاں نہیں ملا سکتے؟"

مگر ایڈم اس کے پرس سے گری چیزوں کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ پرس چوری کا نہیں ہے' اچھا۔" داتن نے اسے گھور کے وضاحت دی۔

ایڈم نے جھک کے بسکٹ کا کھلا پیکٹ اٹھایا اور تالیہ کو دیکھا۔

"آپ نے انہیں یہ بسکٹ دیے؟"

"شوگر لو ہو تو اور کیا دیتے ہیں؟ اور یہ ان کے فیورٹ بسکٹ ہیں۔"

ایڈم نے دونوں ابرو بے یقینی سے اٹھائے۔

"چے تالیہ۔ فاتح صاحب کو مونگ پھلی سے شدید الرجی ہے۔ ان کا سانس بند ہو سکتا ہے مونگ پھلی سے' ایک دانہ ان کو آئی سی یو میں پہنچا سکتا ہے اور آپ نے ان کو مونگ پھلی والے بسکٹ دے دیے؟"

ایک دم سے جیسے کسی نے تالیہ پہ ٹھنڈا پانی انڈیل دیا ہو۔ وہ سن سی کھڑی رہ گئی۔

"اور یہ گیلے وائپ...." ایڈم اب زمین پہ جھکا

Digitized by Google

ایک ایک چیز الٹ پلٹ رہا تھا۔" وہ بھی موتیے کی خوشبو والے۔ ان کو یہ خوشبو ناپسند ہے اور وہ سوکھے ٹشو استعمال کرتے ہیں۔ کافی کون سی بنا رہی ہیں آپ؟"

"کیپی چینو کریم کے ساتھ۔" وہ ہکلائی۔

"وہ Loctose intalerant ہیں۔ دودھ سے بنی چیزیں نہیں پی سکتے اور آپ ان کو دودھ والی کافی دے رہی تھیں۔ اور یہ اخبار... یہ تو حکومتی پارٹی کا شائع کردہ ہے۔ ان کا حکومتی کالم نگاروں کی تحریریں پڑھ کے بی پی ہائی ہونے لگتا ہے۔"

مگر تالیہ مرادسن نہیں رہی تھی۔ ذہن میں فاتح کے الفاظ گونج رہے تھے۔

"آفس لائف میں تمہیں بہت سے ایسے لوگ ملیں گے جو اپنی خوش اخلاقی اور شہد ٹپکاتی باتوں سے خود کو تمہارا مخلص ترین دوست ثابت کرنے کی کوشش کریں گے لیکن یاد رکھنا۔ آفس لائف میں لوگوں کے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ ان کی میٹھی زبانوں سے نہیں ان کے عمل سے کرتے ہیں۔ ہمیشہ یہ دیکھتے ہیں کہ یہ شخص جتنی اچھی یا بری باتیں کر لے، کیا اس کے عمل سے مجھے کوئی فائدہ بھی ہو رہا ہے یا نہیں؟"

تو وہ جس کو اس کا تحقیر آمیز رویہ سمجھ رہی تھی، وہ دراصل اس کا ضبط تھا؟ وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ جان کے اسے غلط چیزیں دے رہی ہے پھر بھی اس نے اسے نوکری سے نہیں نکالا۔ بس اس کی چیزیں رد کر دیں تاکہ وہ خود اپنی تصیح کرے۔ اس لیے اس نے کہا کہ اس کی پسند ناپسند معلوم کرنا تالیہ کی جاب ہے؟ اور وہ کیا سوچتا ہو گا جب اس نے مونگ پھلی کے بسکٹ دیکھے ہوں گے؟ کہ وہ اسے مارنا چاہتی ہے؟

"تم جان بوجھ کے یہ کر رہی ہو؟" سارا غصہ ضبط کر کے بس اتنا کہا گویا اسے جھنجوڑا۔ وہ اسے نوکری سے نہیں نکالنا چاہتا تھا۔ وہ اسے کام کرنے کا موقع دے رہا تھا۔ یا اللہ... وہ اپنا کیا امپریشن دے رہی تھی۔

"عبداللہ... عبداللہ نے مجھے غلط گائیڈ کیا۔" اس کے ذہن میں جھکڑ چل رہے تھے۔

"عبداللہ کی جگہ آپ مجھ سے پوچھتیں تو... خیر... یہ دیکھیں..."

داتن نے چونک کے اسے دیکھا جو، اب جوش سے تالیہ کو کاغذ دکھانے لگا۔ تالیہ اس کے ساتھ آ بیٹھی اور بے دھیانی سے سننے لگی۔

"ہم نے اس ویڈیو سے ایک نتیجہ نکالا ہے کہ..."

(ہم نے؟) وہ اپنی ذہانت کو داتن اور اپنا مشترکہ کام بتا رہا تھا۔ داتن کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے۔

"تین سوال؟ کیا مطلب ہوا اس کا؟" تالیہ نے بے توجہی سے اسے دیکھا۔

ایڈم نے شانے اچکا دیے۔ "ہم کیسے جان پائیں گے۔"

"داتن... تھانے کے بعد وہ کہاں گئے تھے؟ یہ ویڈیو تو بارہ بجے کے بعد کی ہے جبکہ وہ چار پانچ بجے تک گھر سے باہر رہے ہیں۔ کیا ہم شہر کے دوسرے سی سی ٹی وی کیمروں سے ان کی نقل و حرکت معلوم کر سکتے ہیں؟"

"ہاں بالکل، میرے پاس جو الہ دین کا چراغ ہے وہ جھٹ سے ایسا کر دے گا۔" داتن مصنوعی ناراضی سے بولی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"یار داتن..." تالیہ کراہی۔ ایک تو پہلے عبداللہ اور اب یہ داتن...

"ایک دو دکانوں کے باہر لگے کیمروں کی فوٹیج تو میں نکلوا سکتی ہوں مگر ہر سڑک کے کیمرے کا ریکارڈ لینا ناممکن ہے۔ مچھلی بنائی ہے میں نے۔ اور سنو تم لڑکے... تم کھانا کھا کے جانا۔ پتا نہیں زندگی میں کبھی مچھلی تمہیں نصیب ہوئی بھی ہے یا نہیں۔" بڑبڑاتے ہوئے کہتی کچن کی طرف چلی گئی۔ ایڈم پیچھے سے

Digitized by Google

چمک کے بولا۔

''جب بھی نصیب ہوئی ہے' الحمدللہ حلال کی ہوئی ہے۔''

پھر مڑا تو دیکھا.... تالیہ سوچتے ہوئے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ ٹھوڑی ہتھیلی پہ گرا رکھی تھی۔

''وان فاتح نے اس رات کیا کیا تھا؟ وہ ہمیں کیا بتانا چاہ رہے ہیں جو ڈائریکٹ ای میل میں نہیں لکھ سکے؟ کیا اس جادو سے نکلنے کا کوئی طریقہ ہے؟'' وہ چونکی۔ ''کیا ان کی یادوں کے واپس آنے کا کوئی راستہ ہے۔''

''آپ کی یادداشت بھی تو ٹکڑوں کی صورت میں کچھ کچھ واپس آئی تھی۔''

''جب میں کے ایل آئی تھی اتنے سال بعد تو ائیر پورٹ پہ مجھے پہلی دفعہ خواب سا دکھائی دیا تھا۔ اس کے بعد وقفے وقفے سے کبھی کبھی کوئی بچپن کا وژن آتا تھا۔ کبھی ماضی کا۔ کبھی مستقبل کا۔''

''جب آپ کو پہلی دفعہ کوئی وژن نظر آیا تھا تو ایسا کیا تھا جو اس کا محرک بنا تھا؟''

''مجھے نہیں یاد' ایڈم۔'' اس نے مایوسی سے سر جھٹکا۔ ''اور ابھی میرے ذہن میں صرف عبداللہ گھوم رہا ہے۔ اس کی تو میں کل خبر لیتی ہوں۔''

''دایاں ہاتھ کٹوا دیجیے گا اس کا۔ اوہ سوری' یاد آیا۔ اب تو آپ کسی کا ہاتھ بھی نہیں کٹوا سکتیں۔'' مسکرا کے بولا اور اپنے کاغذ سمیٹنے لگا۔ تالیہ اتنی کبیدہ خاطر تھی کہ جواب میں کچھ بولی ہی نہیں۔

آفس کیبن قطار میں بنے تھے اور اس صبح وہ فون کی گھنٹیوں' ٹائپنگ کی آوازوں اور گفتگو کی بھنبھناہٹ سے گونج رہے تھے۔ ایسے میں عبداللہ اپنی شرٹ کا کالر درست کرتا کیبن کے درمیانی راستے سے گزرتا آگے بڑھ رہا تھا۔ راہ داری کے ایک طرف وان فاتح کا آفس تھا جس کے باہر تالیہ بیٹھی تھی اور سیکریٹری کی کرسی پہ عثمان براجمان لیپ ٹاپ پہ کام کرتا دکھائی دے رہا تھا۔

''سر اندر ہیں؟ انہوں نے بلوایا تھا۔'' عبداللہ خوش دلی سے کہتا قریب آیا تو عثمان نے چونک کے گردن اٹھائی۔

''سر نے بلوایا؟ کس وقت کے لیے؟'' اس نے اچنبھے سے کہتے اپنی ڈائری کھولی تو تالیہ مسکراتی ہوئی کھڑی ہوئی۔ پھولدار فراک پہ سر کے اوپر ترچھا سفید ہیٹ جما رکھا تھا۔

''بہت اچھا لگا تمہیں یہاں دیکھ کے عبداللہ!'' وہ بہت اپنائیت سے کہہ رہی تھی۔ ''دراصل میں نے بلوایا تھا تمہیں۔''

عبداللہ کی مسکراہٹ پھیکی پڑی۔ اس کا ماتھا ٹھنکا۔

''جے تالیہ.... میں....''

''شش!'' تالیہ نے مسکراتے ہوئے لبوں پہ انگلی رکھی اور چند قدم چل کے قریب آئی۔ اب اس کے عین سامنے کھڑے ہو کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''یہ تمہاری لکھائی میں لکھی جے ڈی ہے عبداللہ۔'' شفاف پلاسٹک بیگ میں مقید کاغذ لہرایا۔

''تم جانتے ہو میں نے اسے پلاسٹک بیگ میں کیوں بند کر رکھا ہے؟''

عبداللہ نے تھوک نگلا مگر بظاہر کندھے اچکائے۔ ''دیکھیں میں....''

''کیونکہ یہ Conspiracy to murder کا ثبوت ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے چبا چبا کے کہہ رہی تھی۔

''تم نے لکھا کہ وہ مونگ پھلی کے بسکٹ شوق سے کھاتے ہیں۔ تم ان کو میرے ہاتھوں قتل کروانا

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول
فصل غم کا گوشوارہ
رضیہ جمیل

Digitized by Google

چاہتے تھے کیا؟''

''چے تالیہ۔'' عثمان اٹھ کھڑا ہوا اور مصالحتی انداز میں مداخلت کی کوشش کی تو وہ تیزی سے اس کی طرف گھومی۔

''عثمان صاحب' آپ جانتے تھے کہ یہ مجھے غلط گائیڈ کر کے گیا ہے لیکن آپ نے ایک دفعہ بھی مجھے احساس نہیں دلایا۔ جیسے تب چپ رہے ویسے اب بھی چپ رہیں۔'' پھر شعلہ بار نظروں سے واپس عبداللہ کو دیکھا۔

''چے تالیہ... غلطی سے شاید....''

''اپنی وضاحت بچا کے رکھو۔ تم صرف مجھے ڈانٹ پڑوانا چاہتے تھے' میں جانتی ہوں تم ان کو قتل نہیں کرنا چاہتے اور یہی بات تم اندر جا کے انہیں بتاؤ گے۔''

''چے تالیہ۔ دیکھیں یہ....''

''اگر تم نہیں بتاؤ گے تو میں بتا دوں گی لیکن تمہیں زندگی گزارنے کا ایک گر بتاؤں عبداللہ؟ جس کو دھوکہ دیا جاتا ہے' اسے اپنے منہ سے سچ بتانا بہتر ہوتا ہے بجائے اس کے کہ اسے کسی تیسرے شخص سے پتہ چلے۔ جاؤ۔ وہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

پلاسٹک بیگ اس کی طرف بڑھایا تو عبداللہ نے لب بھینچ لیے اور بیگ تھاما۔ پھر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

عثمان کرسی پہ بیٹھ گیا لیکن بار بار افسوس سے بند دروازے کو دیکھتا تھا۔

''چے تالیہ! یہ آفس کے معاملات ہمیں آپس میں حل کرنے چاہئیں۔ ہر بات باس کو بتانا آپ کے لیے مشکلات کھڑی کر سکتا ہے۔''

''عثمان انچے! (صاحب)'' اس نے سینے پہ بازو لپیٹے اور مسکرا کے اسے دیکھا۔

''میری ایک بات آج آپ لکھ کے رکھ لیں۔ تالیہ مراد اگر سب کے ساتھ ایمان داری سے معاملات کر رہی ہے' تو اس کے ساتھ غلط بیانی کرنے والے کو سزا ملنی چاہیے۔''

عثمان نے خاموشی سے لیپ ٹاپ اپنے سامنے کر لیا اور ٹائپ کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد عبداللہ باہر آیا اور خاموشی سے تالیہ کو دیکھتے ہوئے کاغذ کے چار ٹکڑے کر کے ڈسٹ بن میں پھینکے۔

''آئی ایم سوری! چے تالیہ۔'' جیسے زبردستی یہ الفاظ ادا کیے۔ پھر ٹھہرا۔

''آپ باس کو پہلے ہی بتا چکی تھیں تو مجھے اعتراف کرنے کو کیوں کہا؟''

''یہ بتایا تھا کہ غلطی کی ہے۔ یہ نہیں بتایا تھا کہ کیا غلطی کی ہے۔ بہر حال' باس نے یقیناً تمہیں کہا ہو گا کہ مجھ سے معافی مانگو بعد میں تمہیں عثمان سے لیٹر بنوا دوں گی۔''

''میر اٹرمینیشن لیٹر' رائٹ!'' وہ کڑواہٹ سے بولا۔ چہرے پہ بے بسی بھرا غصہ تھا۔ تالیہ نے پرس سے ایک کاغذ نکالا اور عثمان کی میز پہ لا رکھا۔

''یہ عبداللہ کا اپائنٹمنٹ لیٹر ہے۔ ہم عبداللہ کو اکاؤنٹس میں ایک بہتر جاب دے رہے ہیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولی' عثمان کا منہ کھل گیا۔ عبداللہ نے بھی بے یقینی سے اسے مڑ کے دیکھا۔

''آپ مجھے جاب دلوا رہی ہیں؟ دوبارہ؟''

''ہاں' کیونکہ تم نے وان فاتح سے سچ بولا ہے۔ اور تمہاری اس سے بڑی سزا کیا ہو گی کہ تم روز ایک ہی آفس میں ان کا سامنا کرو گے اور روز اپنی حرکت پہ شرمندہ ہو گے۔'' رکھائی سے کہہ کے عبداللہ کو گھورا۔ عبداللہ دل سے شرمندہ نہ تھا' اسے بے بسی بھرا غصہ تھا' مگر اس بات نے اس پہ گویا گھڑوں پانی ڈال دیا۔ چپ چاپ عثمان کے قریب چلا آیا۔

(اگر اپنی لکھائی میں نہ لکھتا تو یہ کبھی میرے خلاف اسے نہ استعمال کر سکتی۔)

تالیہ کافی بنا کے واپس آئی تو عبداللہ جا چکا تھا اور عثمان اسی طرح بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کے کھنکھارا۔

''مجھے خوشی ہے اس کی جاب نہیں گئی' چے تالیہ! جاب کا چھوٹ جانا انسان کے ساتھ کیا کر دیتا ہے' آپ نہیں جانتیں۔'' عثمان نے تنبیہہ کی مگر اس نے محض سر جھٹک دیا۔

''اعمال کے نتائج ہوتے ہیں جو بھگتنے پڑتے ہیں۔''

Digitized by Google

فاتح عینک لگائے ایک فائل کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کے نظریں اٹھائیں۔

"تو اس نے تمہیں غلط ڈی جے دی تھی؟ معافی مانگی اس نے تم سے؟" انداز دوستانہ تھا۔

صبح اس کی ساری بات سن کے اس نے بس یہی کہا تھا کہ وہ تم سے معافی مانگ لے تو ہم اسے دوبارہ اسی آفس میں اکوموڈیٹ کر دیں گے۔

"جی سر، مانگ لی۔ پوچھ سکتی ہوں کہ آپ نے اسے جاب سے کیوں نہیں نکالا؟" اس نے کافی کا مگ اس کے سامنے میز پہ رکھا اور اچنبھے سے بولی۔

"آپ تو سچ جھوٹ کے معاملے میں بہت سخت ہیں۔ پھر کیوں اسے رکھ لیا؟"

"کیونکہ مجھے الیکشن لڑنا ہے' تاشہ۔ میں اپنے ساتھ سولہ گھنٹے گزارنے والے لڑکے کو اس موقع پہ اپنا دشمن نہیں بنا سکتا۔ اور یہ تم لوگوں کی ایک دوسرے کے خلاف آفس پالیٹکس تو چلتی رہے گی۔" وہاں سکون ہی سکون تھا۔

"رائٹ سر۔ یہ رہی آپ کی کافی' جو آپ کو واقعی پسند ہے۔" پھر اس نے ایک گم کا پیکٹ میز پہ رکھا۔ "یہ رہی کرنچی گمز کیونکہ آپ کام کرتے ہوئے سوگی گمز نہیں چباتے۔ اور ہاں.... آپ کے کوٹ سے آپ کی فلیگ پن گر گئی تھی تو میں یہ نئی لے آئی ہوں۔ دو ایکسٹرا فلیگ پنز میرے بیگ میں بھی ہیں۔" مہارت سے بتاتے ہوئے وہ اسٹینڈ تک آئی اور ایک ننھی جھنڈے والی پن اس کے کوٹ پہ لگائی۔

فاتح نے مسکرا کے اسے دیکھا۔

"اور اب تمہیں ایک دم سے میری پسند ناپسند کا علم ہو گیا؟"

"وہ کیا ہے سر کہ یہ میری جاب ہے۔" تالیہ مراد اس کی طرف گھومی اور مسکرا کے بولی۔

"میں نے عبداللہ پہ بھروسہ کر کے سستی دکھائی تھی لیکن اب میں نے آپ پہ ریسرچ کی ہے اور آپ کے نئے پرانے سب انٹرویوز دیکھ اور پڑھ ڈالے۔ امید ہے اب میں آپ کی ہر چیز کا خیال رکھ

ماہنامہ کرن

دسمبر 2018ء کا شمارہ شائع ہو گیا



مختلف موضوعات کے ساتھ

- اداکارہ "کومل رضوی" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکارہ "میرا سیٹھی" کہتی ہیں "میری بھی سنیے"،
- آواز کی دنیا سے "فرح مغل" اس ماہ مہمان ہیں،
- اس ماہ "شائستہ یاسین" کے مقابل ہے آئینہ،
- "شب نم کی مہر" رخ چوہدری کا سلسلے وار ناول،
- "ہوائیں رخ بدل گئیں" نگہت عبداللہ کا سلسلے وار ناول،
- "ساگر کنارے" ام طیفور کا مکمل ناول،
- "عشق ہو" نادیہ احمد کا مکمل ناول،
- "شام رنگ سیاہ" ایمل رضا کا ناولٹ،
- "محبت شب کا سیاہ چاند" کنیز زہرہ کا ناولٹ،
- حمیرا نوشین، مزمل سلیم، حمیرا فضا، اور عائشہ تنویر کے افسانے اور مستقل سلسلے،

Digitized by Google

سکوں گی۔ ویسے آپ کا وہ بٹوہ کہاں گیا جس میں آپ پاپ کارن کے دانے رکھتے تھے؟"
ایک دم گرم کڑوے گھونٹ نے فاتح کی زبان جلا ڈالی۔ اس نے تیزی سے مگ نیچے کیا۔ مسکراہٹ غائب ہوئی اور پیشانی پہ سلوٹیں پڑیں۔
"کون سا بٹوہ؟ یہ کس نے کہا تمہیں؟"
"آپ نے۔ آپ نے ہی تو کہا تھا کہ آپ کی پسند ناپسند کا پتا چلانا میری جاب ہے اور میں اپنی جاب آخری حد تک کرنا جانتی ہوں سر۔ انٹرویو والے روز میں نے آپ سے کہا تھا نا' تالیہ مراد کو سب کرنا آتا ہے۔ امید ہے الیکشن تک آپ مجھے بھی فائر کرنے کا نہیں سوچیں گے۔ وہ بٹوہ آپ کے پاس ہوتا تھا ہمیشہ۔ اب نہیں ہے۔ اسے ڈھونڈ لیجیے گا۔" جتاتی مسکراہٹ سے کہتی وہ مڑی اور باہر نکل گئی۔

وان فاتح کچھ دیر لب بھینچے بیٹھا رہا۔ پھر موبائل اٹھایا اور تیزی سے انگلیوں کو کی پیڈ پہ حرکت دی۔
"حالم.... کچھ علم ہوا کہ اس رات میرے ساتھ کیا ہوا تھا؟" ایک یہی معمہ تھا جو حل نہیں ہو رہا تھا۔
وہ باہر کرسی پہ بیٹھی اس کا پیغام پڑھ رہی تھی۔ پھر جواب لکھنا شروع کیا۔
"میں کوشش کر رہا ہوں' فاتح صاحب۔ امید ہے آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔"
پھر اس نے ہینڈز فری کانوں میں لگائے اور وہیں بیٹھے بیٹھے وہ ویڈیو دوبارہ دیکھنے لگی۔ رات تو عبداللہ کی وجہ سے ذہن بٹا ہوا تھا۔ اب پوری توجہ سے اس کا ایک ایک لفظ سننے لگی۔ تین.... سوال.... وہ ان الفاظ کو بار بار دہرا رہا تھا۔ آخر کیا مطلب تھا ان کا؟ وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

☆☆☆

وہ ایک شور سے بھرپور آفس تھا۔ لوگ ہر کونے سے گویا نکل نکل کے آ جا رہے تھے۔ فون کی گھنٹیاں کانوں میں صور پھونک رہی تھیں۔ ہر کوئی بول رہا تھا' چل رہا تھا۔ ایسے میں ایڈم بن محمد ایک فولڈر تھامے دھڑکتے دل کے ساتھ راہ داری میں آگے بڑھ رہا تھا۔ ایک دروازے کے سامنے وہ رکا اور ٹائی درست کی۔ تالیہ کی ہدایت کے مطابق اس نے سوٹ پہنا تھا جس میں وہ شدید غیر آرام دہ تھا۔ دروازے کو کھٹکھٹایا اور اندر جھانکا۔
اندر ایک ادھیڑ عمر صاحب فائلوں میں الجھے ہوئے تھے۔ وہ ایک ٹیبلوئڈ کا دفتر تھا۔ یہ دلچسپ اور سنسنی خیز قسم کے میگزین ہوتے ہیں جو عام خبروں سے زیادہ چٹ پٹے اسکینڈلز کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس آفس میں بھی جا بجا ایسے ہی پوسٹرز لگے تھے۔ اسے دیکھ کے ان صاحب نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔
"آجاؤ' آجاؤ۔" پھر سر کھجایا۔ الجھے انداز میں فائلز آگے پیچھے کیں۔ وہ شدید مصروف نظر آ رہے تھے۔
"میں حالم کے ریفرنس سے آیا ہوں۔" وہ سامنے بیٹھا اور کھنکھارتے ہوئے فولڈر میز پہ رکھا۔ "اس میں حالم کی طرف سے ایک سفارشی لیٹر بھی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ آپ کو ایک رپورٹر کی ضرورت ہے۔ جو حقیقی واقعات کو دلچسپ کہانی کی صورت لکھ سکے۔"
"دیکھو میاں! ضرورت تو ہمیں کسی کی نہیں ہے' لیکن حالم کے احسان بہت ہیں مجھ پہ تو میں تمہیں نوکری دے دیتا ہوں۔" انہوں نے فولڈر اپنے قریب کھسکایا مگر اسے کھولا نہیں۔ بس سادے انداز میں بتانے لگا۔ ایڈم کے کندھے ڈھلک گئے۔ لیکن پھر دوبارہ اپنے جوش کو جگاتے ہوئے بولا۔
"اگر آپ مشہور ایکٹریس ڈیزی مل کے اسکینڈل پہ لکھی میری تحریر پڑھ لیں تو میں شکر گزار ہوں گا۔ اور...."
"سمجھو میں نے پڑھ لیں۔ اور تمہیں بطور فری لانس رپورٹر رکھ رہا ہوں۔ تنخواہ مل جایا کرے گی اور آفس آؤ نہ آؤ تمہاری مرضی ہے۔ چاہے سارے شہر کی خاک چھانتے رہو' مگر ہفتے میں ایک دن آ کے تمہیں کوئی سنسنی خیز اسٹوری جمع کرانی ہو گی۔ ہمارا ٹیبلوئڈ

Digitized by Google

پرنٹ سے زیادہ آن لائن چلتا ہے۔
دیکھو میاں یہ کتابوں کا دور تو رہا نہیں۔ یہ اسکرین کا دور ہے' اس لیے تصویریں' ویڈیوز' آرٹیکلز' جو بھی ہوئے لے آیا کرو۔ اب اگر تمہاری طبیعت پہ گراں نہ گزرے تو باہر تشریف لے جاؤ کیونکہ میں اس اداکارہ کے ایک دم اسکارف اوڑھ لینے کو کوئی سازشی رخ دے کر کہانی بنانا چاہ رہا ہوں۔" ایک تصویر لہرا کے دکھائی۔ وہاں تو نہ لحاظ تھا' نہ مروت۔ کھڑوس ایڈیٹر نے ایک ہی سانس میں اس کے سفارشی اور اپنے جھوٹے ہونے کی تصدیق کی اور جانے کا اشارہ کیا۔
"پڑھ ضرور لیجیے گا' سر۔" وہ گہری سانس لے کر بولا اور پھر تھکے تھکے انداز میں باہر نکل گیا۔
(کتابوں کا دور نہیں رہا۔) یہ الفاظ میگزین کے دفتر سے گھر تک اس کا پیچھا کرتے آئے تھے۔ گھر کے قریب چھوٹی سی مارکیٹ میں وہ کتابوں کی دکان کے سامنے رک گیا۔ بدقت قدم اٹھائے اور قریب آیا۔
"بنگارا یا ملایو ہے؟" تھوک نگل کے استفسار کیا۔ وہ کورس کی کتاب تھی اور ہر جگہ مل جاتی تھی۔ دکان دار نے جھٹ اسے تھما دی۔ ایڈم نے دونوں ہاتھوں میں اسے تھاما اور اوپر چہرے کے سامنے لے آیا۔ دھوپ میں اس کا سرورق چمک رہا تھا۔ ملایا کا پھول از آدم بن محمد۔
ایک اداس مسکراہٹ اس کے لبوں پہ بکھر گئی۔ پھر اس نے نفی میں سر ہلایا اور کتاب واپس کر دی۔ دکاندار حیران ہوا۔
"نہیں چاہیے؟"
(ایسی کتابیں پڑھ کے ماضی کی خوفناک قید یاد آنے لگے گی اور اس سب کو یاد کرنے کے لیے بہت حوصلہ چاہیے۔) دل میں سوچا مگر کہا صرف اتنا۔
"ابھی نہیں۔ کچھ وقت گزر جائے تو شاید اسے خرید لوں یا جیسے بچپن میں چوائس میں چھوڑ دیا تھا' اب بھی چھوڑ دوں۔ اس کو پڑھنا یا نہ پڑھنا میری اپنی چوائس ہے۔"
دکان دار نے کتاب رکھ لی اور ایک اچٹتی نظر اس نوجوان پہ ڈالی جواب قدم اٹھاتا دور جا رہا تھا۔ دنیا عجیب وغریب نمونوں سے بھری پڑی ہے۔ دکان دار نے سوچا اور سر جھٹک کے دوبارہ کام کرنے لگا۔

☆☆☆

وہ گھر میں داخل ہوا تو چھوٹے باغیچے میں ٹھنڈی چھایا اتری تھی۔ مرغی اپنے پنجرے میں پر سکون بیٹھی چوزوں کو پروں میں دبائے ہوئے تھی۔ دیوار پہ رکھی باجرے کی پلیٹ سے پرندے دانے چگ رہے تھے۔ اس نے اندر آ کر گیٹ بند کیا تو پرندے جھپاک سے اڑ گئے۔ وہ سیدھا ہوا تو دیکھا' برآمدے میں ماں کھڑی سوگوار گیلی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
"ماں؟ کچھ ہوا ہے کیا؟" اس کا ہاتھ دھیرے سے پہلو میں آ گرا۔ نظریں ماں پہ جم گئیں۔
"ایڈم۔ فاطمہ کے والد نے شادی سے انکار کر دیا ہے۔ منگنی کا سامان بھی واپس بھیج رہا ہے۔" ایبو نے پلکیں جھپکائیں تو آنسو ٹوٹ کے گرتے گئے۔ ایڈم نے دیکھا' پہلے بائیں آنکھ سے آنسو گرا تھا۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ جب انسان دکھ سے روتا ہے تو آنسو بائیں آنکھ سے پہلے گرتا ہے۔ جب خوشی سے روتا ہے تو دائیں سے۔ اس کی نظر اس آنسو کے ساتھ نیچے لڑھکتی گئی۔
"میں نے ان کو بہت سمجھایا مگر وہ نہیں مانے۔ تمہاری نوکری کو اتنا بڑا مسئلہ بنا دیا۔"
"مجھے....." اس کے الفاظ ٹوٹے۔ "نوکری مل گئی ہے' ایبو۔"
آنسو پہ ٹکی نظر ایبو کی ٹھوڑی کے ساتھ نیچے جھکی۔ "تنخواہ بھی اچھی ہے۔ اور نوکری بھی۔"
"وہ اپنا ذہن بنا چکے ہیں۔ اب نہیں بدلیں گے۔"
"کوئی بات نہیں' ایبو۔" آنسو گریبان میں جذب ہو گیا تو ایڈم کا سکتہ ٹوٹا۔ بس گہری سانس لی

Digitized by Google

اور آگے آیا۔ ”میں افسردہ نہیں ہوں۔“

”ایڈم‘ تم میرا دل رکھنے کے لیے کہہ رہے ہو‘ مجھے معلوم ہے۔“ ایبو نے بے آواز روتے ہوئے اس کا بازو تھاما تو اس نے نرمی سے نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں‘ ماں۔ میں نے ایک بات جان لی ہے کہ کچھ لوگ ہماری زندگی میں صرف تھوڑے وقت کے لیے آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو لاتا ہے اور پھر نکال کے لے جاتا ہے۔ تکلیف ہوتی ہے مگر دنیا کا کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس نے کسی کو کھویا نہ ہو۔ سب کسی نہ کسی کو کھوتے ہیں۔

ماں۔ کوئی بے وفائی کے ہاتھوں‘ کوئی موت کے باعث اور کوئی ذرا سی غلط فہمی کی وجہ سے۔“

”مگر تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔ بے قصور ہوتے ہوئے کوئی ہمیں چھوڑ دے.... یہ تو ناانصافی ہوتی ہے۔“

”کہا نا‘ لوگ ہمیں کچھ سکھانے کے لیے آتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ان کو اس لیے ہم سے دور کر دیتا ہے تاکہ ہم اپنے آپ سے قریب ہو سکیں۔ میں اپنے اصل سے متعارف ہو چکا ہوں‘ ماں۔ مجھے زندگی کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی ہے۔ میں نے فاطمہ کے لیے لکھنا نہیں چھوڑا۔ کسی عام سی زندگی اور نوکری پہ راضی نہیں ہوا۔ مجھے عام زندگی نہیں چاہیے۔ ”ماضی“ نے مجھے یہ سکھایا ہے کہ اگر ایڈم بن محمد کے تایا اس کے بارے میں بڑے خواب دیکھ سکتے تھے‘ تو ایڈم ان کو پورا بھی کر سکتا ہے۔“

”ایڈم ......تم کچھ دن ہر چیز سے دور ہو کے چھٹیاں گزارنے کہیں دور چلے جاؤ۔ اپنے ذہن کو سکون دو اور....“ ایبو پریشانی سے اس کا اتنا پرسکون انداز دیکھ رہی تھی۔

”اس شور ہنگاموں سے بھرپور دنیا سے دور بہت چھٹیاں گزار لیں ایڈم نے‘ ماں۔ اب اس دنیا میں واپس آنے کا وقت ہے۔ اب اس دنیا کے راز کھوجنے کا وقت ہے۔ میں ملاکہ جا رہا ہوں۔ وہاں کچھ ہے جو میرا منتظر ہے۔“

نرمی سے کہہ کے وہ اندر کی طرف بڑھ گیا۔ ایبو اسے بھیگی آنکھوں سے جاتے دیکھتی رہی۔ وہ ٹوٹے دل کے ساتھ نوکری کیسے کرے گا؟ وہ پریشان تھی۔ مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا دل قدیم ملاکہ میں کب کا ٹوٹ چکا تھا۔ اب تو دل کو دوبارہ سے جوڑنے کا وقت تھا۔

☆☆☆

رات بھر بارش برستی رہی تو صبح تک کے ایل کی سڑکیں خوب گیلی اور موسم خوب ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ سڑک پہ گاڑیاں معمول کی رفتار سے گزر رہی تھیں اور فٹ پاتھ پہ وان فاتح تیز تیز دوڑتا جا رہا تھا۔

ایک دم ایک سائیکل عین اس کے سامنے آرکی۔ وہ تیزی سے رکا اور پیچھے ہٹا۔ اگر بروقت نہ رکتا تو سائیکل والے سے ٹکرا جاتا۔ کانوں سے ہینڈز فری نکالتے وہ خفگی سے اس لڑکے کو ٹوکنے والا تھا کہ اس نے ایک پیکٹ فاتح کی طرف بڑھایا۔

”حالم کی طرف سے۔“ سائیکل والے میسنجر نے پیغام دیا‘ پیکٹ تھمایا اور زن سے سائیکل موڑ کے آگے لے گیا۔

فاتح نے لی اور پیکٹ لیے ایک بنچ پہ آبیٹھا۔ جاگنگ کے باعث تنفس تیز تھا اور بال بھیگ چکے تھے۔ اس نے پیکٹ کھولا تو اندر چند تصاویر تھیں۔ وہ باری باری ان کو دیکھے گیا۔ پھر فون نکالا اور کال ملائی۔

”ایک کام تو کر دیا میں نے آپ کا۔“ حالم کی مطمئن آواز سنائی دی تھی۔

”فائل چرانے والی تالیہ نہیں تھی۔ اس کا ثبوت بھیج دیا ہے۔“

”ہاں دیکھ رہا ہوں۔ یہ سی سی ٹی وی کی تصاویر ہیں۔“ وہ تصویروں کو الٹ پلٹ کر کے دیکھ رہا تھا۔ ”ان میں وہ اشعر کی پارٹی سے نکل کے کیب میں بیٹھتی دکھائی دے رہی ہے۔ اور پھر وہ کیب میں اپنے گھر کے سامنے اتر رہی ہے۔ اور یہ....“ اس نے آخری تصویر کو سیدھا کیا۔

Digitized by Google

"یہ ایڈم ہے، میرا باڈی مین .... یہ اس رات تاشہ کی گاڑی میرے پورچ سے لے جا رہا ہے۔"

"جی۔ میں غلط تھا۔ اس رات تالیہ مراد آپ کے گھر نہیں آئی تھی۔ وہ تو کیب میں گھر گئی تھی۔"

"یعنی فائل تالیہ نے نہیں چرائی۔" اس نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔

"میں خوامخواہ اس کو الزام دیتا رہا۔" دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔

"تو کیا ایڈم نے؟"

"ہرگز نہیں۔" حالم نے تیزی سے کہا۔ "وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ کار لے کر چلا گیا تھا۔ یقیناً اشعر نے کسی چور کو ہائر کیا ہوگا۔"

"حالم۔ تمہیں کیا میں بے وقوف لگتا ہوں؟" اس نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے تصاویر پیکٹ میں ڈالیں۔

"اگر تمہیں میرے گھر کی سی سی ٹی وی فوٹیج مل گئی ہے جس میں ایڈم آتا اور جاتا دکھائی دے رہا ہے تو تمہیں اس رات کی پوری فوٹیج بھی مل گئی ہو گی جس میں وہ چور داخل ہوتا دکھائی دیا ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ تم مجھے اس کے بارے میں کیوں نہیں بتا رہے؟"

"سر! اشعر نے فائل چرائی تھی۔ چاہے جیسے بھی چرائی ہو۔ میں نے آپ کو فائل واپس لا دی ہے۔ آپ ان بے کار باتوں میں کیوں الجھتے ہیں۔"

"کیا وہ کوئی میرا قریبی شخص ہے جسے تم بچا رہے ہو؟ کوئی خاص ملازم؟ میرا اسیکرٹری عثمان؟ مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ کون میرا دشمن ہے اور دوست۔"

"فاتح صاحب ان سوالوں کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیے جن کے جواب اگر معلوم ہو جائیں تو ہمیں برے لگیں۔ اگر کسی قریبی شخص سے غلطی ہو بھی گئی ہے تو میں سیکنڈ چانس پہ یقین رکھنے والا انسان ہوں۔ خدا حافظ۔" اور فون بند ہو گیا۔

وہ جاگنگ کے بعد اپنے گھر میں داخل ہوا تو اس کی کار کے ساتھ تالیہ کھڑی تھی۔ گارڈ فاصلے پہ مستعد کھڑے تھے۔ اسے دیکھتے ہی وہ سیدھی ہوئی اور جوس کی بوتل اس کی طرف بڑھائی۔

"السلام علیکم سر۔" فاتح نے سلام کا جواب دیا اور ایک گہری نظر اس پہ ڈالتے ہوئے بوتل تھام لی (تو یہ لڑکی چور نہیں تھی!)۔ پھر ڈھکن کھولتے ہوئے سوچ کے بولا۔

"تمہاری پینٹنگ بن گئی جو ملاکہ والے گھر میں بنانی تھی؟" انداز نرم تھا۔

"بس سمجھیں کام ہو ہی گیا ہے۔"

"تم اب بھی وہ گھر خریدنا چاہتی ہو؟" سرسری سا پوچھتے ہوئے بوتل لبوں سے لگائی۔ تالیہ سادگی سے مسکرائی۔

"نہیں سر.... میں چابی کچھ روز میں آپ کے حوالے کر دوں گی۔"

وان فاتح کے اندر افسوس سا ابھرا۔ مگر بولا کچھ نہیں۔ خاموشی سے گھونٹ بھرتا رہا۔ وہ منتظر سی اس کا بوتل والا ہاتھ دیکھتی رہی۔ کیونکہ بوتل اس نے تالیہ کو ہی پکڑائی تھی۔ ہاتھ کا زخم اب مندمل ہو چکا تھا۔ نظریں انگلیوں سے کلائیوں تک پھسلیں تو ایک دم وہ منجمد ہو گئی۔ پھر احساس ہوا کہ وہ بوتل بڑھائے ہوئے ہے۔ گڑبڑا کے جلدی سے اسے تھاما۔ وہ ناخوش لگتا تھا۔

"آپ کا پسندیدہ جوس تھا یہ سر۔"

"یہ بات نہیں ہے۔ میرے ٹیسٹ بڈز آج کل کسی شے کو پسند نہیں کر رہے۔" وہ سر جھٹک کے بولا پھر اسے یک ٹک خود کو دیکھتے پا کے پوچھا۔ "کیا؟"

"آپ کی گھڑی دیکھ رہی تھی۔" وہ سنبھلی۔ "آپ یہ اپنے ساتھ آفس نہیں پہن کے آتے ہے نا۔"

"یہ فٹنس واچ ہے لڑکی۔ صرف ورک آؤٹ کے وقت پہنتا ہوں۔" وہ سر جھٹک کے آگے بڑھ گیا۔

تالیہ کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

Digitized by Google

''اس رات وان فاتح کہاں گئے تھے' یہ جاننا کچھ مشکل نہیں ہے' داتن۔'' وہ کار سے ٹیک لگائے مسکرا کے میسیج لکھ رہی تھی۔

''اس رات کی ویڈیو میں گھر سے نکلتے فاتح نے فٹنس واچ پہن رکھی تھی۔ وہ جاگنگ کے علاوہ اسے کبھی نہیں پہنتے۔ وہ گھڑی ایک ''گلیو'' تھا۔ فٹنس واچ میں جی پی ایس ہوتا ہے۔ ہمیں اس گھڑی کا ڈیٹا چاہیے۔ اس رات وہ کس سڑک' کس جگہ سے گزرے ہیں' اور وہاں کتنی دیر رہے ہیں' سارا نقشہ سامنے آجائے گا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں ان کے قدموں کے نشانات کا پیچھا کروں۔ اس لیے انہوں نے جان بوجھ کے وہ واچ پہنی تھی۔'' اس کی مسکراہٹ گہری ہو رہی تھی۔

وہ اندر آیا تو عصرہ ڈائننگ ٹیبل پہ موجود ناشتہ کر رہی تھی۔ بس ایک نگاہ غلط اس پہ ڈالی اور توس پہ جام لگانے لگی۔

''تم کاغذات نامزدگی واپس لے رہے ہو یا نہیں' فاتح؟'' عجیب انداز تھا اس کا۔

''تم نے اس رات تاشہ کو ہمارے گھر سے کار لے جاتے خود دیکھا تھا؟'' وہ تولیے سے گردن پونچھتا سامنے آیا اور سنجیدگی سے پوچھا۔ عصرہ نے اس غیر متوقع سوال پہ چونک کے اسے دیکھا۔ پھر کندھے اچکائے۔

''ہاں اس نے کہا تھا کہ وہ کار لینے جا رہی ہے اور ملازموں نے بھی یہی بتایا تھا کہ وہ خود آئی ہے۔ کیوں؟''

''ملازموں کو بلواؤ۔ میں دوبارہ پوچھنا چاہتا ہوں۔''

عصرہ نے زور سے چھری پلیٹ میں رکھی اور چہرہ اٹھا کے ناگواری سے اسے دیکھا۔ ''تمہیں میری بات کا یقین نہیں ہے کیا؟''

وہ تولیے کو گردن اور بازوؤں پہ ملتے ہوئے غور سے اسے دیکھنے لگا۔ ''اتنا غصہ کیوں عصرہ؟''

عصرہ نے بے بسی سے نیپکن پرے پھینکا۔

''مجھے نہیں معلوم اس نے فائل چرائی تھی یا نہیں' لیکن کیا ہم اس ٹاپک کو بند کر سکتے ہیں؟ جب سے یہ لڑکی ہماری زندگی میں آئی ہے' ہر چیز خراب ہونے لگی ہے۔'' وہ غصے سے کہہ رہی تھی۔ ''کیا اب ہم اس کی وجہ سے صبح صبح لڑیں گے؟''

''اس کو ہماری زندگی میں کون لایا ہے؟ میں یا تم؟'' فاتح نے سوالیہ انداز میں کندھے اچکائے۔ ''تم نے کہا اس کو ڈنر پہ بلاؤ۔ اسے اچھا ٹریٹ کرو۔ وہ گھائل غزال خریدے گی۔ تم نے کہا اسے ملاکہ والا گھر دے دو۔''

''یہ تو نہیں کہا تھا کہ اسے چوبیس گھنٹے سر پہ سوار کر لو۔'' وہ نہ جانے کس بات پہ اتنی غصہ تھی۔ ''یہ صبح صبح یہاں کیوں آجاتی ہے؟''

''کیونکہ تمہارے بھائی نے کہا تھا کہ اسے جاب دو۔ وہ باہر کھڑی اپنا کام کر رہی ہے۔ تم اتنی اَپ سیٹ کیوں ہو رہی ہو؟'' وہ واقعی حیران ہو رہا تھا۔

''ایک پیسہ آج تک اس نے نہیں دیا میری نیلامی میں' نہ گھر کے کرایے کی مد میں۔ صرف پینٹنگ دی جو پتہ نہیں اصلی تھی یا نقلی۔ مگر جب سے یہ آئی ہے تم گھر آنا بھول گئے ہو۔''

''عصرہ ہماری الیکشن کمپین شروع ہو رہی ہے' تمہیں معلوم ہے میں مصروف.....''

''اسی لیے تو کہتی ہوں کہ مت قدم رکھو اس دلدل میں۔ ایک آریانہ کو کھونا کم تھا کیا۔ میرے دوسرے بچے بھی دشمنوں کے نشانے پہ آجائیں گے۔''

''ہم تاشہ اور اس فائل کی بات کر رہے تھے۔ یہ آریانہ درمیان میں کہاں سے آگئی۔''

وہ جو بات کو گھما پھرا کے دور لے گئی تھی' اپنی چوری پکڑے جانے پہ غصے سے کرسی دھکیلتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آریانہ درمیان سے چلی گئی ہے' یہی تو سارا غم ہے' فاتح۔ بہرحال اس لڑکی کو میں تمہارے ساتھ

کام کرتے نہیں دیکھنا چاہتی ۔ اسے فارغ کرو' پلیز۔"
"وہ اچھا کام کر رہی ہے' میں اسے کیوں فارغ کروں؟"
"کل تک تم اسے برداشت نہیں کر سکتے تھے اور اب؟"
"اب مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ اس نے فائل نہیں چرائی تھی ۔ بس!" وہ اطمینان سے کہتا اندر کی طرف بڑھ گیا ۔ عصرہ دھک سے رہ گئی ۔ جرم سے زیادہ جرم کا کور اپ اس کے لیے ٹک ٹک کرتا بم بن چکا تھا ۔ اب وہ کیا کرے؟

☆☆☆

اشعر نے بھی شام کو منعقد ہونے والی اس پارٹی میں جانا تھا جہاں اس وقت تالیہ' وان فاتح اور عصرہ محمود کے ساتھ موجود تھی' لیکن ہر کوئی دبے الفاظ میں یہی کہہ رہا تھا کہ اشعر نہیں آیا' نہ آئے گا ۔ جب سے اس نے کاغذات نامزدگی جمع کروائے تھے' وہ کھل کے فاتح سے کنارہ کشی اختیار کر رہا تھا۔
پارٹی ایک ریستوران کے ٹیرس پہ منعقد کی گئی تھی ۔ یہاں ہر شام کنسرٹ ہوتے' کبھی آرٹ کی نمائش لگتی' کبھی شادیاں ہوتیں ۔ یہ کے ایل کا ایک ایلیٹ ریستوران تھا ۔ ٹیرس پہ دور دور تک کرسیاں میزیں لگی تھیں ۔ اوپر آسمان نظر آ رہا تھا اور ریلنگ سے جھانکو تو نیچے بہتا ٹریفک دکھائی دیتا تھا۔
وہ اس وقت دونوں ہاتھ ریلنگ پہ رکھے گردن اٹھائے آسمان کو دیکھ رہی تھی ۔ گردن پوری اٹھانے سے سنہرے بالوں کی پونی پیچھے سے نیچے جھک گئی تھی۔
"تم موقع کی مناسبت سے تیار نہیں ہوئیں۔"
عصرہ کی آواز پہ وہ چونک کے پلٹی تو دیکھا' عصرہ تنقیدی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی جو ٹائٹس پہ گھٹنوں تک آتا سفید فراک پہنے' کندھے پہ بیگ لیے سادہ سی کھڑی تھی ۔ خود عصرہ نے روایتی باجو کرنگ پہن رکھا تھا اور بالوں کو جوڑے میں باندھ کے کانوں میں ہیرے لٹکا رکھے تھے۔
"میں اپنا مقام نہیں بھولتی' مسز عصرہ....." وہ بظاہر مسکرا کے بولی، البتہ عصرہ کا طنز اسے چبھا تھا۔
"میں یہاں ایک باڈی وومن ہوں' مہمان نہیں۔ میرا کام صرف فاتح صاحب کی زندگی کو ترتیب سے رکھنا ہے۔"
"گڈ۔" عصرہ نے روکھے انداز میں شانے اچکائے' پھر مڑ کے فاتح کو دیکھا جو قریب کھڑا کسی سے مسکراتے ہوئے بات کر رہا تھا ۔ اسی اثناء میں دوسری طرف کھڑی کچھ لڑکیوں اور لڑکوں پہ عصرہ کی نظر پڑی جو فاتح کو دیکھ کے سرگوشیوں میں دبی دبی پر جوش ہنسی کے ساتھ بات کر رہے تھے۔
"سنو' تالیہ۔" عصرہ نے تحکم سے ابرو سے اشارہ کیا۔ "گیدرنگ میں تمہارا کام فاتح کو ان غیر ضروری جھنجھٹوں سے محفوظ رکھنا ہے تاکہ وہ آرام سے اپنے دوستوں سے ملاقات کر سکے ۔ رائٹ؟" حکم دے کر وہ آگے بڑھی ۔ اسی پل فاتح دوست سے بات ختم کر کے ان کی طرف پلٹا تھا۔
"کیوں؟"
تالیہ کے 'کیوں' پہ جہاں عصرہ بے یقینی سے مڑی' وہاں وہ جوان کی طرف آ رہا تھا' ٹھہر کے اسے دیکھنے لگا۔
"کیا مطلب کیوں؟ یہ تمہارا کام ہے۔" عصرہ نے بگڑ کے ابرو چڑھائے۔
"نہیں مسز عصرہ' یہ میرا کام نہیں ہے ۔ میں پرسنل ایڈ ہوں' کنیز نہیں ۔ یہ اکیسویں صدی ہے اور ذہنوں کو غلام بنانا مشکل ہے' میم ۔ اگر فاتح صاحب کو خوش آمدی پرسنل ایڈز کی عادت رہی ہے تو ان کو یہ عادت بدلنی پڑے گی۔
میرا کام ان کی سیاسی زندگی کو ترتیب میں رکھنا ہے' مگر میں فاتح صاحب کو ملائیشیا کی عوام کو 'جھنجھٹ' کہنے کی اجازت نہیں دے سکتی ۔ وہ اگر اس مقام پہ ہیں تو اس عوام کے ووٹ کی وجہ سے ہیں ۔ یہ لوگ ان سے پیار سے ملنے آئے ہیں اور

Digitized by Google

ایک باڈی ووومن کی حیثیت سے میرا فرض ان کو روکنا نہیں' بلکہ یہ ہے۔"

سادگی اور سکون سے کہہ کے اس نے اپنی سیاہ زنبیل سے ایک سیلفی اسٹک نکالی' عصرہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے موبائل کھٹ سے اسٹک میں لگایا اور مسکرا کے اس گروپ کی طرف مڑی جو چند قدم دور تھا اور جوش اور ہچکچاہٹ سے پرے کھڑا تھا۔

"صرف ایک تصویر!" وان فاتح کی باڈی ووومن مسکرا کے گروپ کو کہہ رہی تھی اور جہاں عصرہ ہکا بکا کھڑی رہ گئی اور فاتح بالکل ٹھہر کے اسے دیکھنے لگا' وہاں گروپ کے لڑکے لڑکیوں کے چہروں پہ بے یقینی بھری خوشی پھیلی۔ وہ دوڑ کے اس طرف آئے۔

عصرہ اور فاتح میکانکی انداز میں ساتھ ساتھ ہوئے۔ چہروں پہ خود بخود مسکراہٹیں طاری کرلیں۔ لڑکے لڑکیاں دائیں بائیں کھڑے ہو گئے اور تالیہ ان دونوں کے آگے آ گئی۔

"سائل ایوری ون۔" وہ اب سیلفی اسٹک بلند کیے مسکرا کے تصاویر یں اتار رہی تھی۔ تصویریں کھنچوا کے لوگ ہاتھ ملاتے اور ہٹ جاتے۔ دونوں میاں بیوی مسکرا مسکرا کے تصاویر کھنچوا رہے تھے۔

پارٹی میں دیگر مہمان مڑ مڑ کے ان کو دیکھ رہے تھے۔ وہاں رش سا لگ گیا تھا۔ آخری شخص ہٹا تو تالیہ نے اسٹک نیچے کرلی اور خوش اخلاقی سے بولی۔

"آپ کو تصاویر ہمارے فیس بک پیج سے مل جائیں گی۔ ایکسکیوز اس ناؤ۔" اور ساتھ ہی مڑ کے ان دونوں کو آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ فاتح نے ہجوم کو مسکرا کے ہاتھ ہلایا اور مڑ گیا۔ عصرہ نے مٹھیاں بھینچ رکھی تھیں مگر چہرے پہ جبری مسکراہٹ تھی۔ رش ادب سے چھٹ گیا اور وہ تینوں محفوظ گوشے کی طرف چلے آئے۔

وہ ایک دفعہ پھر سے ریلنگ پہ ہاتھ رکھے جھک کے نیچے دیکھنے لگی جب تھوڑی دیر بعد وہ اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔

"آئی ایم سوری' تاشہ!" وہ چونک کے سیدھی ہوئی۔ فاتح گلاس تھامے اسے افسوس سے دیکھ رہا تھا۔ سیاہ کوٹ سے جھلکتی سفید کالر والی شرٹ... ماتھے پہ سلیقے سے جمے بال... وہ اس کرتے پاجامے والے غلام سے کس قدر مختلف تھا... تالیہ کی نظریں اس کی آنکھوں پہ جم گئیں۔

"کیوں' سر؟"

"میں نے تم پہ اس فائل کے لیے شک کیا۔ مجھے معلوم ہے تم نے وہ نہیں چرائی تھی۔"

ڈھیر سارے آنسو ایک دم اس کے حلق میں جمع ہوئے' مگر وہ خشک آنکھوں سے مسکرائی۔ "کیا معلوم واقعی چرائی ہو۔"

فاتح نے مسکرا کے شانے اچکائے اور گلاس سے گھونٹ بھرا' پھر ناپسندیدگی سے چپ چاپ گلاس واپس رکھ دیا۔ اس کی ذائقے کی حس متاثر ہو چکی تھی۔ پتہ نہیں کیوں۔

"آپ چاہتے ہیں میں وہ گھر خرید لوں؟"

"میں نے ایسا کب کہا؟" وہ انجان بن گیا۔

تالیہ چند لمحے اس کی آنکھوں کو دیکھتی رہی۔

"آپ کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے اس وقت' سر؟"

"مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے' اللہ کا شکر ہے۔" وہ ازلی بے نیازی سے مسکرا کے بولا۔ دونوں ریلنگ کے ساتھ آمنے سامنے کھڑے تھے اور نیچے دور تک بہتا روشن ٹریفک نظر آرہا تھا۔

"آپ کو فنڈز چاہیے ہیں' ہے نا۔" وہ بنا پلک جھپکے اس کی آنکھوں کو دیکھ رہی تھی۔ "اگر میں آپ کا یہ مسئلہ حل کر دوں تو مجھے کیا ملے گا؟"

"تمہارا مطلب ہے تم میرا گھر بکوا سکتی ہو؟"

"میرا مطلب ہے کہ میں آپ کو وہاں سے پیسے دلوا سکتی ہوں جہاں سے آپ نے گمان بھی نہ کیا ہو تو کیا آپ میری ایک بات مانیں گے؟"

"وہ کیا؟"

"وہ بات میں آپ کو تب بتاؤں گی جب میں فنڈز کا چیک آپ کے ہاتھ میں تھماؤں گی۔" پھر

توقف سے بولی۔ ''چیئر مین صاحب!''
''چیئر مین صاحب؟'' فاتح نے ابرو اٹھا کے اسے دیکھا۔
''یہ قبل از وقت ہے'لڑکی!''
''مجھے کبھی کسی نے کہا تھا کہ جو ہمیں معلوم ہوتا ہے وہ ہماری جان بچاتا ہے' اور مجھے بہت کچھ کرنا آتا ہے۔ پہلی چیز ہے مثبت سوچ۔ چیئر مین صاحب۔'' پھر گھڑی دیکھی۔ ''اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں گھر چلی جاؤں؟ مجھے کچھ کام کرنے ہیں۔''
''پارٹی ویسے بھی ختم ہونے والی ہے۔''
''جی مگر آپ کا گھر دوسرے کونے پہ ہے۔ ڈرائیور آپ کو ڈراپ کرے گا اور پھر میں بس پکڑوں گی تو دیر ہو جائے گی۔ اور....''
''ہم پہلے تمہیں ڈراپ کریں گے۔ سمپل۔'' وہ قطعی انداز میں کہہ کے مڑ گیا۔ اسے کوئی بلا رہا تھا۔ وہ اداس مسکراہٹ کے ساتھ اسے جاتے دیکھتی رہی۔ اس کا رویہ بدلنے لگا تھا۔ تالیہ کی ''ایمانداری'' کا یقین ہو جانے سے سب کچھ بدل رہا تھا۔ اور اگر اس کو یہ پتہ چلے کہ وہی جالم ہے تو وہ کیسا ری ایکٹ کرے گا؟ وہ جتنی کوشش کرتی' اس کے راز اور جھوٹ پھر کسی کونے سے نکل کے اس کے سامنے آ کھڑے ہوتے تھے۔

☆☆☆

عثمان کار چلا رہا تھا۔ وہ فرنٹ سیٹ پہ بیٹھی تھی اور وہ دونوں میاں بیوی پیچھے تھے۔ فاتح بے نیازی سے باہر دیکھ رہا تھا البتہ عصرہ کو رہ رہ کے غصہ آ رہا تھا۔
''یہ سیلفیز والی حرکت غیر دانشمندانہ تھی' تالیہ۔ ہجوم آؤٹ آف کنٹرول ہو جاتا ہے۔ فاتح کی یہ سیکیورٹی کے لیے غیر مناسب تھا۔'' بالآخر وہ تنبیہہ کرتے ہوئے بولی۔ ''آج تو ہو گیا مگر کوشش کرنا کہ آئندہ....''
''ہم ٹویٹر پہ ٹرینڈ کر رہے ہیں۔ نمبر ٹو پہ....'' تالیہ نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ موبائل چہرے کے سامنے کیے جوش سے اطلاع دی۔ فاتح نے چونک کے اسے دیکھا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ سے پیچھے بیٹھا تھا اور اس کا نیم رخ دیکھ سکتا تھا۔
''عثمان نے نوجوان چیئر مین کے نام سے وہ تصاویر ٹویٹ کی تھیں۔ اور اب وہ تمام لڑکے لڑکیاں اس ہیش ٹیگ کو آگے پھیلا رہے ہیں۔ ساتھ ہی عثمان نے پارٹی ممبر شپ کے لیے لنک ڈال دیا ہے۔ پارٹی الیکشن میں یہ لوگ ووٹ ڈالیں گے نا۔''
اس نے فون فاتح کی طرف بڑھا دیا۔ فاتح نے عینک آنکھوں پہ لگائی اور مسکرا کے چمکتی اسکرین پہ انگلی پھیرنے لگا۔ پھر فون واپس کر دیا۔ تعریف توصیف کے بجائے ایک مسکراہٹ کافی تھی۔
''بس یہیں ڈراپ کر دیں مجھے۔'' اس کے گھر کا گیٹ سامنے آیا تو عثمان نے کار روکی۔ ہیڈ لائٹس نے گیٹ کو روشن کیا تو گیٹ سے نصب لیٹر باکس کے اوپر رکھی سجی ہوئی ٹوکری صاف دکھائی دی۔ تالیہ کی نظریں اس پہ رکیں تو وہ بے چین ہو کے سیدھی ہوئی۔ عصرہ نے گردن اونچی کر کے اس کا انداز دیکھا۔
''میں ....میں چلتی ہوں۔'' بیگ اٹھاتے ہوئے دروازہ کھولنے لگی' پھر رک کے مروتاً کہا۔
''آپ لوگ اندر آئیں نا' کافی پیتے ہیں ساتھ۔''
فاتح مسکرا کے نفی میں سر ہلا کے انکار کرنے ہی لگا تھا کہ.....
''شیور۔ مجھے بھی کافی کی شدید طلب ہو رہی تھی۔'' عصرہ ایک دم مسکرا کے بولی تو فاتح نے پوری گردن موڑ کے اسے دیکھا۔ آنکھوں سے تنبیہہ کی مگر بے سود۔ تالیہ سنبھل کے جلدی سے بولی۔
''پلیز آئیں نا۔ عثمان کار اندر لے آؤ۔'' خود وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ جلدی سے گیٹ کھولا اور پھر ٹوکری اٹھائی۔ اوپر کارڈ رکھا تھا۔ ایڈم کی لکھائی میں لکھا۔ ''وان فاتح کی طرف سے۔''
(یا اللہ ایڈم۔ تمہیں کسی کمبوڈو ڈریگن کے آگے

Digitized by Google

ڈالوں گی میں۔)

جلدی سے کارڈ کے دو ٹکڑے کیے اور ان کو بیگ میں پھینکا۔ پھر کو کو پھل اور چاکلیٹس سے بھری ٹوکری اٹھالی۔ کار اب تک اندر آ چکی تھی۔ عصرہ نے کھڑکی سے اس کا کارڈ پھاڑنا غور سے دیکھا تھا۔

"اتنا خوبصورت تحفہ بھیجنے والے کا کارڈ پھاڑنا اچھی بات نہیں ہے، تالیہ۔" وہ نیچے اترتے ہوئے خوشگوار انداز میں بولی۔ فاتح نے بھی اترتے ہوئے ایک اچٹتی نظر تالیہ کی ٹوکری پہ ڈالی۔

"بھیجنے والا خود غرض ہے۔ واپس آنے کے بجائے تحفے بھیجتا ہے تاکہ میں اسے بھول نہ جاؤں۔ اتنا بھی بھروسہ نہیں تھا ہمارے رشتے پہ۔ ہونہہ۔" ایک تیکھی نظر فاتح پہ ڈال کے بولی۔ عصرہ نے دلچسپی سے ابرو اکٹھے کیے۔ "یعنی....؟"

"یہ یقیناً تاشہ کے شوہر کی طرف سے ہوں گے۔ کانٹ بلیو کوئی اتنی چاکلیٹس کیسے کھا سکتا ہے۔"

وہ بھری ہوئی ٹوکری کو دیکھ کے جھرجھری لیتا دروازے کی طرف بڑھا تو عصرہ چونکی۔ بے یقینی سے تالیہ کو دیکھا۔

"تمہارا شوہر بھی ہے؟"

وہ دروازے تک آئی اور اسے کھولتے ہوئے سرد مہری سے بولی۔ "بالکل ہے، مسز عصرہ۔ اور میرا اسے چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ بھلے کوئی کچھ بھی کرلے۔"

"تاشہ کا ہزبینڈ دوسرے ملک ہوتا ہے سفر وغیرہ پہ۔" فاتح آگے بڑھتے ہوئے بیوی کو بتا رہا تھا۔ تالیہ نے دروازہ کھولا تو سامنے لاؤنج سفید بتیوں سے جگمگا رہا تھا۔

"آ گئیں تم اس مغرور انسان کی خدمتیں کر کے؟"

"آج کسی کا دایاں ہاتھ کٹوایا شہزادی صاحبہ نے یا نہیں؟"

داتن اور ایڈم ایک ساتھ بولے تھے۔ وہ دونوں بڑے صوفے پہ بیٹھے تھے۔ لیپ ٹاپ سامنے رکھا تھا اور ایک بڑا سا کیک آدھا کھایا رکھا تھا۔

تالیہ نے ان کو بری طرح گھورا اور سامنے سے ہٹی۔ فاتح، عصرہ اور عثمان اندر داخل ہوئے تو جہاں داتن کا چمچ پلیٹ میں آ گرا، وہیں ایڈم ہکا بکا سا کھڑا ہوا۔

"ایڈم؟ تم یہاں؟" ان تینوں کو جھٹکا لگا تھا۔ ایڈم کی زبان جیسے گم ہو گئی۔ ٹکر ٹکر ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"یہ لیانہ صابری ہیں، میری دوست۔ اور ایڈم سے میری حال ہی میں بہت اچھی دوستی ہوئی ہے۔ آپ جانتے ہیں۔ ایڈم اور لیانہ میرے گھر کے ری ڈیکور کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اسی لیے میں آج جلدی گھر آنا چاہتی تھی تاکہ شاپنگ لسٹ فائنل کر دوں۔" وہ جلدی جلدی بتاتی آگے آئی اور ٹھک سے لیپ ٹاپ فولڈ کیا۔ کاغذات اکٹھے کر کے داتن کو تھمائے۔

"مہمانوں کے لیے جگہ صاف کرو۔" بظاہر مسکرا کے کہا۔ داتن نے جلدی سے سلام کیا اور سارے کاغذات جو فاتح کی اس رات کی نقل و حرکت کے پرنٹ آؤٹس تھے، سمیٹ کے اٹھ گئی۔

"سو ایڈم اور تم اچھے دوست ہو۔ ہوں۔" کچھ دیر بعد بڑے صوفے پہ ٹانگ پہ ٹانگ جما کے بیٹھے فاتح نے باری باری دلچسپی سے دونوں کو دیکھ کے پوچھا۔

عثمان بھی گا ہے بگا ہے ایک چبھتی ہوئی نظر ایڈم پہ ڈالتا تھا۔ وہ شرمایا گھبرایا ہوا کم اعتماد لڑکا نہیں لگ رہا تھا جو پچھلے ماہ وان فاتح کا باڈی مین بننے آیا تھا۔ یہ تو ایک اچھا لباس پہنے، پر اعتماد اور پرسکون سا نوجوان لگتا تھا۔

"جی۔ مسز عصرہ کا شکریہ کہ انہوں نے مجھے ایڈم سے متعارف کروایا۔" تالیہ سامنے والے صوفے پہ بیٹھی تھی۔ ایڈم قریب تھا۔ بس جبری مسکرا کے وضاحت دینے لگی۔ عصرہ کے لیے مزید خود کو روکنا مشکل تھا۔ دلچسپی سے پوچھنے لگی۔

Digitized by Google

"تو تمہارا شوہر.... اس کی بات کرتے ہیں۔"
کچن میں کھڑی داتن نے گردن گھما کے اور ایڈم نے پوری آنکھیں نکال کے تالیہ کو دیکھا۔
"جی پوچھیے؟" تالیہ عصرہ کو دیکھ رہی تھی جو تھوڑی تلے بند مٹھی جمائے دلچسپی سے مسکرا رہی تھی۔
"تمہارا شوہر کہاں ہے؟"
"جیل میں۔"
"قید میں۔"
داتن اور ایڈم ایک ساتھ بولے تھے۔ داتن تو زیرلب بولی مگر ایڈم کا ٹھنڈا سانس لے کر فاتح کو دیکھ کے "قید میں" کہنا سب کو سنائی دیا۔
"قید میں؟" فاتح نے ابرو اٹھایا۔
"شادی سے بڑی قید کیا ہو سکتی ہے بھلا؟"
تالیہ دانت پہ دانت جما کے جبراً مسکرائی۔
"شادی قید تو نہیں ہوتی۔ تم ایسا کیوں سمجھتی ہو؟" وہ حیران ہوا۔ پھر نظر گھما کے کونے میں رکھی کوکو پھل کی ٹوکری کو دیکھا۔ "تو کیا وہ واپس نہیں آئے گا؟" وہ واقعی اپنی باڈی ومن کی شادی کے لیے فکر مند ہوا۔
"بھلا دینے والوں کی واپسی مشکل ہے' سر!"
ایڈم نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔
"میں کافی لاتی ہوں۔" تالیہ جلدی سے کہہ کے اٹھی۔ ایڈم کو تادیبی نظروں سے گھورا بھی مگر وہ اسی سادگی سے ان دونوں کو دیکھ کے کہہ رہا تھا۔
"چے تالیہ کا شوہر ہر ہفتے ان کو چاکلیٹس سے بھری ٹوکری بھیجتا ہے۔ مگر خود واپس آنے سے انکاری ہے۔ آپ ایسے شخص کو کیا کہیں گے۔"
"شاید مجبور!" فاتح نے محتاط انداز میں شانے اچکائے۔ "کسی کے بارے میں یوں ججمنٹ پاس کرنا اچھا نہیں لگتا ویسے۔"
وہ کچن میں آئی اور جلدی جلدی چولہے پہ پانی رکھنے لگی۔ داتن اس کے قریب کھسکی اور سرگوشی کی۔
"یہ کیا کہہ رہا ہے؟"
"اگنور کرو۔" وہ نظر ملائے بغیر تیز تیز کام کر رہی تھی۔
"سر مجھے آپ سے ایک بات پوچھنی تھی۔"
ایڈم نے بات کا رخ بدلا۔ صوفے کی پشت پہ بازو پھیلائے بیٹھے فاتح نے حوصلہ افزا انداز میں سر کو خم دیا۔ "پوچھو۔"
"آپ اپنے ملاکہ والے گھر میں کم ہی رہتے ہیں۔"
"کم؟ ہم تو سال میں دو چار دفعہ ہی وہاں جاتے ہیں۔" عصرہ نے شانے اچکائے۔ نظریں کچن میں کھڑی تالیہ پہ جمی تھیں۔
"آپ نے اس سے پہلے کبھی یہ گھر کسی کو کرایے پہ دیا تھا؟"
"کرایے پہ؟ نہیں۔" فاتح مختصراً بولا تو عصرہ نے چونک کے اسے دیکھا۔
"اپنے اس برڈ واچر دوست کو تو دیا تھا پچھلے سرما میں۔ بھول گئے؟"
"وہ کرایے پہ تھوڑی تھا۔ چند دن کے لیے چھٹیاں گزارنے آیا تھا وہ۔" فاتح نے فوراً کہا تو ایڈم نے چونک کے اسے دیکھا۔
"برڈ واچر؟"
"ہاں۔ تمہارے فاتح صاحب کا ایک دوست تھا۔ پورا مہینہ رہا تھا دسمبر میں۔ سارا دن پینٹنگ کرتا تھا یا آسمان پہ خوردبین سے پرندے دیکھتا تھا۔"
عصرہ بولے جا رہی تھی تو فاتح نے پہلو بدلا۔
"ایڈم اس روز اشعر کی پارٹی کے بعد تاشہ کی کار ہمارے گھر سے کون لینے آیا تھا؟"
عصرہ کو ایک دم سانپ سونگھ گیا۔ ٹرے میں پرچ پیالیاں رکھتی تالیہ کے ہاتھ میں کانچ ٹکرائے۔ ایڈم نے ایک نظر عصرہ کو دیکھا جس کی آنکھوں میں ملے جلے تاثرات ابھرے تھے۔ اس نے ایڈم کو منع کیا تھا کہ وہ فاتح کو نہیں بتائے گا۔
"میں لایا تھا۔ مسز عصرہ کو بتایا تھا میں نے۔ ان سے باقاعدہ اجازت لی تھی شاید۔ بلکہ میم کو میرا چے تالیہ کے لیے یہ کام کرنا اچھا لگا تھا اور اس کام

Digitized by Google

کے انہوں نے مجھے زائد پیسے بھی دیے تھے تنخواہ کے علاوہ۔ کیوں، سر؟ کوئی خاص وجہ ہے کیا؟" معصومیت سے ایڈم بن محمد نے سب اگل دیا۔

عصرہ بدقت خود کو سنبھالے بیٹھی رہی۔ فاتح کا چہرہ بھی بظاہر بالکل پرسکون تھا۔ اس نے بس مسکرا کے سر کو خم دے دیا۔ لاؤنج میں خاموشی چھا گئی۔

تالیہ جلدی سے ٹرے میں بھاپ اڑاتی پیالیاں رکھے لے آئی۔ میز پہ ٹرے رکھی اور چائے دان کو پہلے کپ میں انڈیلا۔

"یہ کافی تو نہیں ہے۔" عصرہ نے دھار کا رنگ دیکھ کے ذرا نخوت سے کہا۔ بظاہر پچھلے موضوع کو بدلا۔

"یہ کافی سے اچھی ہے، مسز عصرہ۔" عصرہ اور عثمان کو ان کے کپ پکڑائے۔ پھر فاتح کے سامنے آئی اور چینک سے اس کے کپ میں قہوہ انڈیلنے لگی۔ چینک اونچی کرلی۔ سبز بھوری دھار سی لمبی ہو کے کپ میں گرنے لگی۔ وہ مہک، وہ دھار گرنے کا انداز، وان فاتح یک ٹک اس دھار کو دیکھے گیا۔

"سوری تالیہ مگر اس میں تو کوئی ذائقہ ہی نہیں ہے۔" عصرہ نے گھونٹ بھر کے پیالی رکھ دی۔

مگر وہ صرف فاتح کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے پیالی اٹھائی۔ پرچ پیالی کانچ آپس میں ٹکرایا۔ ماضی کی یادیں اس کے سامنے بکھرنے لگیں مگر وان فاتح کے دماغ کی سلیٹ صاف تھی۔ بس کپ لبوں سے لگایا۔ چند گھونٹ بھرے۔

"یہ کون سی چائے ہے؟" اسے جیسے خوش گوار حیرت نے آن لیا تھا۔

"یہ ان پتوں کی چائے ہے جو قدیم چین میں پائے جاتے تھے۔ ان کا ذائقہ چند صدیوں پہلے کے پتوں جیسا تو نہیں ہے مگر میں نے ان کو اپنے لان میں اگایا ہے۔ کوئی کھاد نہیں ڈالتی۔ یہ بالکل آرگینک طریقے سے بڑے ہو رہے ہیں۔ آپ کو اچھی لگی چائے، چیئرمین۔"

"ہوں۔ مختلف ہے۔" وہ گھونٹ گھونٹ پی رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ذہن کے کسی خانے پہ وہ مہک اور ذائقہ دستک دے رہا ہو مگر اندھیرا اتنا تھا کہ کوئی دروازہ دکھائی نہ دیتا تھا۔

وہ لوگ جس وقت رخصت ہوئے، تالیہ نے گھر کا دروازہ بند کیا اور آندھی طوفان کی طرح ان دونوں کی طرف آئی۔

"تم نے وہ ٹوکری میرے گھر کے باہر رکھ دی؟ کیوں؟ اور عصرہ پہ شک کیوں دلوایا ان کو؟"

"اور آپ کب تک ان سے چھپاتی رہیں گی کہ ان کی بیوی ان کو دھوکہ دے رہی ہے۔"

"میں ان کی کسی لڑائی کی وجہ نہیں بننا چاہتی۔ تم نے وہ ٹوکری کیوں وہاں رکھی؟"

"کیونکہ ان کا حکم تھا کہ اس کو آپ کے دروازے پہ رکھنا ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ انہیں ساتھ لے آئیں گی۔"

"ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ تم اس کے ساتھ اپنی تصاویر ٹوئیٹ کر رہی ہو گی۔" ان دونوں کے درمیان داتن نے بھی غصے سے مداخلت کی۔

"میں ان کی باڈی وومن ہوں۔ میں ٹی وی اور اخبارات میں ان کے ساتھ نظر آؤں گی۔ تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے۔" وہ غصے میں چلائی تھی۔

"اور تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے تالیہ کہ تم نے اسی شہر میں بیسیوں اسکام کیے ہیں۔ کوئی نہ کوئی تمہیں پہچان جائے گا۔ کسی ویٹرس، کسی ملازمہ، کسی ریسپشنسٹ کے روپ میں۔"

"مجھے پروا نہیں ہے۔ جب میں نے راستہ درست کرلیا ہے تو کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" وہ تلخی سے بولی، پھر پرس سے ایک موبائل اور گھڑی نکال کے میز پہ رکھی۔

"اگر تم دونوں نے اپنی جرح مکمل کرلی ہو تو اس واچ پہ کام کرو۔ اس کا جی پی ایس ڈیٹا نکالو اور معلوم کرو کہ وہ اس رات کہاں گیا تھا۔"

برہمی سے کہتے اس نے لیپ ٹاپ کھولا اور صوفے پہ بیٹھی۔ وہ دونوں خاموشی سے اس کے

Digitized by Google

دائیں بائیں بیٹھ گئے۔

''آپ ماشاء اللہ ان کا موبائل بھی چرا لائیں۔''

''اس کی جگہ ایک خراب بیٹری کا ہو بہو یہی موبائل رکھ دیا ہے۔ صبح تک فاتح صاحب کو موبائل بدلے جانے کا علم نہیں ہوگا۔ صبح اصلی موبائل واپس رکھ دوں گی۔'' پھر تفتیشی نظروں سے ایڈم کو دیکھا۔ ''اور یہ تم سن باؤ کے گھر کا کیوں پوچھ رہے تھے۔''

''کیونکہ اس گھر میں کچھ ہے جو صحیح نہیں ہے۔ شاید تیسرا خزانہ ہے جو.....''

''اسٹاپ اِٹ ایڈم۔'' اس نے غصے سے ٹوکا۔ ''کوئی خزانہ نہیں ہے وہاں۔ میں نے کم اپنی زندگی خراب کی ہے خزانے کے پیچھے جو تم بھی اسی لالچ میں پڑ گئے ہو؟ میں وہ گھر ان کو واپس کر رہی ہوں۔''

ایڈم اس بات پہ پریشان ہوگیا۔

''اچھا کل آپ کی چھٹی ہے ہم دونوں ملاکہ جاتے ہیں۔ آپ اس رات کا سراغ لگانا اور میں خزانے کا۔ اگر میں کل ناکام ہوگیا تو ٹھیک ورنہ آپ وہ گھر ان کو ابھی واپس نہیں کریں گی۔''

اس نے گھور کے ایڈم کو دیکھا۔ ''ایک دن.... صرف ایک دن ہے تمہارے پاس۔ جو کرنا ہے کرلو۔''

داتن خاموشی سے کی بورڈ پہ انگلیاں چلاتی رہی۔ وہ دونوں اپنی باتوں میں بھول جاتے تھے کہ وہ ان کے ساتھ ہے اور ان کے کسی خاص راز سے نا واقف ہے۔

''یہ رہا وان فاتح کا روٹ۔'' داتن نے اسکرین سامنے کی۔

''وہ پولیس اسٹیشن سے نکل کے پیدل چلنے لگا۔ وہ ان گلیوں کو عبور کر کے اس گلی کے اس گھر میں گیا۔ کافی دیر وہ یہاں رہا، پھر وہ باہر نکلا اور....'' اسکرین پہ بنے نقشے پہ سرخ لکیر بنتی آرہی تھی۔ داتن انگلی اس لکیر پہ پھیرتی بولے جا رہی تھی۔

''پھر وہ سڑک کنارے اس جگہ پہ رکا۔ یہاں ٹیلی فون بوتھ ہے شاید۔ میں اس جگہ کو پہچانتی ہوں۔ اس نے کوئی کال کی۔''

''عثمان کو کال کی تھی انہوں نے۔'' ایڈم تیزی سے بولا۔ ''عثمان نے ذکر کیا تھا کہ اس رات فاتح صاحب نے اسے کال کر کے مجھے پیسے بھیجنے کو کہا تھا۔''

''کس چیز کے پیسے؟'' داتن نے سوچتے ہوئے اسے دیکھا۔ ایڈم چپ رہا۔ بس ایک نظر کوکو پھل کی ٹوکری پہ ڈالی۔

''یہ گھر....'' تالیہ نے اس گھر پہ انگلی رکھی۔ ''مجھے اس گھر میں جانا ہے۔'' وہ سوچتے ہوئے ایک عزم سے بولی تھی۔ بہت سے سوالوں کے جواب ملنے والے تھے۔

☆☆☆

گھر آتے ہی فاتح سنجیدہ چہرے کے ساتھ کمرے کی طرف بڑھ گیا تو عصرہ کا دل بری طرح دھڑکا مگر پھر بڑے حوصلے سے گردن اکڑا کے پیچھے آئی۔

''تمہیں کیا ہوا؟'' بظاہر لاعلمی سے پوچھا۔

''تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟ تاشہ کار پک کرنے نہیں آئی تھی اور تم جانتی تھیں۔'' وہ دونوں ہاتھ پہلوؤں پہ جمائے سامنے کھڑا اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''تاکہ تم میرے بھائی پہ الزام نہ لگاؤ۔ اگر میں تالیہ پہ شک نہ کرتی تو تم فوراً سارا ملبہ میرے بھائی پہ گرا دیتے۔''

''وہ تو میں نے تب بھی گرا دیا تھا۔ تم چپ ہو گئی تھیں۔ نہیں، عصرہ!'' وہ نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ ماتھے پہ بل پڑے تھے اور رنگت سرخ ہو رہی تھی۔ ''تم نے مجھ سے غلط بیانی کی۔ تم اپنے کسی ملازم کو بچا رہی تھیں؟ یا شاید...'' وہ جیسے چونکا۔ ''شاید خود کو...''

''فاتح اتنا بڑا ایشو ہے نہیں جتنا تم اس کو بنا رہے ہو۔'' وہ چیخ پڑی۔ ''ایک فائل ہی تو تھی۔''

''فائل نہیں تھی۔ وفاداری تھی۔ سچ تھا۔ عصرہ

Khawateen Digest December 2018
Digitized by Google

خدا کی قسم اگر مجھے کبھی علم ہوا کہ تمہارا اس میں کوئی ہاتھ ہے تو....."

"تو کیا؟ کیا کرو گے تم' ہاں؟" وہ غصے سے بولی۔ سارے خوف' خدشے زائل ہو گئے اور اس نے گویا سینہ تان لیا۔

"دی تھی میں نے وہ فائل اشعر کو۔ خود دی تھی میں نے تاکہ تم اس گھر کو جسے میں نے اتنے پیار سے سجایا تھا' یوں نہ بیچو۔ تم جب سیدھی طرح سے میری بات نہیں سن رہے تھے تو مجھے یہی طریقہ استعمال کرنا پڑا۔ ہاں دیا ہے میں نے تمہیں دھوکہ لیکن صرف تمہاری محبت میں۔ کیا کرو گے تم' ہاں؟ چھوڑ دو گے مجھے؟ وہ تو تم تب سے چھوڑ چکے ہو جب سے آریانہ کھوئی ہے۔ میری بیٹی کے ساتھ ہماری شادی بھی کہیں کھو گئی ہے' فاتح۔ تم بھی کھو گئے ہو۔" آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ غصے سے بولتے بولتے ایک دم وہ رو پڑی۔

وہ بالکل سن کھڑا صدمے سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم اتنی ناخوش ہو میرے کام سے؟" وہ افسوس سے کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا۔ دکھ اتنا شدید تھا کہ دل کٹ گیا تھا۔

"جب تم میری ہر بات اور دلیل سننے کے دروازے ہی بند کر دو گے فاتح تو بتاؤ تمہارے گھر والے کہاں جائیں؟ ہم کس سے فریاد کریں؟ میری ایک بیٹی کو تمہاری سیاست نے مار دیا۔ میرے باقی بچوں کو خطرے میں مت ڈالو' یہ فقرہ بار بار سن کے بھی تم نظر انداز کر دیتے ہو کیونکہ تم کسی سے نہیں ڈرتے۔ مگر واللہ میں ڈرتی ہوں۔ اور میں تمہیں یہ الیکشن نہیں لڑنے دوں گی' یاد رکھنا۔" اس نے تنفر سے فاتح کو دیکھتے ہوئے مٹھیوں سے آنسو رگڑے اور پیر پٹختی باہر نکل گئی۔

وان فاتح کی رنگت بالکل سفید ہو گئی تھی۔ دکھ اور صدمہ بہت شدید تھا۔ وہ چپ چاپ باہر آیا اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اوپر زینوں کے سرے پہ آریانہ اپنا سفید فراک پھیلائے بیٹھی تھی۔ اسے اوپر آتے دیکھ کے بولی۔

"آپ کو ہمیشہ سے ماما پہ شک تھا' ہے نا؟ تالیہ کو صرف اس لیے الزام دیتے تھے کیونکہ آپ یہ ماننا نہیں چاہتے تھے کہ آپ کی اپنی بیوی ایسا کر سکتی ہے۔ اب آپ اس شادی میں کیسے رہیں گے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ آپ سے یوں خیانت کر سکتی ہیں۔"

"تمہیں آریانہ یوں جانا نہیں چاہیے تھا۔ وہ درست کہتی ہے۔ تمہارے ساتھ ہمارا رشتہ بھی کہیں کھو سا گیا ہے۔"

وہ سوگواریت سے کہتا زینے چڑھتا گیا۔ وہ اس وقت کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آریانہ سے بھی نہیں۔

☆☆☆

جدید ملاکہ میں رات پھر بارش ہوئی تھی جس کی وجہ سے صبح سارا شہر دھلا دھلایا سا کھڑا تھا۔ سڑکیں گیلی تھیں اور درختوں کے پتے قطروں سے جگمگا رہے تھے۔ ایسے میں تالیہ اس سہانی صبح ایک سڑک کنارے چلتی جا رہی تھی۔ لمبی اسکرٹ پہ سفید منی کوٹ پہنے' بالوں پہ ترچھا ہیٹ جمائے' وہ موبائل پہ جی پی ایس کے بتائے راستے کا تعاقب کرتی احتیاط سے قدم بڑھا رہی تھی۔

وان فاتح کا اس رات کا سارا روٹ اس کے سامنے تھا۔ سفر اپنے اختتام کو تھا۔

ایڈم کو اس نے سن باڈ والے گھر میں چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ ابھی تک ان تاروں کے پیچھے لگا ہوا تھا اور خود تنہا یہاں آئی تھی۔ داتن کے ایل میں ہی تھی۔ تالیہ نے گزشتہ رات اسے ایک نیا کام تھما دیا تھا۔

اور اب تالیہ وہاں ملاکہ کی گلیوں میں جی پی ایس کو دیکھتی بھٹکتی پھر رہی تھی۔

سڑک پہ ٹریفک تیز رفتاری سے گزر رہا تھا... وہ صاف دیکھ سکتی تھی...

زیبرا کراسنگ عبور کرتے لوگوں کی دائیں بائیں مڑتی گردنیں....

Digitized by Google

ڈرائیو کرتے لوگوں کے کانوں سے لگے ہینڈز فری اور ان کے ہلتے لب.....
سڑک کنارے اخبار کھولے بیٹھے معمر لوگ.....
ایسے میں وہ اندر ایک گلی کی طرف مڑ گئی.....
گلی آگے جا کے تنگ ہونے لگی.....
اس کی دیواریں نیلی اینٹوں کی بنی تھیں.....
وہ اینٹوں پہ ہاتھ پھیرتی قدم بڑھا رہی تھی.....
کہیں ٹوٹا کانچ اس کی پوروں سے ٹکرایا.....
کہیں کوڑے دان کے کھلے دہانے کے اندر ٹوٹا ہوا گملا رکھا نظر آیا.....
اس گملے میں تین فیروزی پھول کھلے تھے.....
ایک موڑ مڑی، وہاں قطار میں دروازے تھے۔ چھوٹے چھوٹے مکانوں کے.....
وہ حساب سے ایک کے سامنے رکی.....
اور دستک دینے کو ہاتھ اس پہ رکھا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ کسی نے اسے بند کیوں نہیں کیا تھا؟
اندر چھوٹی سی راہ داری تھی جس کے سرے پہ اسٹینڈ رکھا تھا۔ تالیہ نے ہیٹ اسٹینڈ پہ رکھا اور احتیاط سے اندر داخل ہوئی۔
''کوئی ہے؟ ہیلو؟'' چوکنے انداز میں پکارتی وہ قدم قدم آگے بڑھنے لگی۔ گھر خاموش تھا۔ اور پراسرار بھی۔ اس کی دیواروں میں قدیم ملاکہ کی خوشبو بسی تھی۔ لگتا تھا اس کے فرش تلے بھی صدیوں پرانے راز دفن ہوں گے۔ دوپہر کے باوجود وہاں روشنی خاصی مدھم تھی۔
ایک دم دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تو وہ کرنٹ کھا کے مڑی۔
راہ داری میں کوئی نہیں تھا۔
اور اسٹینڈ خالی تھا۔ اس کا ہیٹ وہاں نہیں تھا۔
تالیہ کا ہاتھ اپنے پرس میں رینگ گیا۔ آہستہ سے اس نے ننھا ٹیزر نکالا (ننھا سا آلہ جو کرنٹ لگا کے بے ہوش کرنے کے کام آتا ہے۔) اور اسے پکڑے آگے بڑھی۔
''کون ہو تم اور سامنے کیوں نہیں آتے؟''
اونچی آواز میں پوچھا۔ پھر ایک دیوان خانے میں داخل ہوئی تو وہ بھی سنسان پڑا تھا۔
سامنے فرشی نشست بچھی تھی۔ اور اوپر ایک شیلف میں کتابیں رکھی تھیں اور چند عجیب و غریب چیزیں۔ پتھر اور سونے سے بنے جانور۔ سیپیاں۔ موتی۔ وہ ٹرانس میں چلتی کتابوں کے شیلف تک آئی۔ وہاں قدیم جلدوں والی کتابیں سجی تھیں اور ہر دوسری پہ ''ہمبورو'' لکھا نظر آتا تھا۔ جانے کتنے برسوں کی شکار بازوں پہ لکھی ساری کتب یہاں جمع کردی گئی تھیں۔
تو کسی شکار باز کا گھر تھا۔ کیا اس زمانے میں بھی وہ تھے؟ اور اگر تھے تو فاتح وہاں اس سے ملنے کیوں آیا تھا؟ کیا اپنی یادداشت کا علاج پوچھنے؟
ہوا کے جھونکے کی جیسی آواز آئی تو وہ ایڑیوں پہ گھومی۔
خالی کمرے کے وسط میں میز پہ اس کا سفید ہیٹ رکھا تھا۔
تالیہ مراد کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔ اتنی خاموشی سے کون اس کا ہیٹ وہاں رکھ گیا؟
''یونو....'' وہ زور سے بولی۔ ''ہاتھ کی اتنی مہارت سے چیزوں کو غائب اور حاضر صرف دو لوگ کرسکتے ہیں۔ جادوگر اور چور۔ تم کیا ہو؟''
وہ خالی در و دیوار سے سوال پوچھ رہی تھی۔ لگتا تھا وہاں کوئی نہ تھا۔ سانس لینے کی آواز تک نہ آتی تھی۔
''میں دونوں ہوں، شہزادی تاشہ بنتِ مراد راجہ!''
آواز عقب سے آئی تو وہ کرنٹ کھا کے گھومی۔
بغلی دروازے کی چوکھٹ پہ وہ کھڑا تھا۔ سینے پہ ہاتھ باندھے، مسکرا رہا تھا۔ تالیہ کی ششدر نظریں اس کے ننگے پیروں سے اوپر اٹھتی گئیں۔ شب خوابی کے ٹراؤزر اور گاؤن میں سامنے بیلٹ سے گرہ لگائے، وہ چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ لمبے بھورے بال اور وہ چمکتی آنکھیں جن کو برسوں سے پہچانتی

Digitized by Google

تھی۔
تالیہ مراد ساکت رہ گئی۔ ٹیزر آہستہ سے ہاتھ سے چھوٹا اور فرش پہ جا گرا۔
”تم.....تم بھی شکار باز تھے؟ اتنے سال گزر گئے اور تم نے..... مجھے..... کبھی نہیں بتایا کہ تم شکار باز تھے۔“ وہ بے یقینی سے سامنے کھڑے شخص سے اٹک اٹک کے مخاطب تھی۔
”کیا تمہاری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں تمہیں یتیم خانے میں 'شہزادی' کیوں کہا کرتا تھا' پتری تالیہ؟“
ذوالکفلی دھیرے سے بولا تھا۔ وہ ابھی تک منجمد تھی۔

☆☆☆

سن باؤ کے آنگن میں تازہ صبح پھیلی تھی۔ صحن اب برابر ہو چکا تھا اور اینٹیں کب کی سوکھ چکی تھیں۔ ایسے میں ایڈم بن محمد آستینیں چڑھائے تار کو باہر نکال رہا تھا۔ تار کیاری میں دبی تھی اور اب اس نے مٹی سے لتھڑے ہاتھوں سے اسے پورا نکال لیا تھا۔ پھر اس کا تعاقب کرتا وہ اس دیوار تک آیا جہاں دوسری تاروں کے ساتھ وہ بندھی تھی۔
ایک موٹی سیاہ تار بغیر مقصد کے یہاں کیوں تھی؟
ایڈم نے دستانے چڑھائے اور غور سے تمام تاروں کو الگ کرنے لگا۔ کیبل' انٹرنیٹ' بجلی' ٹیلی فون' ہر ایک کی تار الگ تھی۔ یہ تار ان میں سے کسی مقصد کے لیے استعمال نہ ہوتی تھی۔ بظاہر یہ کیبل کی موٹی سیاہ تار لگتی تھی مگر جب کیبل کی تار پہلے سے موجود تھی تو اس کا یہاں کیا کام؟
گچھے سے تاریں الگ کرنے پہ اسے نظر آیا کہ وہ موٹی تار گھر سے باہر جا رہی تھی۔ کیا وہ اس تار کا پیچھا کرے یا اسے یونہی چھوڑ دے؟ مگر نہیں۔ سن باؤ کا تیسرا خزانہ کہیں نہ کہیں موجود ہے۔
وہ وقت میں سفر کر کے آیا تھا۔ وہ سلاطین کے درباروں اور محلوں کو دیکھ آیا تھا۔ وہ فیری ٹیلز کو ماننے لگا تھا۔ جے تالیہ کا یقین اگر کھو گیا تھا تو اس کا بڑھ گیا تھا۔ انہوں نے دو دفعہ اس گھر کے صحن کے رازوں کو کھوجنا چاہا تھا۔ پہلی دفعہ وقت کا خزانہ ملا اور دوسری دفعہ مجسمے تلے خالی صندوق۔ کیا وہ سب بغیر مقصد کے تھا؟ نہیں۔
وہ سب تیاری تھی یقیناً۔ کسی تیسرے خزانے کی۔
ایک عزم سے اس نے دستانے اتارے اور اندر جا کے ہاتھ دھوئے۔ پھر گھر سے باہر نکل آیا۔
سیاہ تار گھروں کی دیواروں سے گزرتی بجلی کے کھمبے تک جا رہی تھی۔ وہ اتنی خوبصورتی سے درختوں اور دیواروں میں کیموفلاج کی گئی تھی کہ دور سے دکھائی نہ دیتی تھی۔
ایڈم پیدل چلتا اس تار کا پیچھا کرتا گیا۔ وہ اگلی گلی میں داخل ہو کے اس سے بھی آگے مین روڈ پہ نکل گئی۔ وہاں وہ کھمبیوں سے گزرتی سڑک کے پار جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ کوئی عام تار یوں اتنی دور تک نہیں جایا کرتی۔ ہر گزرتا لمحہ ایڈم کے جوش میں اضافہ کر رہا تھا۔
سڑک عبور کر کے وہ سامنے آیا جہاں کاروباری مرکز سا بنا تھا۔ ایک طرف پارک تھا اور سامنے قطار میں تین اونچے اونچے ہوٹل کھڑے تھے۔ وہ تار ایک ہوٹل تک جا رہی تھی۔ ایڈم تیز تیز قدم اٹھاتا اس کے پیچھے چلتا آیا۔
ہوٹل کی عقبی دیوار سے گزرتی وہ پیچھے اس طرف چلی گئی جہاں کمروں کی عقبی کھڑکیاں تھیں اور اسپلٹ یونٹس لگے تھے۔ ایڈم نے گردن اٹھا کے دیکھا۔ وہاں تار کو مہارت سے پینٹ کر دیا گیا تھا اور وہ بالکل ڈھکی چھپی نظر آ رہی تھی۔ لیکن وہ اتنا دیکھ سکتا تھا کہ وہ پانچویں منزل کے ایک کمرے کی دیوار تک جا کے غائب ہو گئی تھی۔ یقیناً دیوار میں کوئی سوراخ کر کے اسے کمرے کے اندر گھسایا گیا تھا۔
تعاقب یہاں تک ختم ہو جاتا تھا۔ اب آگے وہ کیا کر سکتا تھا؟ احتیاط سے کمرے کی پوزیشن نوٹ کی اور پھر ہوٹل کے اندر چلا آیا۔ سنجیدہ شکل بنائے سیدھا

Google

اوپر گیا۔ پانچویں منزل پہ آ کے وہ اس طرف آیا جہاں وہ کمرہ تھا۔ بند دروازے پہ ڈونٹ ڈسٹرب کا سائن لگا تھا۔ وہ ابھی متامل سا وہاں کھڑا ہی تھا کہ سامنے ٹرالی دھکیلتے ہوئے بیرا چلا آ رہا تھا۔

"کچھ چاہیے آپ کو سر؟"

"ہاں وہ...." ایڈم گڑبڑایا۔ "یہ لیانہ صابری صاحبہ کا کمرہ ہے؟" جلدی میں یہی نام ذہن میں آیا۔

"سر یہ ہوٹل کا پریزیڈینشل سوئیٹ ہے، یہاں خاص مہمان ٹھہرا کرتے ہیں اور ہم ان کی معلومات یوں نہیں دے سکتے۔"

"اوکے اوکے فائن۔ مجھے شاید چوتھے فلور پہ جانا تھا۔" وہ جلدی سے کہتا تیزی سے لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

ہوٹل سے نکلتے ہی اس نے قدم ایک بجلی کے کام والی دکان کی طرف بڑھا دیے۔ وہ آتے وقت کیاری میں دبی تار کے سرے کا ایک بالشت بھر لمبا ٹکڑا کاٹ لایا تھا۔ دکان میں جاتے ہی اس نے وہ سیاہ سانپ جیسا ٹکڑا کاؤنٹر پہ رکھا۔

"یہ کس چیز کی تار ہے؟" لگی لپٹی کے بغیر پوچھا۔

"یہ کیبل کی تار ہے۔ بلکہ...." سیلز مین نے الٹ پلٹ کے بغور جائزہ لیا۔ "ایک منٹ۔" اس نے چاقو سے تار کو کاٹا اور اندر لگی رنگ برنگی پتلی تاروں کو علیحدہ کیا۔

"یہ ایتھرینٹ کیبل ہے، سر۔ اس کو باہر سے موٹا سیاہ خول چڑھا کے کیموفلاج کیا گیا ہے۔"

ایڈم نے گہری سانس لی۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کس چیز کی تار تھی اور وہ "برڈ واچر" (پرندے دیکھنے والا) اس تار کے ذریعے سارا سارا دن اس گھر میں بیٹھ کے کیا دیکھتا تھا۔

کم سے کم پرندے نہیں۔

"مجھے ایک ڈی وی آر ادھار پہ مل سکتا ہے؟" اس نے معصوم شکل بنا کے پوچھا تھا۔

☆☆☆

اس کے دونوں ہاتھ بے جان سے گود میں دھرے تھے اور وہ گھٹنے ملائے شل سی دوزانو بیٹھی تھی۔ سامنے کھڑا ذوالکفلی اس کی طرف پشت کیے دیا سلائی رگڑ رہا تھا۔

"تو آپ شکار بازوں کے سربراہ ہیں۔ اتنے برس گزر گئے اور مجھے کبھی پتا نہیں چل سکا۔" وہ جیسے صدمے میں تھی۔

"پتا چلنا ضروری بھی نہیں تھا۔ میں نے اپنا کام کرنا تھا اور تم نے اپنا۔" دیا سلائی رگڑنے سے آگ کا بھڑکتا ہوا ننھا سا شعلہ جل اٹھا۔ ذوالکفلی جھکا اور دیوار پر نصب سیڑھیوں کی مانند اسٹینڈ کی آخری شیلف پہ رکھی موم بتی کو سلگایا۔

"آپ جانتے تھے کہ میں کون ہوں؟" اس نے گلہ آمیز نظروں سے اس کی پشت کو دیکھا۔

"تم پندرہویں صدی کے ملاکہ کی شہزادی تالیہ بنت مراد ہو۔ جس نے بعد میں اپنا نام تاشہ رکھا تھا۔"

"تاریخ کی کتابوں میں مجھے تالیہ کی بڑی بہن لکھا جاتا ہے۔ اگر آپ کو حقیقت معلوم ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ بھی وقت کے مسافر رہے ہیں۔"

"نہ صرف میں وقت کا مسافر ہوں بلکہ اپنے زمانے کے وقت کے مسافروں کی یادداشتیں میرے پاس محفوظ ہوتی ہیں۔ کیا اب ہم اس شخص کی بات کریں جس کی بات تم کرنے آئی ہو؟" وہ جھک کے ایک ایک موم بتی جلا رہا تھا۔ موم بتیاں خوشبو دار تھیں۔ دھیرے دھیرے چہار سو ربری کی خوشبو پھیلنے لگی۔

"وان فاتح.... آپ کے پاس کیوں آیا تھا؟"

وہ سیدھا ہوا اور پھونک مار کے دیا سلائی بجھائی۔ پھر تالیہ کی طرف پلٹا اور ہلکا سا مسکرایا۔

"اپنی یادداشت کے بارے میں سوال کرنے؟"

"کیا اس کی یادداشت واپس آ سکتی ہے؟" وہ بے قراری سے آگے ہوئی۔ لمحے بھر کو دل دھڑکنا

Google

بھول گیا تھا۔
"میں تمہیں وہی بتاؤں گا جو اس کو بتایا تھا۔ وہ بوتل دیکھ رہی ہو؟" ذوالکفلی نے نظریں تالیہ پہ جمائے رکھے انگلی سے شیلف کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی نگاہیں اسی طرف اٹھیں۔ وہاں شیشے کی ننھی بوتلیں رکھی تھیں۔ ان میں سفید دھوئیں جیسا مائع بھرا تھا۔
"ان میں سے پہلی والی وان فاتح کی ہے۔ اس کی یادداشت وقت کی قید میں ہے۔ جس دن اسے تین سوالوں کا جواب مل جائے گا' یہ بوتل خالی ہوجائے گی۔"
"کون سے تین سوال؟" وہ یک ٹک ان ننھی بوتلوں کو دیکھ رہی تھی۔
"کوئی کام کرنے کا سب سے اہم وقت کون سا ہوتا ہے؟ انسان کی زندگی میں سب سے اہم کام کون سا ہوتا ہے؟ اور انسان کی زندگی میں سب سے اہم شخص کون ہوتا ہے؟"
"یہ کیسے سوال ہوئے؟ کاموں کے مختلف وقت ہوتے ہیں' اور سب کی زندگی کے ترجیحی کام بھی مختلف ہوتے ہیں۔ اور شخص...." اس نے اچنبھے سے ذوالکفلی کو دیکھا۔ "ہر ایک کا اہم شخص دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔"
"نہیں پتری تالیہ۔ ان سوالوں کے جواب سب کے لیے ایک ہی ہیں۔ اس کو یہ جواب معلوم تھے۔ مگر معلوم ہونا کافی نہیں۔ جس دن وہ ان کی حقیقت قبول کرلے گا' اس کی یادداشت واپس آجائے گی۔ تم اس کی خود سے مدد کرو تو یہ الگ بات ہے' مگر وہ مدد نہیں مانگ سکتا۔ لیکن یہ جواب اسے خود ڈھونڈنے ہوں گے۔"
"مگر میری یادداشت .... وہ کیوں ٹکڑوں میں واپس آنے لگی تھی؟ جب میں پہلی دفعہ کے ایل کے ائیر پورٹ پہ تھی تو مجھے وژن نظر آنے لگے تھے۔ مگر وہ مستقبل کے تھے۔ ماضی کے نہیں۔"
"سچے خواب دیکھنا تمہارا ذاتی گفٹ ہے۔ یہ ہر وقت کے مسافر کے پاس نہیں ہوتا۔ میرے پاس بھی نہیں ہے۔ البتہ اس کا اتنے سال بعد واپس آنا اس بات کی نشانی تھا کہ تم نے ائیر پورٹ پہ کچھ ایسا ضرور کیا تھا جس نے تمہارے دل کو کسی ایک سوال کی حقیقت سمجھا دی تھی۔ اس کی وجہ سے تمہارے دماغ پہ لگی وقت کی زنجیر کی چند کڑیاں کھل گئی تھیں۔ مگر مکمل یادداشت اس لیے واپس نہیں آئی کیونکہ تم نے باقی دو سوالوں کے جواب نہیں سمجھے۔"
"مجھے نہیں یاد اس روز میں نے کیا کیا تھا۔" تالیہ نے جھرجھری لے کر سر جھٹکا اور دوبارہ سے شیلف پہ رکھی بوتلوں کو دیکھا۔ "ان میں سے میری یادداشتیں کس بوتل میں محفوظ ہیں؟"
ذوالکفلی اس کو دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ "اس سوال کا کوئی فائدہ نہیں' پتری تالیہ۔"
اس نے ذوالکفلی کو دیکھا تو آنکھیں بھیگنے لگیں۔ "کیا آپ فاتح کو بغیر جواب ڈھونڈے اس کی یادداشتیں واپس نہیں کرسکتے ہیں؟ کیا یہ سب کرنا ضروری ہے؟ میں بہت تکلیف میں ہوں۔ وہ خود تکلیف میں ہے مگر اس کو علم نہیں۔"
"ہر جادو کی قیمت ہوتی ہے جو چکانی پڑتی ہے۔"
ذوالکفلی نے نرمی سے شانے اچکا دیے۔ ایک دم ہوا کا جھونکا آیا اور موم بتی بجھ گئی۔ تالیہ کی امیدوں کا دیا بھی جیسے ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ وقت میں سفر کی قیمت بہت بھاری تھی۔

☆☆☆

ملاکہ کی صبح باسی ہو رہی تھی۔ دھوپ نکل آئی تھی اور حبس ہونے لگا تھا۔ وہ سرخ حویلی میں داخل ہوئی تو راہ داری پار کرتے ہی برآمدے میں لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھا ایڈم نظر آیا۔ اسے دیکھ کے وہ جوش سے اٹھا۔ جیسے کچھ بتانے والا ہو' پھر اس کا تھکا تھکا چہرہ دیکھ کے رکا۔
"آپ کو ملا وہ گھر؟"
"ہاں۔ اور شکاری بازوں کا سربراہ بھی مل گیا۔"

Google

اس نے پست لہجے میں مختصراً رواداد سنائی۔ ساتھ ساتھ وہ بے دلی سے اپنی چیزیں بھی اکٹھی کر رہی تھی۔

''اوہ۔ تو کیا تھے وہ تین سوال؟''

''ایڈم میں ابھی بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ عثمان نے واپس بلوایا ہے۔ آفس میں کوئی مسئلہ ہو گیا ہے۔ مجھے فلائیٹ پکڑنی ہو گی۔ تم آ رہے ہو؟''

''نہیں۔ میں....'' وہ پھر جلدی سے لیپ ٹاپ اس کی طرف پھیرتا بتانے لگا۔ ''یہ دیکھیں مجھے کیا ملا۔''

ہینڈ بیگ میں چارجر وغیرہ ڈالتی تالیہ نے مڑ کے اچٹتی نظر اس پہ ڈالی۔ اسکرین پہ ویڈیو کھلی تھی۔ ایک پرتعیش کمرے کا اندرونی منظر جہاں نفاست سے بیڈ بنے تھے اور خالی صوفے دکھائی دے رہے تھے۔

''وہ تار ایتھرنیٹ کیبل تھی جو ایک قریبی ہوٹل کے ایک کمرے کے اندر جاتی ہے اور وہاں کوئی خفیہ جاسوسی کیمرہ نصب ہے۔ کسی بلب یا گلدان وغیرہ میں۔ یہ انتہائی ہائی ڈیفینیشن کیمرہ ہے۔ جو آدمی یہاں رہتا تھا یقیناً اس نے یہ تار لگائی تھی تاکہ اس کمرے کے مکین پہ نظر رکھ سکے۔''

''اوہ۔ میں تمہیں بتانا بھول گئی۔ صبح میں نے فاتح صاحب کو میسج کر کے پوچھا تھا اس برڈ واچر کے بارے میں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ وہ کسی خفیہ سرکاری ایجنسی کا کارندہ تھا اور اسے کسی ہوٹل میں کسی پہ نظر رکھنے کے لیے یہ گھر چاہیے تھا۔ کوئی ہیروئن اسمگلر تھا شاید جو اس کمرے میں رہائش پذیر تھا۔''

''چلو جی۔'' ایڈم کے کندھے ڈھلک گئے۔ ''آپ مجھے صبح بھی بتا سکتی تھیں۔''

''مگر ایڈم وہ بندہ تو سال پہلے پکڑا گیا اور اس کمرے میں اب تو وہ رہتا بھی نہیں ہے۔ عصرہ کو معلوم نہ تھا مگر یہ گھر میرے پاس ہے تو میرے پوچھنے پہ فاتح صاحب نے صاف صاف بتا دیا۔''

''ہاں مگر کیمرہ تو اس نے نہیں اتارا نا۔ کیمرہ تو موجود ہے۔''

''ایڈم تم فضول میں وقت ضائع کر رہے ہو۔ اس کمرے میں! کوئی نیا آدمی آ کے ٹھہرتا ہو گا۔ تم اس پہ نظر رکھ کے کیا کرو گے۔'' اس نے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے بے زاری سے کہا تھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔ کچھ سوالوں کے جواب صرف وقت دے سکتا ہے مگر چہ تالیہ میں بتا رہا ہوں اس کمرے میں کچھ ہے۔''

''اوہ ایڈم' تم....''

''آپ کو دیر ہو رہی ہے۔'' وہ بے مروتی سے کہہ کے دوبارہ اسکرین کے سامنے جم گیا۔ تالیہ نے افسوس سے اسے دیکھ کے سر جھٹکا اور بیگ اٹھا کے مڑ گئی۔

''جتنی جاسوسی کرنی ہے اس خالی کمرے کی' کر لو۔ ایک ہفتے بعد میں اس گھر کو واپس کر رہی ہوں۔'' خفگی سے پکارتی وہ اب باہر جا رہی تھی۔ ایڈم ڈی وی آر سے جڑی سیاہ تار اور لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھا اب پوری دل جمعی سے اس کمرے کو دیکھ رہا تھا۔

وہ خالی تھا.... نہ کوئی حرکت' نہ کوئی ذی نفس۔ صرف ایڈم بن محمد کا ''یقین'' تھا جو اس کے ساتھ تھا۔ کچھ تو ہے اس کمرے میں۔

☆☆☆

داتن نے ہلکا سا مسکرا کے اسے دیکھا۔ وہ ملاکہ سے سیدھی یہاں آ گئی تھی اور صبح سے آفس میں تھی۔

''میں نے او پو ریسرچ شروع کر دی ہے۔'' دفعتاً داتن اس کے قریب ہوئی اور سرگوشی کی۔ تالیہ نے چونک کے مگ نیچے کیا۔ احتیاط سے ادھر ادھر دیکھا۔

''کچھ معلوم ہوا؟'' آہستہ سے پوچھا۔

''ابھی اتنی جلدی کہاں؟ البتہ....'' داتن مزید نزدیک کھسکی۔ ''اس کی بیٹی آرمانہ کا معاملہ مجھے

Google

مشکوک لگتا ہے۔ کچھ ہے جو وان فاتح چھپا رہا ہے۔"
تالیہ کی پیشانی کی سلوٹیں سیدھی ہوئیں۔
"میں جانتی ہوں۔" اور گہری سانس بھری۔
"آریانہ کا راز وہ مجھے بتا چکے ہیں۔"
داتن نے اپنی موٹی موٹی آنکھوں میں خفگی بھرے اسے دیکھا۔ "تو تم مجھے ابھی بتادو۔"
"پہلی بات' وہ راز ان کی امانت ہے۔ دوسری بات' تم اس کو اگر خود معلوم کرلوگی تو اس کا مطلب ہو گا کہ کوئی اور بھی اس کو ڈھونڈ سکتا ہے۔ اور تب ہمیں کاؤنٹر اسٹریٹجی بنانی ہو گی۔ فی الحال تم بس اس کو ڈھونڈو۔" اس نے داتن کا کندھا تھپکا اور مگ لیے آگے بڑھ گئی۔
"تالیہ...." داتن نے سوچتی نظروں سے اسے پکارا تو وہ گھونٹ بھرتی مڑی۔ "ہوں؟" ابرو اچکا کے استفسار کیا۔
"ملاکہ میں اس رات کیا ہوا تھا؟ کس چیز نے تمہیں ایک رات میں اتنا بدل دیا ہے؟" وہ جیسے ابھی تک اچنبھے میں تھی۔
شہزادی تاشہ بنت مراد راجہ چند لمحے اداس مسکراہٹ کے ساتھ لیانہ صابری کو دیکھتی رہی۔ پھر کندھے اچکا دیے۔
"میں نے ان سے ساتھ رہنے کا وعدہ کرلیا تھا' اور مجھے وعدے نبھانے نہیں آتے تھے مگر اب سیکھ رہی ہوں۔" اور پھر آگے بڑھ گئی۔
تالیہ واقعی بدلتی جا رہی تھی۔ یہ شان بے نیازی، یہ تمکنت پہلے اس کے وجود کا حصہ نہیں تھی' مگر یہ اندر تک اترتی اداسی.... یہ داتن کا دل کاٹ دینے والی اداسی بھی اس کی آنکھوں میں پہلے نہیں ہوا کرتی تھی۔ آخر ایسا کیا ہوا تھا جو وہ اتنی بدل گئی تھی؟
مگر خیر.... تن باؤ کے گھر اس رات تالیہ بامشکل ایک گھڑی رکنے کے بعد ایڈم کے ساتھ باہر آتی دکھائی دی تھی۔ محض ایک گھڑی میں کتنا کچھ ہو سکتا ہے؟ داتن نے سارے واہموں کو سرے سے جھٹک دیا اور کیبنٹ کی طرف مڑ گئی۔
ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ عوام کا پیسہ چوس جانے والی سیاسی پارٹی کے دفتر میں کھانے کے لیے کیا کیا پڑا ہے۔ وہ اب چمکتی آنکھوں سے ایک کے بعد ایک کیبنٹ کھول رہی تھی۔

☆☆☆

وہ شام گہری ہو کے رات میں بدل گئی تھی۔ سارے دن کا منظر نامہ اس پریس کانفرنس کے بعد جہاں بدلا' وہاں کانفرنس روم میں وان فاتح سے ملنے کے لیے آنے والوں کا رش لگ گیا۔ شہر کے مختلف حصوں سے پارٹی ورکرز آرہے تھے اور اس کے جرات مندانہ قدم کے ساتھ اظہار یکجہتی کر رہے تھے۔
وہ کانفرنس روم میں لوگوں کے رش کے درمیان بیٹھا تھا۔
عثمان سب ملاقاتیوں کے درمیان معاملات کو ترتیب دیتا اچھا خاصا کھپ چکا تھا۔ اس نے دوپہر سے کافی تک نہیں پی تھی اس لیے درمیان میں اپنی جگہ کسی اور کو کھڑا کر کے وہ باہر چلا آیا۔ آفس کی لفٹ میں سوار ہو کے وہ نیچے مال تک آیا اور کافی شاپ سے جا کے کافی خریدی۔ فی الحال خود میں کافی بنانے کی ہمت نہیں تھی۔
سینڈوچ کھاتا' کافی دوسرے ہاتھ میں پکڑے وہ واپس باہر آیا تو لفٹ کے دروازے کھلتے ہی سامنے ریسپشن پہ بیٹھی پارٹی ورکر نے اسے دیکھ کے مسکرا کے ہاتھ ہلایا۔
"تم نے بتایا ہی نہیں عثمان!" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کے خوشگوار حیرت سے بولی۔ وہ حیران سا قریب آیا۔
"کیا؟"
"کہ تمہارے ہاں بیٹا ہوا ہے۔ مبارک ہو۔"
عثمان چند لمحے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر نفی میں سر ہلایا۔ "میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔ یہ کس نے کہا ہے؟"

"اوہ۔ میں نے سنا ہے ابھی آفس میں۔" وہ حیران سی وضاحت دینے لگی تھی۔

لاؤنج میں وہ کافی کا گلاس لیے آ کے بیٹھا ہی تھا کہ دو کولیگز اس کے قریب آ رکے۔

"مبارک ہو عثمان۔ اللہ تمہیں بیٹا مبارک کرے۔"

وہ گردن اٹھا کے بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگا۔

"یار میری شادی بھی نہیں ہوئی ابھی۔"

"عثمان ..... بہت مبارک ہو۔ مٹھائی کہاں ہے؟" باہر کی طرف جاتے ہوئے ایک سینئر سیاستدان نے اسے روک کے کہا تو اس نے ضبط سے گہری سانس لی۔

"سر کسی دوسرے عثمان کا بیٹا ہوا ہوگا' میرے ہاں ایسی کوئی خوشخبری نہیں ہے۔"

کافی ختم کر کے کانفرنس روم کی طرف جانے لگا تو راستے میں وان فاتح کے آفس کا کھلا دروازہ نظر آیا۔ آفس خالی تھا صرف تالیہ اندر کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کے مسکرا کے ہاتھ ہلایا۔ عثمان چکرا کے رہ گیا۔ پھر تیزی سے چوکھٹ تک آیا اور بے چارگی سے پھٹ پڑا۔

"پلیز مجھے مبارکباد مت دیجیے گا' پے تالیہ۔ میرے ہاں کوئی بیٹا نہیں ہوا۔ یہ خبر غلط ہے۔" بے بسی سے اطلاع دے کر وہ مڑنے لگا جب تالیہ کی آواز آئی۔

"خبر غلط ہو تو بھی کتنی جلدی پھیلتی ہے نا عثمان؟"

واپس مڑتے عثمان کے قدم زنجیر ہوئے۔ یہ ٹھنڈی' بے رحم آواز تالیہ کی تھی مگر انداز .... وہ اس انداز سے نا آشنا تھا۔ دھیرے سے وہ ایڑیوں پہ واپس گھوما۔

فاتح کی میز کے کنارے پہ وہ بیٹھی تھی۔ پھول دار رومال گردن میں باندھے' اونچی سنہری پونی والی تالیہ مسکرا کے اسے دیکھ رہی تھی۔ فضا میں کچھ ایسا تھا جو غلط تھا۔

"جی؟" عثمان نے پتلیاں سکوڑ کے اسے دیکھا۔ پھر ہاتھ پیچھے کر کے دروازہ بند کیا۔ ایک دم سارے آفس کا شور اور ہنگاموں کی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ اب وہاں صرف وہ دونوں موجود تھے۔

"صرف ایک شخص کو کہا میں نے کہ عثمان کا بیٹا ہوا ہے اور کسی نے وضاحت نہیں مانگی۔ یقین کر لیا۔ کارپوریٹ ورلڈ میں خبریں کتنی جلدی پھیل جاتی ہیں عثمان" عثمان نے کن اکھیوں سے کھڑکیوں کو دیکھا۔ بلائنڈز بند تھے۔ فاتح ان کو کھول کے رکھتا تھا۔ وہ تالیہ نے بند کیے تھے۔ وہ اس ملاقات کے لیے کمرے کو تیار کر چکی تھی۔

"پے تالیہ.... میں سمجھا نہیں۔" اسے غور سے دیکھتے احتیاط سے الفاظ ادا کیے۔

"وان فاتح سمجھتے ہیں کہ جو آدمی اتنا عرصہ ساتھ کام کرے اس کو نکالنا نہیں چاہیے۔ لیکن میں یہ سمجھتی ہوں کہ اگر اسے نکال بھی دو اور وہ جا کے کسی کو اپنے باس کا راز بتا بھی دے تو اسے whistle blower کہا جائے گا۔ آج اگر میں ایک آفس میں سرگوشی میں بھی کہوں کہ..... (اپنے ہونٹوں کے گرد ہاتھوں کا پیالہ بنا کے سرگوشی میں بولی) عثمان وسل بلوور ہے (باس کا راز کھولنے والا) تو تم دیکھنا (ہاتھ واپس نیچے گرا دیے اور آواز بلند کر لی) کہ تمہیں سارے شہر میں کوئی جاب نہیں دے گا۔ خبر بہت جلدی پھیلتی ہے یہاں' عثمان۔"

"میں نے کچھ نہیں کیا۔" اس کے ماتھے پہ بل پڑے اور جبڑا بھنچ گیا۔

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے تنفر سے بولی۔

"تم اشعر کے لیے کام کرتے ہو۔ تم اشعر کے آفس بھی جاتے ہو۔ اور یو نو واٹ' فاتح صاحب کو سب معلوم ہے مگر ویڈیو والی بات ان کو نہیں معلوم۔"

Digitized by Google

''اول تو میں نے کچھ کیا ہی نہیں لیکن اگر آپ فاتح صاحب کو بتائیں گی بھی سہی تو کیا ثبوت دیں گی' ہاں؟'' وہ چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ کے بولا۔

میز کے کونے پہ بیٹھی تالیہ اٹھی اور مسکرا کے قدم قدم چلتی اس کے مقابل آرکی۔ ''تم نے ہی کہا تھا کہ ایسے معاملے ہمیں خود ہینڈل کرنے چاہئیں' فاتح صاحب کو درمیان میں نہیں لانا چاہیے۔ تو ٹھیک ہے۔ نہیں لاتے۔'' اس نے نظریں عثمان پہ جمائے بازو پیچھے کیا اور میز پہ رکھا تہ شدہ کاغذ اٹھا کے سامنے کیا۔

''یہ تمہارا استعفیٰ ہے عثمان۔ اس میں لکھا ہے کہ تم زیادہ اچھی جاب کی تلاش میں بہت افسوس سے یہ جاب چھوڑ رہے ہو۔ اسے سائن کردو۔''

عثمان کی آنکھوں میں سرخی اترنے لگی۔ وہ اسے گھورتے ہوئے غرایا۔ ''اور اگر میں ایسا نہ کروں تو؟''

''تو میں سرگوشی کروں گی کہ تم وسل بلوور ہو اور بٹن کیمرہ کوٹ پہ لگائے تمہاری پارٹی کی تصاویر لیک کردوں گی۔ اللہ کی قسم' تمہیں سارے شہر میں کوئی اپنا سیکرٹری نہیں رکھے گا۔ یہ تو طے ہے کہ اس آفس میں آج تمہاری آخری شام ہے۔'' وہ کاغذ بڑھائے چبا چبا کے کہہ رہی تھی۔ ''اب تمہارے پاس دو راستے ہیں۔ عزت سے استعفیٰ دے دو تو میں تمہیں وان فاتح سے ریکمنڈیشن لیٹر لکھوا دوں گی اور تمہیں اچھی جگہ مل جائے گی۔ یا پھر واقعی میں وسل بلوور بن جاؤ اور فاتح صاحب کے دشمنوں کے پاس جا کے ان کے راز اگلنے لگو۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔''

عثمان نے ایک خشمگیں نگاہ اس کے بڑھے ہاتھ میں پکڑے کاغذ پہ ڈالی اور پھر جھپٹ کے کاغذ کھینچا' اسے کھولا اور اوپر لے جا کے سطور پڑھیں۔ اس کے اندر باہر کڑواہٹ گھلتی جارہی تھی۔

پھر وہ میز تک جھکا۔ کاغذ کو میز کی سطح پہ رکھا اور قلم کھینچ نکالا۔ پھر جھک کے اس پہ دستخط گھسیٹے اور تالیہ کی طرف مڑا۔ وہ اب اس کی طرف گھوم چکی تھی۔

''ایک ماہ کا بونس اور جاب ریکمنڈیشن لیٹر۔ مجھے دونوں چاہئیں۔''

''ڈیل۔'' وہ مسکرادی۔

''اور ایک بات میں آپ کو بتا دوں' جے تالیہ!'' اس نے استعفیٰ زور سے اس کے ہاتھ میں تھمایا اور چبا چبا کے بولا۔ ''آپ وان فاتح کی کنگ میکر بنتی جارہی ہیں اور آج تو سب نے آپ کو نوٹس کرلیا۔ سیاسی پارٹی میں نوٹس میں آجانا بڑی خطرناک بات ہوتی ہے' جے تالیہ۔''

تھوڑی دیر بعد وہ اشعر کے آفس میں بیٹھا بے بسی بھرے غصے سے روائیداد سنا رہا تھا۔ اشعر کنٹرول کرسی پہ بیٹھا مسکرا کے سن رہا تھا۔ پھر ستائشی انداز میں ابرو اچکائے۔

''جے تالیہ میری امید سے زیادہ گٹس والی ہیں۔ انٹرسٹنگ۔'' پھر مسکرا کے آگے ہوا اور تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ ''تم فکر نہ کرو' میں بھی تمہیں ریکمنڈیشن لیٹر لکھ دوں گا۔ یہ ایک باعزت ایگزٹ ہوگی تمہارے لیے۔''

''میرے لیے ویسے بھی اب یہاں کام مشکل ہوگیا تھا۔'' وہ برہمی اور مایوسی کے ملے جلے تاثرات سے کہہ رہا تھا۔

☆☆☆

جدید ملاکہ کے اس ہوٹل کی لابی میں معمول کی چہل پہل تھی۔ ایسے میں ایڈم ایک دفعہ پھر ہوٹل میں داخل ہو رہا تھا۔ صبح کے برعکس اس وقت وہ نروس دکھائی دیتا تھا۔ اس نے سوٹ پہن رکھا تھا جو ادھار مانگا لگتا تھا۔ اور بار بار ٹائی درست کرتا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

لابی عبور کرکے وہ اندازے سے اس طرف آیا جہاں ہوٹل کے باتھ رومز بنے تھے۔ ایک باتھ روم میں جلدی سے گھسا اور دروازہ بند کیا۔ پھر اندر آکے آئینے کے سامنے کھڑا ہوا اور کوٹ اتارا پھر سیاہ ٹائی اتار دی اور جیب سے سیاہ پٹی نکال کے کالر پہ

Digitized by Google

Bow بنا کے گرہ باندھی۔ سفید شرٹ' سیاہ پینٹ اور سیاہ 'بو' کے باعث اب وہ ایک دم سے ویٹر لگنے لگا تھا۔ نیم پلیٹ بھی لگائی تھی۔

پھر اس نے دو تہ شدہ تولیے اٹھائے اور سر جھکا کے باہر نکلا۔ پھر یونہی ویٹرز کی طرح چلتا سر نیہوڑائے آ گیا۔ ایک موڑ مڑا تو سامنے سروس رومز تھے۔ سنجیدہ شکل بنائے اندر داخل ہوا وہاں چند بیرے اور یونیفارم والی ملازمائیں کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ایک ریک کے سامنے کھڑا ہو گیا اور بظاہر تولیے اور صابن درست کرنے لگا۔

کمرے میں دوسرے لوگ بھی تھے' اور یوں لگتا تھا کہ کوئی مسلسل اسے دیکھ رہا ہے۔ ایک دو دفعہ ڈر کے دیکھا بھی سہی مگر سب اپنے کام میں مگن تھے۔ یہ شفٹ کے بدلنے کا وقت تھا اور ویٹرز اپنے لاکر سے سامان نکال کے گھر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ایڈم کے ہاتھ کپکپانے لگے۔ کہیں کوئی پکڑ نہ لے۔ پھر جلدی سے ایک اسٹاف باتھ روم کی طرف آیا اور دروازہ بند کر کے تالیہ کو کال ملائی۔

وہ اس وقت آفس کے ایگزیکٹو کچن میں کھڑی برنر پہ ساس پین میں پانی ابلتے دیکھ رہی تھی۔ چائے کے پتے ساتھ رکھے تھے۔ فون بجا تو اس نے موبائل کان سے لگایا۔

''ہاں شرلاک.... کہاں پہنچی تمہاری تفتیش؟'' محظوظ انداز میں پوچھا۔ خلاف توقع اس نے برا نہیں منایا۔ پریشان لگتا تھا۔

''ہے تالیہ۔ میں بھیس بدل کے ایک کمرے میں موجود ہوں اور مجھے لگ رہا ہے کہ کوئی مجھے مسلسل دیکھ رہا ہے۔''

''ریلیکس ایڈم۔ کوئی نہیں دیکھ رہا تمہیں۔''

''اف میری جان نکل رہی ہے۔ اگر کوئی میرے سر پہ آ گیا اور کچھ پوچھنے لگا تو میں کیا کروں گا؟ آپ کی بری صحبت کا اثر ہے جو میں بھی لوگوں کو Con کرنے لگ گیا ہوں۔''

''کسی کو Con کرنے کا سارا آرٹ اسی لفظ Con میں چھپا ہے۔ Con یعنی کانفیڈنس' ایڈم! تم جتنے اعتماد سے کردار نبھاؤ گے اتنے کامیاب ہو گے۔''

وہ اب پتے اندر جھونک رہی تھی۔ قدموں کی چاپ سنائی دی تو بالکل نہیں مڑی۔ جانتی تھی پیچھے کون ہے' جس کو چائے کی طلب ہو رہی ہے۔

''وہ تو ٹھیک ہے مگر مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ کون مجھے دیکھ رہا ہے؟''

''اگر تمہیں یہ معلوم کرنا ہے کہ مجمع میں سے کون تمہیں دیکھ رہا ہے تو جمائی لو۔''

''ہیں؟'' وہ حیران ہوا۔

''جمائی contagious ہوتی ہے۔ کسی کو لیتے دیکھ کے ہمیں بھی آنے لگتی ہے۔ تمہیں دیکھنے والے کو دور سے بھی تمہیں جمائی لیتے دیکھ کے جمائی آئے گی۔ اور تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کون تمہیں گھور رہا ہے۔''

فون رکھ کے گردن موڑی تو فاتح چوکھٹ سے ٹیک لگائے' سینے پہ بازو لپیٹے مسکرا کے اسے دیکھ رہا تھا۔ ''جمائی؟ سیریسلی؟''

''یو سی.... میں کچھ لوگوں کی ٹیچر بھی ہوں۔'' مسکرا کے شانے اچکائے اور واپس چائے کی طرف پلٹ گئی۔ اس نے بازو نیچے کیے اور قدم قدم چلتا قریب آیا۔

وہ راہ داری میں آگے بڑھ رہی تھی کہ اشعر کے آفس سے نکلتے ایک آدمی کو دیکھ کے رکی۔ وہ سوٹ میں ملبوس باوقار سا آدمی فائل اٹھائے نکل رہا تھا۔ تالیہ ٹھہر گئی۔ یک ٹک اس کو دیکھنے لگی۔ ابھی چند روز قبل تو اس نے اس آدمی کو خواب میں دیکھا تھا۔ وہ اپنے آفس میں کھڑا شیشے کی دیوار سے نظر آ رہا تھا اور تالیہ راہ داری کی شیشے کی دیوار پہ زرد پوسٹرز چسپاں کر رہی تھی۔ جھماکے کی طرح اسے یہ منظر یاد آیا۔

وہ آدمی اشعر سے آخری بات کہہ کے باہر نکلا تو تالیہ کو وہاں کھڑے دیکھا۔ ذرا سا مسکرایا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ گردن موڑ کے اسے دیکھتی چوکھٹ تک

Digitized by Google

چلی آئی۔ اشعر جو کرسی پہ ٹیک لگائے تنہا سا بیٹھا تھا' سیدھا ہوا۔

"جی تالیہ۔"

"یہ.... کون صاحب تھے؟"

"یہ ادیب بن سو ہیں۔ معروف سیاست دان۔ کچھ دن پہلے امریکہ گئے تھے۔ آج ہی واپس آئے ہیں۔ اب یہ آپ کو اکثر یہاں نظر آئیں گے۔" اشعر مسکرا کے بتا رہا تھا۔ وہ 'ہوں' کر کے سوچتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اشعر بے اختیار جگہ سے اٹھ گیا۔

"آپ نے کبھی بتایا نہیں اپنی شادی کا.... اور اپنی ڈائیورس کا۔" شائستگی سے پوچھا تو وہ ہلکا سا مسکرائی۔

"آپ نے کبھی پوچھا ہی نہیں۔" وہ میز کے دوسرے سرے پہ اس کے مقابل آ کھڑی ہوئی تھی۔ ایک ہاتھ سے بیگ کا اسٹریپ تھام رکھا تھا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

"ویل.... آپ گھر جا رہی ہیں؟"

"تھوڑی دیر تک۔ بس ڈسپنسر کی طرف جا رہی تھی پانی پینے تو ان صاحب کو دیکھ کے رکی۔"

"میرے آفس کا پانی زیادہ صاف ہے۔" وہ مسکرا کے کہتا میز کے پیچھے سے نکلا اور سائیڈ ٹیبل تک آیا۔ ٹھنڈی بوتل فریج سے نکالی اور واپس آ کے اسے تھمائی۔

"شکریہ اشعر صاحب۔" اس نے مسکرا کے بوتل پرس میں رکھی۔ اور مڑنے لگی تو وہ جلدی سے بول اٹھا۔

"اگر آپ نے کھانا نہیں کھایا تو ہم ساتھ ڈنر کر سکتے ہیں۔ اصل میں کارنر پہ ایک بہت اچھا نیا ریسٹورانٹ کھلا ہے اور میں نے ان کا کھانا ابھی ٹرائی نہیں کیا۔ سوچ رہا تھا کہ آپ کا ٹیسٹ....."

"میں نو بجے وہاں پہنچ جاؤں گی۔ لوکیشن ٹیکسٹ کر دیجیے گا۔" وہ بات کاٹ کے بولی تو اشعر گنگ رہ گیا۔ اسے تالیہ سے اتنی جلدی ہامی بھرنے کی امید نہ تھی۔

وہ جس طرح آئی تھی' ویسے ہی چلی گئی۔ اور وہ خوش گوار حیرت میں گھرا رہ گیا۔

☆☆☆

ہوٹل کے اسٹاف روم میں ایڈم مسلسل جمائی لیتا ٹرالی پہ چیزیں جوڑ رہا تھا۔ کن اکھیوں سے وہ اطراف کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ سب اپنے اپنے کاموں میں لگے تھے۔ کوئی بھی جمائی نہیں لے رہا تھا۔ چہ تالیہ کو تو اللہ پوچھے۔

وہ ٹرالی دھکیلتا باہر نکلا ہی تھا کہ پیچھے سے گرج دار آواز آئی۔

"اے سنو.... تم کون ہو؟"

ایڈم نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس لی۔

(میں قدیم ملاکہ کے محلات میں سلطان بندا ہارا' شہزادی' ملکہ وغیرہ کے ساتھ چہل قدمی کرنے کا شرف حاصل کر چکا ہوں۔ اور تو اور میں وقت میں بھی سفر کر چکا ہوں اور وہ بھی اصل میں کیونکہ میری گردن پہ نہ مہر بنی نہ میری یادداشت کھوئی۔ تو تم کیا چیز ہو'ہونہہ)

اور پھر پورے اعتماد سے مڑا۔ سامنے فرنچ کٹ والا ہیڈ ویٹر کھڑا اسے گھور رہا تھا۔

"سر میری نائٹ شفٹ ہے آج۔ اور میں کب سے آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ آپ کو مینیجر صاحب اپنے آفس میں بلا رہے ہیں۔ وہاں ہنگامہ ہوا کھڑا ہے۔ آپ کے گھر سے کوئی خاتون بھی ہیں وہاں اور....." راز داری سے آواز آہستہ کی۔

"کسی ویٹرس کو بھی پیش ہونے کا حکم دیا ہے انہوں نے۔"

"کیا مطلب؟" وہ تعجب مگر ہلکی سی پریشانی سے بولا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ ایڈم نے گہری سانس لی اور جلدی سے ٹرالی دھکیلتا آگے بڑھ گیا۔

اسے عمر سے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ہیڈ ویٹر شادی شدہ لگتا ہے اور پھر بیویاں تو سب کی شکی ہوتی ہیں۔ تیر نشانے پہ لگا یا نہیں' اس کی خلاصی ہو گئی تھی۔

وہ پانچویں منزل پر آیا جہاں اس کمرے کا بند

Digitized by Google

دروازہ تھا جس کے اندر کیمرہ لگا تھا۔ ٹرالی اس نے ایک طرف رکھی۔ ماتھے پہ پی کیپ جمائی اور خاموشی سے آگے بڑھ کے فائر الارم بجادیا۔ پھر جلدی سے اوٹ میں ہوگیا۔

الارم زور زور سے چنگھاڑنے لگا۔ چند لمحوں میں یکے بعد دیگرے دروازے کھلے اور لوگ باہر بھاگنے لگے۔ ایڈم اوٹ سے دیکھنے لگا۔ دفعتاً مطلوبہ کمرے کا دروازہ بھی کھلا اور ایک نوجوان تیزی سے باہر آیا۔ ڈریس شرٹ اور پینٹ میں ملبوس وہ خوش شکل اور مہذب سا — نوجوان تھا۔ دوسرے مہمانوں کے ساتھ وہ بھی فائر ایگزٹ کی طرف بھاگا۔

اس کے جاتے ہی ایڈم تیزی سے اندر داخل ہوا اور دروازہ بند کیا۔ اس کے ہاتھ پھر سے کپکپانے لگے تھے۔ جلدی سے گلدان تک آیا اور اسے ایک طرف کیا۔ بلب میں لگے کیمرے کو فکس کیا تاکہ اب منظر درست نظر آئے۔ گڈ۔ پھر مڑا اور ادھر ادھر دیکھا۔ میز پہ چند کاغذات رکھے تھے۔ اس نے جلدی جلدی ان کو کھنگالا۔ وہاں کچھ خاص نہ تھا۔ وہ آدمی اپنا والٹ وغیرہ ساتھ لے گیا تھا۔ بریف کیس بھی لاکڈ تھا اور لیپ ٹاپ کو وہ اتنے کم وقت میں کھولنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کیا کرے؟

پھر ایک دم وہ گھوما۔ وہ فلاور بکے جو ہوٹل کے مہمانوں کے استقبال میں کمرے میں پہنچایا جاتا تھا وہ سامنے میز پہ رکھا سوکھ رہا تھا۔ ایڈم نے جھپٹ کے اس پہ رکھا کارڈ اٹھایا۔

''ہم مسٹر فہمی بن سلام کو خوش آمدید کہتے ہیں۔''
وہاں اس آدمی کا نام لکھا تھا۔ اس نے مسکرا کے نام ازبر کیا اور کارڈ واپس رکھ کے تیزی سے باہر نکلا۔ لوگ ابھی تک راہ داری میں بھاگتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ پی کیپ سر پہ ترچھی کیے رش کے درمیان گم ہوگیا۔

☆☆☆

وہ ریسٹوران سمندری غذا کھانے والوں کے لیے خاص بنایا گیا تھا، اندر سرخ مدھم سی روشنیاں بکھری تھیں اور ماحول کو خواب ناک اور پراسرار سا بنا رہی تھیں۔ فضا میں مچھلی اور تلے ہوئے جھینگوں کی خوشبو پھیلی تھی۔ بالائی منزل پہ شیشے کی دیوار کے ساتھ والی کرسی پہ اشعر محمود منتظر سا بیٹھا بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔

ادھر سوئی نو اور بارہ پہ آئی' ادھر سامنے گلاس ڈور دھکیلتی تالیہ اندر داخل ہوتی دکھائی دی۔ اس نے آتے کے ساتھ ہی گردن دائیں بائیں گھمائی۔ وہ اسی فراک' پھول دار رومال اور اونچی پونی والے حلیے میں تھی۔ سیاہ بڑا سا پرس بھی کہنی پہ تھا۔ اشعر پہ نظر پڑی تو ہلکا سا مسکرائی اور سیدھ میں چلتی آئی۔

وہ مسکرا کے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے لیے کرسی کھینچی۔ تالیہ نے نشست سنبھالی' پرس قدموں میں رکھا اور کہنیاں میز پہ رکھ کے بڑی فراغت سے اشعر کو دیکھا جواب سامنے بیٹھ رہا تھا۔

دونوں کے درمیان کانچ کی صراحی میں رکھا ایک تازہ سرخ گلاب حائل تھا۔ سرخ مدھم روشنیوں سے مزین ہال کے کونے میں وہ شیشے کی دیوار کے ساتھ میز کے دونوں اطراف اب بیٹھ چکے تھے۔

''آج آپ کے بارے میں بات کریں گے' تالیہ۔'' وہ مسکرا کے گویا ہوا۔ ''سو آپ کا ایکس ہزبینڈ کیا کرتا تھا۔''

ہتھیلی پہ تھوڑی رکھے تالیہ نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ ''آپ دونوں نے تھائی لینڈ میں ایک ایکسپورٹ پراجیکٹ ساتھ کیا تھا اور اس سے پہلے آپ اس سے سنگاپور کے سفر کے دوران ٹرین میں ملے تھے۔''

اشعر حیرت زدہ رہ گیا۔ ''آپ کے ایکس ہزبینڈ کو؟''

''نہیں اشعر صاحب۔ میں اس آدمی کی بات کر رہی ہوں جو گھائل غزال کی بولی لگا کے مسز عصرہ کو بدنام کرنے جا رہا تھا۔ جعفر صاحب' اس آدمی اور آپ کا کنکشن ڈھونڈ لیا ہے میں نے۔''

اشعر کی مسکراہٹ مدھم ہوئی۔ وہ بنا پلک جھپکے اسے دیکھتا ذرا پیچھے ہوا۔ "تالیہ میں سمجھا نہیں۔"

"اور اگر میں یہ ڈھونڈ سکتی ہوں تو یہ بھی جانتی ہوں کہ وان فاتح کو فنڈز کی کمی کا شکار کرنے اور سن بائو کا گھر بیچنے پہ مجبور کرنے والے بھی آپ ہیں۔ ان کی دکانوں میں آگ بھی آپ نے لگوائی تھی اور شیئرز کو ڈبونے میں بھی آپ کا ہاتھ تھا۔ ہمارا یہ ڈنر میرے بارے میں نہیں' آپ کے بارے میں بات کرنے کے لیے ہے' ایش!" ہتھیلی پہ چہرہ رکھے پلکیں جھپکا جھپکا کے اسے دیکھتی وہ کہہ رہی تھی پھر پرس میں ہاتھ ڈال کے ایک تہہ شدہ کاغذ میز پہ رکھا۔

اشعر چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ پھر ایک دم کھل کے ہنس پڑا۔

"اور بے تالیہ کو لگا کہ عبداللہ اور عثمان کے بعد وہ مجھ سے بھی استعفیٰ پہ دستخط کروالیں گی۔ نہیں نہیں تالیہ۔ اتنی جلدی نہیں۔" وہ ہنستے ہوئے نفی میں سر ہلا رہا تھا۔

"یو سی' میں عثمان نہیں ہوں جو چپ چاپ کاغذاتِ نامزدگی واپس لے لوں گا یا عبداللہ جس کو ڈرا دھمکا کے آپ وان فاتح سے معافی مانگنے پہ مجبور کر دیں گی۔" پھر آگے کو جھکا اور مسکرا کے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "میں اشعر محمود ہوں۔ میں..... کنگ میکر ہوں۔ میں ابھی جا کے وان فاتح کے سامنے ببانگِ دہل کہہ سکتا ہوں کہ یہ سب میں نے کیا ہے۔ اور وہ چپ رہیں گے۔ نہ وہ میرے خلاف پولیس میں جا سکتے ہیں۔ نہ پریس میں۔ خاندانی کی بدنامی ان کو لے ڈوبے گی۔ سو..... یو سی....." کندھے اچکائے۔

"میرے ساتھ یہ استعفوں پہ دستخط کروانے والے tantrums نہیں کام کریں گے۔"

وہ ابھی تک مسکرا کے دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"آپ نے شہزادی تاشہ والی کہانی سنی ہے' ایش؟"

"وہ بندا ہارا کی بیٹی؟ ہاں کورس میں پڑھی تھی۔"

"اس نے ابوالخیر نامی امیر اور بدعنوان سوداگر سے مسجد کے نام پہ چندہ لیا تھا۔ تاریخ کہتی ہے کہ اس کی نیت نیک تھی اور مسجد واقعی بنی تھی' مگر میں آپ کو بتاؤں ایش....."

مسکرا کے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "اسے نہ مسجد کی ضرورت تھی' نہ چندے کی۔ اسے اس طاقت کی ضرورت تھی جو ابوالخیر جیسے دولت مند آدمی کو اپنا حلیف بنانے پہ اسے ملنے والی تھی۔ یہ استعفیٰ نہیں ہے۔" اس نے کاغذ کھولا تو وہ کورا تھا البتہ اس کے اندر ایک اور ننھا کاغذ رکھا تھا جس کو دیکھ کے اشعر چونکا۔

"یہ....."

"میں نے فاتح صاحب سے کہا کہ ان کے گھر میں ایک خزانہ ہے جو الیکشن میں ان کے کام آئے گا۔ وہ کیوں گھر بیچیں یا قرضہ لیں؟ وہ اس خزانے کو استعمال کیوں نہ کریں؟" اور ننھا کاغذ اس کے سامنے رکھا۔ اشعر نے نظریں جھکا کے اس کاغذ کو دیکھا۔

وہ ایک چیک تھا۔ اشعر محمود کی چیک بک کا چیک۔

"آپ نے مجھ سے پانی اس لیے مانگا کیونکہ آپ کو میری میز پہ رکھی چیک بک سے ایک چیک پھاڑنا تھا' پانچ سیکنڈز میں آپ نے یہ کیسے کیا' تالیہ۔ میں حیران ہوں۔"

"کیونکہ وہ خزانہ آپ ہیں اشعر صاحب۔" وہ ہنوز مسکرا رہی تھی۔ "آپ مجھے اس چیک پہ لکھی رقم سائن کر کے دیں گے۔ آپ آج سے وان فاتح کی کیمپین کو فنڈ کریں گے۔ میں آپ کو استعفیٰ دینے کے لیے مجبور کرنے نہیں آئی۔ میں آپ کو واپس اپنے کیمپ میں دعوت دینے آئی ہوں۔"

اشعر کے تاثرات بدلے۔ ماتھے پہ بل پڑے۔ لب بھنچ لیے۔ ایک سخت نگاہ اس پہ ڈالی۔

Google

"اور میں چیئرمین الیکشن چھوڑ کے آبنگ کی کیمپین میں کیوں شامل ہوں گا' ہاں؟"

"کیونکہ آپ ابھی تک ان کو آبنگ (بھائی) کہتے ہیں۔ کیونکہ جب سے آپ نے ان کے خلاف کاغذات جمع کروائے ہیں آپ سوشل گیدرنگز سے کٹ گئے ہیں۔ لوگ آپ کو وہ پروٹوکول نہیں دے رہے جو وان فاتح کے سائے میں ہونے کی وجہ سے دیتے تھے۔ آپ اکیلے رہ گئے ہیں اور آپ نے عمر کا ایک بڑا حصہ فاتح کا کنگ میکر بن کے گزارا ہے۔ ان سے الگ ہونا آپ کو اندر سے دکھی کر رہا ہے۔ آپ ان کو مس کرتے ہیں' ایش۔ اور آپ کو میرا ایش کہنا ان کی یاد دلا رہا ہے۔

آپ ان کا جتنا برا چاہ لیں' آپ کے اندر کا وہ ٹین ایج لڑکا جو بہن اور بہنوئی کے ساتھ چھٹیاں گزارنے جایا کرتا تھا' وہ آج بھی وان فاتح کی توجہ حاصل کرنے کا متمنی ہے۔ بے چین ہے۔ آپ الیکشن اس لیے جیتنا چاہتے ہیں تاکہ فاتح کو کچھ بن کے دکھا دیں۔ آپ.... ان کے ساتھ.... کام کرنے کو.... مس کرتے ہیں' ایش!" زور دے کر وہ ایک ایک لفظ ادا کر رہی تھی اور اشعر کے جبڑے کی رگیں بھنچ چکی تھیں۔ آنکھوں میں گلابی پن نظر آنے لگا تھا۔ چبھتی ہوئی نظریں تالیہ پہ جمی تھیں۔

"آپ کو لگتا ہے کہ آپ کے اور فاتح کے حالات اتنے خراب ہو چکے ہیں کہ واپسی کا کوئی راستہ نہیں مگر یہ غلط ہے۔ میں آپ کو واپسی کا ٹکٹ دینے آئی ہوں۔ یہ آپ کی واپسی کی قیمت ہے۔ اسے ادا کریں اور واپس آ جائیں۔"

وہ چپ چاپ اسے دیکھے گیا۔ کچھ نہیں بولا۔

"آپ ایکسپورٹ کے بزنس سے وابستہ ہیں۔ اگر فاتح صاحب حکومت میں آئے تو میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ کاروباری اصلاحات کا وہ بل پاس کروائیں گے جس کا مسودہ آپ کب سے تیار کر رہے ہیں۔ آپ کے آفس کا ہر ورکر جانتا ہے آپ اس بل کے بارے میں کتنے پچی ہیں۔ ہم آپ کو ایک سے حکومت دیں گے۔ آپ کو آپ کا پسندیدہ بل مل جائے گا اور ہمیں پارٹی فنڈز۔

اور اگر آپ یہ نہیں کرتے تو آپ اکیلے رہ جائیں گے۔ ٹریلر آپ ایک ہفتے سے دیکھ رہے ہیں۔ پوری فلم زیادہ بھیانک ہوگی۔ زیادہ کے چکر میں تھوڑے سے بھی محروم نہ ہوں' ایش!" اور پھر وہ کرسی دھکیلتی اٹھی اور بیگ اٹھا لیا۔ وہ ابھی تک چبھتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بھنچی مٹھیاں چیک پہ رکھی تھیں۔

"آپ جمعے تک سوچ لیں۔ جمعے کو کاغذات واپس لینے کی آخری تاریخ ہے۔ میں آپ کو کھونا نہیں چاہتی۔ میں چاہتی ہوں کہ ہم سب ساتھ مل کے چلیں۔ جمعے کی صبح آپ اس چیک کو سائن کر کے دے دیں گے تو یہ آپ کی واپسی ہوگی۔ نہیں دیں گے تو بھی ہم عزت سے راستے الگ کر لیں گے اور پھر.... الیکشن جیسے فورم پہ ملاقات ہوگی۔ اور خاندان کی بدنامی آپ دونوں کو لے ڈوبے گی۔"

اشعر بس چپ چاپ اسے دیکھے گیا۔ لب سختی سے بھنچ رکھے تھے۔

"اور وہ ایک منی لانڈر تھا۔ اسی لیے ہماری علیحدگی ہوئی اور میں نے پھر...." انگلی کی انگوٹھی دکھائی۔ "ایک دوسرے آدمی سے شادی کر لی جو ابھی تک قائم ہے۔"

اشعر کے لبوں پہ تلخ مسکراہٹ ابھری۔ سر کو خم دیا۔ نظریں اس پہ جمی تھیں۔ "اور وہ کیا کرتا ہے۔"

"وہ؟" تالیہ اداسی سے مسکرائی۔ "وہ ایک ایڈونچرر ہے۔ مہم جو۔" اور پرس کندھے پہ ڈالتی مڑ گئی۔

اس کے باہر نکلتے ہی اشعر نے غصے سے چیک اٹھایا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پرے اچھال دیے۔ کاغذ کے ٹکڑے شیشے کی دیوار سے ٹکرا کے فرش پہ بکھر گئے۔ سرخ روشنیاں اس کے اردگرد.....

☆☆☆

جمعرات کی شام وان فاتح کی پرسنل ایڈ خاتون

جب فاتح کے ساتھ آفس میں داخل ہوئی تو اسے عثمان کی خالی میز پہ ایک لفافہ رکھا نظر آیا۔ جس کے اوپر پیپر ویٹ رکھا تھا۔

وہ بارش بھری ایک گیلی صبح تھی۔ فاتح دو افراد کے ساتھ تیز تیز چلتا سیدھا اندر آفس چلا گیا تھا۔ وہ لوگ ابھی ایک میٹنگ سے واپس لوٹے تھے اور سیدھا آفس آئے تھے۔ عثمان کے نہ ہونے سے کام بڑھ گیا تھا اور وہ اس کی میٹنگز کا حساب کتاب بھی رکھ رہی تھی۔ سیاہ بیگ سامان سے بھرا آج بھی کہنی پہ تھا اور گلے میں مختلف رنگ کا پھول دار رومال' گلابی فراک کے ساتھ سادہ حلیے کی عکاسی کر رہا تھا۔

لفافہ دیکھ کے وہ میز تک آئی اور تیزی سے اسے اٹھایا۔ پھر اندر ہاتھ ڈال کے باہر نکالا تو دیکھا....وہ اشعر کا دستخط شدہ چیک تھا۔ تالیہ مسکرا دی۔

ساتھ میں ایک دوسرا کارڈ بھی تھا۔ اس نے وہ کھولا۔

وہ ایک ہائی پروفائل ڈنر تھا جو ویک اینڈ کی شام ہونا تھا۔ وہاں وزیر اعظم صوفیہ رحمن بھی مدعو تھی۔ وان فاتح ایسے ڈنرز کم اٹینڈ کرتا تھا مگر اشعر ضرور جایا کرتا تھا۔ اس کی حمایت اس بات سے مشروط تھی کہ وان فاتح اس کی تجاویز بھی پیرا کرے گا اور اشعر کی پہلی تجویز اس کارڈ کی صورت تھی۔

اس کو اٹینڈ کرنا اب لازم تھا۔ اشعر محمود ایک حلیف کے ساتھ اب ڈونر بھی بن چکا تھا اور کوئی سیاست دان اپنے ڈونر کو انکار نہیں کر سکتا۔

تالیہ نے مسکرا کے دونوں چیزیں خاموشی سے اپنے بیگ میں رکھ لیں۔ اسے جو کرنا تھا' صبح کرنا تھا۔

☆☆☆

اشعر محمود کے قلعے نما گھر کا لان رات کے وقت برقی پولز کی سفید روشنی میں نہایا کھڑا تھا۔ لکڑی کی کینوپی کے سائے تلے مادہ ہرن اپنے ننھے غزالوں کو لیے گھاس پہ بیٹھی تھی۔ اس کی بڑی بڑی بے تاثر آنکھیں قلعے پہ جمی تھیں جس کی کھڑکیاں روشن نظر آرہی تھیں۔

اندر لاؤنج میں لٹکتے سارے فانوس روشن تھے۔ پرتعیش صوفوں پہ عصرہ ٹیک لگائے تیوری چڑھائے بیٹھی تھی اور اشعر اس کے سامنے آگے ہو کے بیٹھا منت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''کاکا....پلیز میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''ایش مجھے تم سمجھ میں نہیں آتے۔'' عصرہ نے بے اختیار کنپٹی چھوئی۔ بھورے بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا بنائے' وہ سادہ با جو کر ٹنگ اور کندھے پہ اسٹول جمائے اس وقت ایک ٹوٹی بکھری ہاؤس وائف لگ رہی تھی۔

''تم نے اتنے مہینے مجھ سے فاتح کی مخالفت کروائی اور اب جب کہ میرا دل بھی کھٹا ہو چکا ہے تم چاہتے ہو کہ ہم اس کی حمایت شروع کر دیں۔''

''میں نے آبنگ کی مخالفت نہیں کروائی آپ سے۔ میں نے صرف اقتدار میں پہنچنے کا بہتر راستہ ڈھونڈنا چاہا تھا لیکن کاکا....'' وہ اسے دیکھ کے نرمی سے کہہ رہا تھا۔ ''میں آبنگ کے ہوتے ہوئے چیئر مین نہیں بن سکتا۔ وزیر اعظم تو دور کی بات ہے۔ اس لیے پلیز....ہم دونوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ ہم آبنگ کی حمایت کریں۔''

''میں نے اس کی فائل چرائی' ایش!'' وہ ابرو چڑھائے برہمی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ''میں نے فاتح کو دھوکہ دیا۔ ایک ہفتے سے ہماری بات چیت بند ہے۔ اب میں کس منہ سے اسے کہوں کہ ہم نے صلح کرنی ہے؟'' اشعر نے ابرو اچکائے اور کندھے جھٹکتا پیچھے ہوا۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

Digitized by Google

حبیبہ انجم

چراغ کا حسن

"دیکھیں واصف میری اور ثمرہ کی کتنی پیاری تصویر ہے۔" زارا موبائل اپنے شوہر واصف کے سامنے کرتے ہوئے بولی۔

واصف اپنے موبائل پر مصروف تھا اس نے ایک نظر زارا کے موبائل پر ڈالی۔ زارا کے ساتھ کھڑی ثمرہ اسے زارا سے زیادہ پرکشش محسوس ہوئی



پر اس کا اظہار اس نے زارا سے نہیں کیا۔ کچھ دنوں سے وہ زارا کے منہ سے یہ نام بار بار سن چکا تھا جس اسکول میں زارا پڑھاتی تھی ثمرہ بھی کچھ دن پہلے ٹرانسفر ہو کر آئی تھی اِس کی اس شہر میں شادی ہوئی تھی چونکہ نئی نئی شادی تھی شہر بھی نیا تھا۔ اسکول بھی نیا، اپنوں سے دور ثمرہ بی بی اکیلی تھیں۔ ان حالات میں اس کی بیوی زارا سے زیادہ کوئی مخلص نہ تھا اس کے لیے، کیوں کہ وہ خدائی خدمت گار بنی رہتی تھی۔ زارا صاف دل کی لڑکی تھی۔ کسی زمانے میں پہننے اوڑھنے کا سلیقہ بھی تھا۔ کپڑے اب بھی اچھے پہنتی تھی پر پتا نہیں کن کاموں میں الجھی رہتی تھی گھر میں تو چلتی پھرتی ماسی ہی لگتی تھی۔

اگلے چھ مہینوں میں ثمرہ کے بارے میں سننے کو بہت کچھ ملا، اس کا شوہر ایک نفسیاتی مریض تھا۔ پہلے ایک بیوی کو طلاق دے چکا تھا جس کا پتا ثمرہ کو بعد میں چلا پھر سنا کہ امید سے ہو گئی اور آئے دن زارا کچھ نہ کچھ بنا کر لے جاتی۔

''ہائے واصف! اس کی ساس بہت تنگ کرتی ہے۔ بے چاری دو دو نفسیاتی مریضوں کے درمیان پھنس گئی ہے۔ اس حالت میں تو عورت کو اچھی خوراک اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم کسی کا اچھا کریں گے کل اللہ ہماری اولاد کے لیے اچھا کرے گا۔'' وہ جلدی جلدی لنچ باکس بند کرتے ہوئے بولی اِس کارکشیہ والا ہارن دے رہا تھا۔ مجھے بھی آفس سے دیر ہو رہی تھی۔

پھر ایک ہفتے بعد کی بات ہے۔ واپس آیا تو زارا کچن میں مصروف تھی۔ بچے دونوں ہوم ورک کر رہے تھے۔ عام روٹین میں زارا میرا ہمیشہ خوش دلی سے استقبال کرتی تھی۔ مجھے چائے دیتے ہوئے دن بھر کی روداد سنتے سناتے اپنے کام نبٹائے جاتی پر آج غیر معمولی خاموشی تھی اور کچھ دیر بعد یہ معمہ بھی حل ہوا۔ ثمرہ اپنی آنے والی خوشی سے محروم ہو گئی تھی۔ بات تو افسوس کی تھی پر قدرت کے کاموں میں کس کا دخل ہے سو میں نے بھی زارا کو حوصلہ دیا۔ وہ کچن میں مصروف ہوئی اور میں خبروں میں۔

پھر کوئی دو ماہ خیریت سے گزرے ہوں گے۔ وہ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ثمرہ کو اس کے شوہر نے طلاق دے دی۔ اس کے گھر والے اسے لے گئے تھے آکر۔ زارا جی پھر اداس۔

''دیکھو زارا! ایک لحاظ سے اچھا ہو گیا ایک نفسیاتی مریض سے اس کی جان چھوٹ گئی شاید قدرت نے اسی لیے اس کو اولاد کی خوشی سے محروم کیا ہو۔'' میں نے زارا کو تسلی دی۔

''یہ تو ٹھیک ہے واصف! اس میں بھی کوئی نہ کوئی بہتری ہو گی لیکن پریشانی اس بات کی ہے کہ اس کی نوکری بھی خراب ہو گی۔ آپ کو پتا ہے وہ دوسرے شہر سے ہے، اس کا تبادلہ ہونے میں بھی وقت لگے گا۔ اتنا لمبا عرصہ اسے چھٹی تو نہیں ملے گی۔ یہاں وہ اکیلی کہاں رہے گی اگر کسی ہاسٹل میں رہتی ہے تو اس پاگل انسان کا کوئی پتا نہیں اس کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے وہ تو طلاق کے بعد بھی دھمکیاں دے رہا ہے۔ ایسے لوگوں کا کوئی بھروسا نہیں اکیلی سمجھ کہ کچھ کر دیں یہاں تو اس کا کوئی رشتہ دار بھی نہیں اور نوکری چھوڑنا کوئی عقل مندی بھی نہیں، سرکاری نوکری ہے۔ کل کلاں کو بھابھیاں نہ پوچھیں تو کوئی آسرا تو ہو۔ اب دوبارہ شادی تو قسمت کی بات ہے۔'' زارا اداس لہجے میں بولی۔

''ہمم...... یہ بات تو تمہاری صحیح ہے۔ اس کا ایک حل ہو سکتا ہے۔''

''کیا۔'' اس نے جلدی سے پوچھا۔

''جب تک اس کا تبادلہ نہیں ہو جاتا وہ ہمارے گھر رہ لے تمہارے ساتھ۔ اسکول آتی جاتی رہے گی آنے جانے کا مسئلہ بھی نہیں ہو گا۔ کیا خیال ہے؟ میں نے آسان حل بتایا۔

''ہاں یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں، یہ ٹھیک رہے گا میں ابھی اس کو فون کرتی ہوں۔'' زارا جوش سے

Digitized by Google

اٹھتے ہوئے بولی۔

دس منٹ کے بعد جس طرح وہ چہکتی ہوئی آئی اس کا مطلب تھا کہ ثمرہ راضی تھی۔ ان حالات میں اور کوئی چارا بھی نہیں تھا۔

پھر دو دن کے بعد میں آفس سے آیا تو ثمرہ لاؤنج میں بچوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس نے مجھے سلام کیا میں جواب دے کر فریش ہونے چلا گیا۔ اس کے بعد ہم سب نے مل کر شام کی چائے پی۔ زارا نے اچھا خاصا اہتمام کیا ہوا تھا۔ زارا کو کھانا بنانے کا شوق بھی تھا، نت نئی ترکیبیں دیکھتی رہتی تھی اور پھر آئے دن دستر خوان پہ کچھ نہ کچھ نیا ہی نظر آتا تھا۔ بچوں اور میرے لیے ہر دفعہ کچھ نیا بنا کر وہ خوش بھی بہت ہوتی تھی پھر دوسرے دن اسکول جا کر اپنی کولیگز کو بھی ضرور بتاتی۔

"آپ کو پتا ہے واصف! سب کہتی ہیں زارا تو چراغ کا جن ہے گھر، اسکول ہر چیز مینج کرتی ہے اوپر سے اتنی اسمارٹ ہے، دو بچوں کی ماں تو لگتی ہی نہیں۔" وہ آنکھوں میں چمک لیے ان کی باتیں دہراتی اور خوش ہوتی۔ کسی حد تک یہ باتیں سچ بھی تھیں وہ واقعی دو بچوں کی ماں نہیں لگتی تھی اپنی سمارٹنس کا خیال رکھتی تھی گھر کے کام کے لیے کسی بھی کام والی کو نہیں رکھا ہوا تھا۔ ہر کام خود کرتی تھی پھر جاب بھی کر رہی تھی بچوں کو بھی خود پڑھاتی تھی اور دونوں ہی ماشاءاللہ پڑھائی میں بہت اچھے تھے لیکن میں ایک مرد تھا۔ ان سب باتوں کا اعتراف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی کہ ساری ہی عورتیں کرتی ہیں۔ اسکول کی نوکری کون سا مشکل ہوتی ہے۔ نوکری تو مردوں کی مشکل ہوتی ہے۔ مرد کی کمائی سے ہی گھر میں برکت ہوتی ہے بھلا عورت کی کمائی سے بنتا ہی کیا ہے؟

اور پھر زارا کتنا بھی اچھا سوٹ لے لیتی دوپٹا ماسیوں کی طرح ہی لپیٹتی، ہاتھوں میں مسالوں کی خوشبو بسائے اپنے آپ کو چراغ کا جن ثابت کرنے کے چکر میں اس کے پاس نہ میرے لیے وقت تھا نہ اپنے لیے، سارے بال کیچر میں پھنسائے وہ ہر وقت کام میں معروف رہتی۔ چلتے چلتے میری بات سنتی اور چلتے چلتے جواب دیتی۔ ہم دونوں اچھا کما رہے تھے۔ کئی دفعہ کہا کوئی کام والی رکھ لو۔ ہر وقت جلدی کرو جلدی کرو کا جملہ سن کر تنگ آ گیا ہوں۔ زارا واصف کو کوئی نہیں سمجھا سکتا۔

"توبہ ہے زارا! تمہیں کہیں لے جا بھی نہیں سکتا کہیں سے مسز واصف نہیں لگتیں۔ بندہ کسی سے کوئی بھی نہیں کرا سکتا اتنا کام ہوتا نہیں جتنا تم ظاہر کرتی ہو۔" کبھی میں جھنجھلا جاتا۔

وہ حیرت سے میرا منہ دیکھتی رہ جاتی۔ چراغ جن بننے کے شوق میں وہ یہ بھول گئی کہ میں ایک مرد ہوں۔

☆☆☆

ہاں تو بات ہو رہی تھی ثمرہ کی۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ ثمرہ ہمارے گھر کا فرد بنتی جا رہی تھی۔ میں شام کو آتا تو وہ ہلکے پھلکے میک اپ کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھی کوئی سیلاد بنا رہی ہوتی۔ میرے آنے کے بعد چائے لگاتی اس دوران زارا کی زبان اور ہاتھ دونوں ہی چل رہے ہوتے۔ وہ بچوں کو پڑھانے کے ساتھ ساتھ رات کے کھانے کی تیاری بھی کرتی جاتی۔ اب آفس سے آتے ہی ثمرہ کو دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بنا سنورا دیکھنے سے تازگی کا احساس ہوتا، مگر زارا کی آواز ہتھوڑے کی طرح میرے سر پر لگتی۔

"زارا پلیز بچوں کو اندر کمرے میں پڑھایا کرو۔ میں آفس سے تھکا ہوا آتا ہوں آتے ہی تم صور پھونکنا شروع کر دیتی ہو۔" میں جھنجھلاتے ہوئے بولا۔

زارا کو اس کے رویے پر شدید حیرت ہوئی آج پہلی بار واصف اس پر ایسے چلایا تھا اس سے پہلے بھی کئی دفعہ وہ لڑ پڑتے تھے، بحث بھی ہو جاتی تھی لیکن لہجے میں اس طرح کی درشتی پہلے کبھی نہیں آئی نہ ایسے لفظ بھی اس نے استعمال کیے تھے۔

Digitized by Google

''سوری واصف! وہ کچن میں کام بھی ہوتا ہے تو ساتھ بچوں کو بھی کام کرالیتی ہوں۔ روم میں بار بار جا کر کام کیسے کراؤں اور میری نظر ہٹ جائے تو یہ ٹھیک طرح سے کام نہیں کرتے۔'' اس نے آہستہ سے صفائی دیتے ہوئے کہا۔

''یہ کہانیاں مجھے نہ سنایا کرو۔ میں گھر آتا ہوں تو سکون چاہتا ہوں۔ بچوں کو کمرے میں پڑھایا کرو۔'' میں پیر پٹختے ہوئے اندر کمرے میں جاکر لیٹ گیا۔

زارا کو ثمرہ کے سامنے تھوڑی سبکی کا احساس بھی ہوا۔ پھیکی مسکراہٹ سے بچوں کو کمرے میں جانے کو کہا اور خود دوبارہ سے کچن میں مصروف ہوگئی۔ واصف کو چائے کمرے میں لے جاکر دی۔ اس کے پکارنے پر بھی واصف نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''پتا نہیں کوئی آفس کی پریشانی ہے۔ واصف کبھی ایسا نہیں کرتے۔'' وہ کچن میں کام کرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ رات کو پوچھوں گی۔

''کیا بات ہے واصف! کوئی پریشانی ہے۔'' رات کو وہ کمرے میں آئی تو واصف موبائل میں گم تھے۔ اس نے پاس بیٹھ کر آہستہ سے ان کے بالوں کو ہاتھوں سے سیٹ کرتے ہوئے کہا۔

''کوئی پریشانی نہیں کیوں؟'' وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔

''آپ نے کبھی اس طرح کیا نہیں، آج کیا ہوا؟''

''یار تم خود سوچو بندہ گھر سکون کے لیے آتا ہے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی مسلسل تمہارے بولنے کی آواز، بچوں کو ہوم ورک کرانا ہے، ان کے پاس بیٹھ کر کراؤ پھر کھانا بناؤ، تم دو دو کام ساتھ کررہی ہوتی ہوتا کہ بس جان چھوٹے۔'' واصف کھردرے لہجے میں بولا۔

''جان چھڑانے کی بات نہیں واصف! بچے ہوم ورک میں بہت دیر لگاتے ہیں۔ اگر ان کے ہوم ورک ختم ہونے کا انتظار کروں تو کھانا وقت پر نہیں بن سکے گا۔ آپ کھانا بھی تو جلدی کھاتے ہیں۔''

واصف کی بات سن کر اسے دکھ ہوا تھا پر خود پہ قابو پاتے ہوئے اس نے بات مکمل کی۔

''مجھے کہانیاں نہ سنایا کرو۔ میں واپس آؤں تو مجھے سکون چاہیے، چاہے ہوم ورک رات کو کرواؤ یا شام میں، یہ تمہارا مسئلہ ہے اور یہ ہاتھ ہٹاؤ، لگتا ہے پیاز لہسن کی پوٹلی سر پر پڑی ہے۔'' وہ اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولا۔

زارا کی آنکھوں میں آنسو آگئے وہ خاموشی سے بیڈ سے اتر گئی۔ واش روم میں نل کھول کر ہاتھوں اور چہرے کو رگڑ رگڑ کر صابن سے دھونے لگی اسی تواتر سے آنسو بھی بہہ رہے تھے۔ آج واصف کا رویہ ناقابل فہم تھا۔ اس کے دل کو ٹھیس پہنچی تھی، منہ دھوکر وہ باہر نکلی تو واصف سو چکے تھے۔ وہ بھی خاموشی سے لیٹ گئی۔

دور کہیں کوئی گھنٹی بجی تھی۔

☆☆☆

آنے والے دنوں میں واصف کا رویہ مسلسل ایسا ہی رہنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا ہوگیا ہے واصف کو۔ وہ شام کو گھر آتے تو وہ چائے ان کو لاؤنج میں دے کر اپنی چائے لے کر بچوں کے روم میں آجاتی، وہیں ان کو ہوم ورک کراتی، سبزی کاٹتی۔ پہلے دن وہ اپنی چائے لے کر بچوں کے روم میں آئی تو اس کا خیال تھا واصف اس کے پیچھے آئیں گے۔ اتنے سالوں میں کبھی وہ شام کی چائے ایک دوسرے کے بغیر نہیں پیتے تھے مگر کافی دیر انتظار کے بعد بھی جب واصف نہیں آئے۔ اس کی چائے پڑے پڑے ٹھنڈی ہوگئی تھی تو وہ بچوں کو کام میں لگا کر کٹی ہوئی سبزی اور چائے کا کپ اٹھا کر باہر آئی تو واصف اور ثمرہ کے کپ خالی پڑے تھے۔ وہ کسی ڈرامے میں گم تھے۔ اس کے دل کو دھچکا لگا۔ خاموشی سے کچن میں جاکر اپنی چائے سنک میں بہادی اور کپ لینے لاؤنج میں گئی۔

Digitized by Google

"واصف! یہ کپ پکڑا دیں۔" اس نے جان بوجھ کر واصف کو آواز دی، یہ سوچ کر شاید واصف کو اس کا خیال آجائے۔

"ہمم......" وہ چونکے۔

"کپ۔" اس نے ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔

"یار سامنے پڑے ہیں، سارا مزہ خراب کر دیا۔ آگے ہو کر اٹھا کر لے جاؤ۔" واصف جھنجلا کر بولے۔ وہ دکھی دل کے ساتھ کپ اٹھا کر آ گئی۔ پیاز کاٹتے ہوئے اس کا دکھ بھی آنکھوں سے بہنے لگا۔

"یہ پیاز بھی اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے۔" اسے آج احساس ہوا تھا۔

پھر ہر آنے والے دن میں کچھ ایسا ہو جاتا جس سے اس کے دل کو ٹھیس پہنچتی۔ بہت سی باتوں پر وہ ثمرہ کی موجودگی کی وجہ سے خاموش ہو جاتی۔ کمرے میں بات کرنے کی کوشش کرتی تو واصف اونچا اونچا بولنا شروع کر دیتے۔ ثمرہ ساتھ والے کمرے میں ہوتی تھی آواز اس تک نہ جائے اس لیے زارا نے کمرے میں بھی کسی معاملے پر بحث کرنا چھوڑ دی تھی۔

اس رشتے کی ڈور میں اگر دونوں سرے تن جائیں تو یہ ٹوٹ جاتا ہے۔ کسی ایک کو ایک سرا ڈھیلا چھوڑنا پڑتا ہے۔ زارا اس بات کو سمجھتی تھی پر معاملات اتنے الجھتے جا رہے تھے کہ کوئی سرا ہاتھ نہیں آرہا تھا۔

اس ہفتے ثمرہ اپنے گھر والوں سے ملنے چلی گئی۔ زارا نے بھی سکون کا سانس لیا۔ آج وہ آرام سے واصف سے بات کرے گی، پوچھے گی کیا پریشانی ہے کیوں اتنے الجھے رہتے ہیں۔

اس شام کو وہ گھر آئی تو کچھ بھی کرنے کا ارادہ ملتوی کر کے اپنا نیا سوٹ نکالا، استری کر کے تبدیل کیا۔ ہلکا ہلکا میک اپ کیا، بچوں کو بھی تیار کر کے کچن میں چائے بنانے چل دی۔ واصف کی گاڑی کا جب ہارن سنائی دیا۔ وہ چائے دم پر رکھ چکی تھی واصف اندر آئے تو ان کے ہاتھ میں سموسوں کا شاپر تھا اس کو دے کر فریش ہونے چل دیئے وہ سموسے پلیٹ میں نکال کر چائے کے ساتھ لے آئی۔

"ثمرہ کو بھی بلاؤ اس کو تو سموسے بہت پسند ہیں۔" واصف نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

واصف کی بات سن کر زارا کو کچھ عجیب سا احساس ہوا پر وہ نظر انداز کرتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں بولی۔ "وہ تو دو دن کی چھٹی لے کر گھر والوں سے ملنے گئی ہے۔"

واصف کا چہرا ایک دم سے تاریک ہو گیا۔ سموسے کی طرف جاتا ہاتھ انہوں نے واپس کھینچ لیا۔ زارا نے یہ سب بڑی شدت سے محسوس کیا۔

"اوہ تو تب ہی تم اتنی بن سنور کر بیٹھی ہو۔ اس کے سامنے تو ظاہر کر رہی ہوتی ہو جیسے بڑی سگھڑ بی بی ہو، ہر فن مولا ہو، سارا بوجھ تم نے اٹھا رکھا ہے اور اب گولے گنڈے کی دکان بنی بیٹھی ہو۔ شکر ہے گھر میں مہمان نہیں، تم جیسی عورتیں ہوتی ہیں جو مہمانوں کے جانے کا جشن مناتی ہیں اور گھر میں بے برکتی لاتی ہیں۔" واصف غصے میں پیر پٹختا کمرے میں چلا گیا۔ بچے سہم کر ماں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

وہ خود حیران تھی واصف کو کس بات پر اتنا غصہ آیا تھا۔ واصف اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ ایسی نہیں ہے پھر آنکھوں میں آئی نمی کو پیچھے دھکیلتے اس نے دونوں بچوں کو گلے سے لگا کر پیار کیا۔ ان کو کھیلنے کو کہا خود کپڑے تبدیل کر کے کچن میں چلی گئی۔

بچوں کو چپس بنا کر دیئے اور رات کے کھانے کی تیاری میں لگ گئی مگر ذہن مسلسل واصف کی باتوں میں الجھا ہوا تھا۔ کہیں اس کے اندر خطرے کی گھنٹی بجی تھی، وہ عورت تھی۔ اپنے ساتھی کی ہر ادا پہچانتی تھی رات کو کھانا دے کر کچن سمیٹنے کے بعد وہ خاموشی سے کمرے میں آکر لیٹ گئی۔ واصف ٹی وی میں مگن تھے اسے رونا آرہا تھا۔ پہلے تو واصف اس کی دو منٹ کی خاموشی بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔

"یار تم خاموش ہوتی ہو تو گھر میں زندگی کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔"

مگر اب کتنے دن ہو گئے ان کے درمیان

Digitized by Google

معمول کی بات چیت بھی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ خاموشی سے کتنے آنسو اس کا تکیہ بھگوتے رہے کافی دیر رو لینے کے بعد جب دل کا بوجھ ہلکا ہوگیا تو اس نے پچھلے تمام دنوں پر نظر دوڑائی شاید ایسا کچھ اس سے ہوا ہو جو واصف کو برا لگا ہو۔ مگر ایسا تو نہ کچھ نہیں ہوا تھا پھر مسئلہ کہاں پر تھا اس کے اندر جو گھنٹی بج رہی تھی وہ اس کو سن رہی تھی۔

☆☆☆

ثمرہ دو دن گزار کر واپس آگئی شام کو واصف آئے تو سامنے اسے بیٹھا دیکھ کر ایک دم کھل اٹھے۔ زارا کچن کے دروازے پر کھڑی ان کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھی، اندر پھر گھنٹی بجی۔

''چلو بھئی زارا! آج کہیں باہر کھانا کھاتے ہیں۔ میں فریش ہو کر آتا ہوں، پھر چلتے ہیں۔'' وہ کمرے میں چلے گئے۔

زارا کا اگرچہ جانے کا دل نہیں تھا پر وہ ثمرہ کے سامنے کوئی بدمزگی نہیں چاہتی تھی۔ خاموشی سے تیار ہونے چل دی۔ اس نے کپڑے بدلے، سلیقے سے سر پر دوپٹہ لیا۔ نیچرل کلر کا لپ گلوس، آنکھوں میں ہلکی سی کاجل کی لکیر اور تیاری مکمل۔ اس کے مقابلے میں ثمرہ نے تیز رنگ کا جدید تراش خراش کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ جس کی چھوٹی تنگ قمیص جو اس کے جسمانی نشیب و فراز کو پوری طرح نمایاں کر رہی تھی۔ مہارت سے کیا گیا فل میک اپ، ہلکی پھلکی سی جیولری اور کندھے پر ایک طرف کو جھولتا دوپٹا اسے مکمل ماڈل لک دے رہا تھا۔ ایک لمحے کو زارا کو کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ فیشن وہ بھی کرتی تھی پر وہ جو اس پر اچھا لگتا تھا، جس میں کوئی بے حجابی نہ ہو۔

ثمرہ کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا پر زارا نے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ واصف کی طرف بڑھ گئی جو اندر سے آتی ثمرہ میں گم تھے۔

''چلیں۔'' اس نے پاس جا کر آہستہ سے کہا۔

''آ...... آ ہاں۔ وہ...... میں کہہ رہا تھا بچے پیچھے بیٹھ کر لڑتے ہیں راستے میں۔ تم ان کے ساتھ بیٹھ جاؤ، میں ڈرائیو کرتے ہوئے تنگ ہوتا ہوں۔'' واصف نے اپنی چوری پکڑے جانے پر نظر چراتے ہوئے کہا۔

''مگر پیچھے اتنی جگہ نہیں ہے، ثمرہ نے بھی بیٹھنا ہوگا۔'' اس نے دھیمی آواز سے کہا۔

''اوہو بھئی ثمرہ آگے بیٹھ جائے گی۔ کبھی اپنے دماغ سے بھی کام لے لیا کرو۔ اس میں بھس ہی بھرا رہتا ہے ہر وقت۔ چلو ثمرہ! تم آگے آجاؤ۔'' وہ اپنی بات مکمل کرتے گھوم کر دوسری طرف سے آکر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ثمرہ بھی خاموشی سے اس کے پاس سے گزر کر فرنٹ سیٹ پر براجمان ہوگئی۔ وہ وہاں اکیلی کھڑی رہ گئی، واصف کے ہارن دینے پر وہ تھکے تھکے قدموں سے آکر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

باقی کا تمام وقت وہ خاموش رہی۔ بچے اپنی شرارتوں میں مگن رہے۔ ثمرہ اور واصف اپنی باتوں میں مصروف تھے۔ زارا کے ہاتھ الجھن کا سرا آگیا تھا۔

☆☆☆

دن خاموشی سے گزر رہے تھے۔ زارا نے کسی بھی معاملے میں بولنا چھوڑ دیا تھا۔ واصف سوچ رہا تھا اب ثمرہ کی عدت بھی پوری ہوگئی ہے وہ اسے پروپوز کردے۔ اس کا گھر ڈبل اسٹوری ہے، زارا اپنے الگ پورشن میں رہے گی اور ثمرہ الگ۔ زارا کے والدین تو عرصہ ہوئے فوت ہو چکے تھے، بھائی کوئی تھا نہیں۔ وہ کچھ دن شور شرابا کرے گی پھر چپ ہوجائے گی۔ ثمرہ بھی یقیناً مجھے انکار نہیں کرے گی۔ آخر سب جانتے ہوئے اس سے شادی کر رہا ہوں اور کیا چاہیے۔

☆☆☆

ایک ہفتے سے ثمرہ گھر گئی ہوئی تھی۔ واصف نے زارا سے پوچھا۔ اس نے کہا اسے کوئی کام تھا آجائے گی اتوار تک۔ اب واصف کو اتوار کا بے چینی سے انتظار تھا۔

آج اتوار تھا۔ واصف صبح سے ہی تیاری میں

Digitized by Google

مصروف تھے۔ بازار سے کئی قسم کی بیکری کی چیزیں، پھل لائے، شیو کی۔ دن کا کھانا بھی تھوڑا سا کھا کر ٹی وی لگا کر بیٹھ گئے۔ ساتھ ساتھ گھڑی پر بھی نظر ڈالتے۔ عصر کے وقت دروازے پر بیل ہوئی تو تیزی سے دروازے پر پہنچ گئے۔ اس سے پہلے یہ ڈیوٹی بھی زارا ہی انجام دیتی تھی۔ دروازے پر کالونی کی کمیٹی کا کوئی رکن تھا جو واصف کو بلانے آیا تھا۔ سیکریٹری صاحب نے بلایا تھا اس لیے بادل نخواستہ واصف کو جانا پڑا۔ کچھ دیر بعد جب اس کی واپسی ہوئی تو دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہوتے ہی لاؤنج سے آتی آوازوں سے اس کو اندازہ ہوگیا کہ ثمرہ آچکی ہے۔ وہ اپنی بے پناہ مسرت کو اپنے اندر چھپاتا جیسے ہی لاؤنج میں داخل ہوا، سامنے دلہن کی طرح سجی سنوری ثمرہ ایک تیس بتیس سال کے پرکشش مرد کے پہلو میں بیٹھی تھی۔

"واصف! آپ آگئے۔ آپ کے جانے کے فوراً بعد ہی یہ لوگ آگئے اور دیکھیے! میڈم شادی بھی کرکے آگئی ہیں اور ہمیں سرپرائز کردیا۔" زارا واصف کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

ثمرہ کا شوہر اس سے ہاتھ ملانے کے لیے کھڑا ہوا، اس نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے مصافحہ کیا۔

"آپ کو پتا ہے واصف! ثمرہ کا تبادلہ ہوگیا ہے۔ خالد بھائی لندن جارہے ہیں کچھ عرصے میں ان شاء اللہ ثمرہ بھی چلی جائے گی۔" زارا اس کی معلومات میں اضافہ کررہی تھی جس کی اسے بالکل ضرورت نہیں تھی۔ کچھ دیر کے بعد وہ دونوں بھی چلے گئے۔

"میرا کھانے کا جی نہیں، میں بس آرام کروں گا۔" واصف، زارا کو بتا کر کمرے میں چلے گئے۔ زارا نے سر ہلا دیا اور جلدی جلدی پھیلاوا سمیٹنے لگی۔ بچے بھی تھک گئے تھے، تو وہ بھی جلدی سو گئے۔ کچن صاف کرنے کے بعد اس نے اپنے لیے چائے کا کپ بنایا اور باہر پورچ کی سیڑھیوں پر آبیٹھی۔ آتی سردیوں کی خنکی جسم کو اچھی لگ رہی تھی۔

قارئین ہر عورت کے اندر ایک گھنٹی ہوتی ہے جو بہت سے مواقع پر بجتی ہے اور خاص طور پر جب معاملہ اپنے گھر اور شوہر کا ہو تو بس جب یہ گھنٹی بج جائے تو محتاط ہو جانا چاہیے۔ میں نے بھی اس گھنٹی کو سن لیا تھا۔

خالد ہمارے اسکول میں کلریکل اسٹاف میں تھا۔ ثمرہ کے لیے اس کی پسندیدگی سے میں آگاہ تھی جب ثمرہ کو دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی آجاتی، آنکھیں چمکنے لگتی تھیں۔ ثمرہ کے گھر والوں تک پہنچنے میں، میں نے اس کی مدد کی، اس کے لندن جانے کا سن کر ثمرہ اور اس کے گھر والے مان گئے۔ وہ ایک ہفتے کی چھٹی پر بھی اس لیے گئی تھی، کم از کم اب واصف کبھی نہیں کہیں گے۔ "دماغ سے کام لیا کرو بھس بھرا ہے کیا۔"

اب سو جانا چاہیے۔ صبح کام والی ماسی نے بھی آنا ہے اور دھوبی نے واصف کے کپڑے لینے بھی۔ اب مجھے بھی مسز واصف بن کر رہنا ہے چراغ کا جن نہیں۔

☆

قیمت -/120 روپے
رجسٹری سے منگوانے پر منی آرڈر سے منگوانے والے
دو بوتلیں -/300 روپے تین بوتلیں -/400 روپے
اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔
بذریعہ ڈاک سے منگوانے کا پتہ
بیوٹی بکس 53، اورنگزیب مارکیٹ، ایم اے جناح روڈ، کراچی۔
دستی خریدنے کے لیے:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار کراچی۔ فون نمبر 32216361

Digitized by Google

یہ گلی، وہ گلی نکل آئے
اور وہ گھر سے ابھی نکل آئے

کون تھا ورنہ آشنا اس کا
مر گیا تو کئی نکل آئے

بات تو جب ہے اتنے لوگوں میں
ایک بھی آدمی نکل آئے

وقت لیکن کسی کے پاس نہیں
باندھ کر سب گھڑی نکل آئے

بیٹھ کر سائے میں بھی دیکھ لیا
اب تو بس دھوپ ہی نکل آئے

آپ بادِ صبا سے کہیے گا
اس طرف بھی کبھی نکل آئے

پیرہن کا تو ذکر کیا کہ یہاں
لوگ تک کاغذی نکل آئے

کاشف حسین

تو کیا یہ دل سے محبت کا اعتراف نہیں
کسی بھی بات پہ اب تجھ سے اختلاف نہیں

خدا خبر کہ یہ دنیا ہمیں کہاں لکھے
ہمارے دل میں محبت بھی واشگاف نہیں

حروفِ خیر کی خاطر لڑے، ہوئے دشمن
ہمارا قتل قبیلے کو بھی معاف نہیں

ہمیں خبر تھی بچھڑنا ہے ایک دن آخر
سو تیرا چھوڑنا ایسا بھی انکشاف نہیں

میں کم نصیب خسارے کی زد میں آیا ہوں
وگرنہ تیری محبت سے انحراف نہیں

دیے جلانے کی کوشش گناہ ہے میثم
کون نہیں ہے یہاں جو مرے خلاف نہیں

میثم علی آغا

Digitized by Google



تحیّر

ہر طرف تحیّر ہے، ہر طرف ہے خاموشی
نیم وا دریچوں سے جھانکتی ہے تنہائی
اک سکوتِ بے پایاں، چار سو مسلط ہے
اک جزیرۂ پُر ہول
جس کے سارے باشندے
صبح کا فسانہ ہیں
مسکراتے لمحوں میں، گیت گاتے لمحوں میں
اپنے سارے درد و غم مجتمع بھی کرتے ہیں
روز جیتے مرتے ہیں
حبس بڑھتا جاتا ہے
درد کم نہیں ہوتا
اک نشانِ منزل کا
دُور ہوتا جاتا ہے
شہر کے در و دیوار
رو رہے ہیں زیرِ لب
حسرتوں کے جمگھٹ میں
کب سے آدمی گم ہے

یاسمین وارثی

دل آباد کہاں رہ پائے اس کی یاد بھلا دینے سے
کمرہ ویران ہو جاتا ہے اک تصویر ہٹا دینے سے

بے تابی کچھ اور بڑھا دی ایک جھلک دکھلا دینے سے
پیاس بجھے کیسے صحرا کی دو بوندیں برسا دینے سے

ہنستی آنکھیں لہو رلائیں کھلتے گل چہرے مرجھائیں
کیا پائیں بے مہر ہوائیں دل دھاگے الجھا دینے سے

ہم کہ جنہیں تارے بونے تھے ہم کہ جنہیں سورج تھے اگانے
آس لیے بیٹھے ہیں سحر کی جلتے دیے بجھا دینے سے

عاکی شعر ہو یا افسانہ یا چاہت کا تانا بانا
لطف ادھورا رہ جاتا ہے پوری بات بتا دینے سے

جلیل عاکی

Digitized by Google

شگفتہ جاہ



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مسلمان کو گالی دینا فسق اور اس سے لڑنا کفر ہے۔"

فوائد و مسائل :۔

• کفر سے مراد کبیرہ گناہ ہے۔ یعنی یہ ایسا کام ہے جو مسلمان کے لائق نہیں، یہ تو کسی کافر کے کرنے کا کام ہے۔

• جن کاموں کو کفر کے کام یا جاہلیت کے کام کہا جاتا ہے، ان سے انتہائی پرہیز کرنا چاہیے۔

حضرت عمرؓ کا ذکر،

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔

"حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تذکرہ کثرت سے کیا کرو کیونکہ جب حضرت عمرؓ کا ذکر ہو گا تو عدل و انصاف کا ذکر بھی ہو گا اور جب عدل و انصاف کا ذکر ہو گا تو اللہ کا ذکر ہو گا۔"

(اخرجہ ابن عساکر کذا فی المنتخب ۴/۳۹۷)

اسلام کی سچائی،

فرانسیسی ڈاکٹر موریزینیہ جو فرانسیسی پارلیمنٹ کے رکن بھی تھے، اپنے اسلام لانے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

• میری جوانی سمندری سفروں میں گزری۔ مجھے سمندری سفر اور سمندر کے نظارے کا بہت شوق تھا۔ میرا دوسرا شوق کتابوں کا مطالعہ تھا۔ جب بھی فارغ ہوتا، کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتا۔

مطالعے کا شوق مجھے قرآن کریم کے فرانسیسی ترجمے تک لے گیا۔ میں اس ترجمے کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ میری نظر میں سورہ نور کی ایک آیت پر جم کر رہ گئیں۔

اس آیت میں ایک گمراہ شخص کے بارے میں مثال دی گئی تھی کہ اس (گمراہ شخص) کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گہرے سمندر میں اندھیرے کے اوپر ایک موج چھائی ہو اور اس پر ایک اور موج اور اس کے اوپر بادل۔ تاریکی پر تاریکی مسلط ہے۔ آدمی اپنا ہاتھ نکالے تو اسے دیکھ نہ پائے۔"

جب میں نے اس آیت کا ترجمہ پڑھا تو میں نے خیال کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے شب و روز میری طرح سمندروں میں گزرے اور گزرے ہوں گے۔ مجھے یہ بھی حیرانی تھی کہ انہوں نے گمراہ لوگوں کی کیفیت کو کیسے مختصر اور جامع الفاظ میں بیان کیا ہے، گویا وہ خود تاریکی، بادلوں کی دبیز سیاہی اور موجوں کے طوفان میں جہاز پکڑے ہیں اور ایک ڈوبتے ہوئے شخص کی بدحواسی کو دیکھ رہے ہیں۔ اس قدر جامع اور مختصر لفظوں میں بڑے سے بڑا سمندری خطرات کا ماہر بھی بیان نہیں کر سکتا۔

اس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے اور انہوں نے زندگی بھر کبھی سمندر کا سفر نہیں کیا تھا۔

اس انکشاف کے بعد میرا دل روشن ہو گیا، مجھے یقین ہو گیا یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں اللہ کا کلام ہے جو رات کی تاریکی میں بھی ہر ڈوبنے والے کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔

میں نے قرآن کا دوبارہ مطالعہ کیا اور صدق دل کے ساتھ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔

Digitized by Google

انصاف

ایک بھینس گھبرائی ہوئی جنگل میں بھاگی جا رہی تھی۔ ایک چوہے نے پوچھا۔

"کیا ہوا بہن، کہاں بھاگی جا رہی ہو؟"

بھینس: "جنگل میں پولیس، ہاتھی پکڑنے آئی ہے۔"

چوہا: "پر تم کیوں بھاگ رہی ہو؟ تم تو ہاتھی نہیں۔"

بھینس: "یہ پاکستان ہے یہاں [illegible] تو بیس سال تو عدالت میں یہ ثابت کرنے میں لگ جائیں گے کہ میں ہاتھی نہیں بھینس ہوں [illegible]"

[illegible] بھینس کے ساتھ چوہا بھی بھاگنے لگا۔

نمرہ اقرا۔ کراچی

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

- علم سیکھنا اور عمل نہ کرنا، روزی کمانا اور [illegible] نہ کرنا تنگ نظری ہے۔
(خواجہ حسن [illegible])
- انسان تنہائی میں فرشتے سے برتر یا حیوان سے بدتر ہوتا ہے۔ کیا بننا چاہتے ہو!
(ہیوگو)
- گناہ اس وقت تک دلچسپ نظر آتا ہے جب تک سرزد نہ ہو۔
(ٹالسٹائی)
- صرف نیک ہی نہ بنیے، بلکہ دوسروں کے ساتھ نیکی بھی کیجیے۔
(تھورو)
- نصیحت میں ایک فریق چھوٹا ہوتا ہے ایک بڑا۔ ناصح کے لیے برتر ہونا ضروری ہے۔
(زرتشت)
- شرمیلا پن ایک عام آدمی کی زینت لیکن کاروباری آدمی کے لیے عیب ہے۔
(ہنری فورڈ)
- روپیہ ہاتھ آنے کے لیے باپ یا چچا کی موت کا انتظار نہ کرو۔
(وکٹر ہیوگو)
- اپنی آمد اور خرچ کا روزانہ حساب لکھتے جاؤ، چند روز میں اصلاح ہو جائے گی۔
(بارنم)
- اگر عقل مند اور بے وقوف دونوں کا سیر محنت ہو جائیں تو ان کا فرق مٹ جاتا ہے۔
(واشنگٹن)
- ضمیر اس آواز کا نام ہے جو ہمیں بتاتی ہے کہ کوئی ہمیں دیکھ رہا ہے۔
(بیکلین)

اقرا عزیز۔ گاؤں دریا خان جلبانی

اکٹھے

[illegible] نے غصے میں بیٹے سے کہا۔ "ایک کام نہیں ہوتا تم سے، [illegible] بھیجا تھا اور تم یہ پوچھ [illegible] کا فرق تک نہیں پتا۔ [illegible] کو بھیجے جانے کا گھر میں رکھنے سے بہتر ہے کہ [illegible] دو۔"

بیٹا: "[illegible] تمہارے [illegible] جلتے ہیں [illegible]"

[illegible] "کیونکہ [illegible] رہی ہیں، یہ سستی ہے۔"

نصیحت

ایک عورت نے بتایا کہ میں نے اپنے شوہر کی فیس بک دیکھی تو وہ ابوبکر نام رکھ کر ایک عورت سے گپ شپ کر رہا تھا اور اس عورت کا نام فیس بک پر بلاک شدہ تھا۔ میں نے جب اپنے شوہر کی پوسٹیں دیکھیں تو وہ محبت بھرے اشعار اور پیار بھری باتوں سے بھری ہوئی تھیں اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ وہ اس سے شادی کے لیے تیار تھا۔ مجھے بڑا غصہ آیا اور اس کو سبق سکھانے کا سوچا تو ابو عبداللہ نام سے میں نے فیس بک پر فرضی آئی ڈی بنائی اور اس پر قتل و غارت، خون خرابے اور جلاد، قصائی وغیرہ کی تصویریں لگانی شروع کیں۔

کچھ عرصے بعد اپنی آئی ڈی سے اپنے شوہر کو میسج کیا۔

Digitized by Google

"تم جس راشدہ نامی لڑکی سے فیس بک پر عشق لڑا رہے ہو، وہ میری بیوی ہے اور میں داعش کے امراء میں سے ایک ہوں اور تمہیں جانتا ہوں کہ تم کون ہو۔"

پھر اس نام، اس کے باپ کا نام، بھائیوں کا نام اور کہاں رہتا ہے، کہاں کام کرتا ہے لکھ کر کہا۔

"اگر اب میں نے تجھے فیس بک پر دیکھا تو تجھے بکری کی طرح ذبح کر دوں گا اے خارشی بکرے۔"

وہ عورت کہتی ہے اگلے دن میں نے دیکھا کہ میرے شوہر کا رنگ اڑا ہوا۔۔۔ اور برے حالات تھے۔ اور موبائل سے فیس بک، انسٹاگرام ۔۔۔ اسنیپ چیٹ، واٹس ایپ سب کچھ ڈیلیٹ کر دیا اور مجھ سے بار بار پوچھ رہا تھا۔

"بیگم! یہ عصر کی اذان کب ہو گی؟"

اقصیٰ ناصر۔ عندلہ ناصر۔ کراچی

اے پیکرِ اجل،

شاعر، دل شاہجہان پوری زندگی کے آخری برسوں میں بہت بیمار رہے اور تقریباً چار برس تک متفرق امراض کا شکار رہے، صحت بہت خراب ہو گئی۔ ایک بار اتنے شدید بیمار ہوئے کہ زندگی کی امید نہ رہی۔ بے ہوشی طاری ہو گئی۔ ایک بار جب ہوش آیا تو کچھ دوستوں نے مزاج پرسی کی۔ آپ کہنے لگے۔

"موت اور زندگی کے مابین جنگ ہو رہی ہے۔ دیکھتے ہیں فتح کس کی ہوتی ہے۔" پھر اپنی یہ رباعی پڑھی۔

مہلت تو ہو دنیا سے گزرنے کے لیے
فرصت تو ملے، قصد یہ کرنے کے لیے
اے پیکرِ اجل، تو اسے مجبور نہ کر
تیار نہیں جو ابھی مرنے کے لیے

عائشہ۔ گوجرہ

جنات اور چڑیل،

حالات بہت خراب تھے۔ کوئی بچت نہ تھی۔ کافی مشکلات میں گزارا ہو رہا تھا۔

ایسے میں دماغ میں آیا کیوں نہ کوئی جن قابو کیا جائے اور اس کو استعمال کر کے دولت کمائی جائے۔ ایک باباجی کا پتا چلا جو عملیات کرنے کے لیے مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔ انہوں نے چالیس دن کا ایک مجرب عمل بتایا۔ عمل کے لیے رات کو اپنے گھر کے ایک کمرے کا انتخاب کیا۔ تین دن عمل چلتا رہا۔ مجھے ڈراؤنی شکلیں نظر آتی تھیں۔ چوتھی رات کا عمل جاری تھا میں حصار میں تھا کہ اچانک ایک خوف ناک نسوانی آواز آئی۔

"منے کے ابا، منے کا فیڈر فریج سے نکال لاؤں۔"

میں چونک گیا کہ کوئی ہوائی مخلوق مجھے تنگ کرنا اور میرا عمل متاثر کرنا چاہتی ہے۔

باباجی نے تاکید کی تھی کہ جیسے بھی حالات ہوں حصار نہیں توڑنا ورنہ جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ آواز دوبارہ آئی۔ میں نظرانداز کر گیا۔ دس منٹ بعد میں نے دیکھا کہ ایک چڑیل میری بیوی کی شکل دھارے میری طرف چلی آ رہی ہے۔ میں بلا خوف ورد کرتا رہا کیونکہ میں تو حصار میں محفوظ تھا۔ وہ چڑیل میرے پاس آ پہنچی۔

میں نے ورد تیز کر دیا۔ اس کے ہاتھ میں بیلن تھا۔ میں چلا کر غصے سے بولا۔

"بھاگ جا چڑیل تمہیں کیا۔ تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔"

بس اتنا کہنا تھا کہ وہ حصار کے اندر گھس آئی اور دھپا دھپ دھنا دھن بیلن سے مجھے پیٹنے لگی۔

میں اسے جنات کی چال سمجھتا رہا کہ وہ مجھے آزما رہے ہیں۔ جب میں چڑیل سے مار کھا رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ حصار کے باہر سارے جنات پیٹ پکڑے زور زور سے ہنس رہے تھے۔

جب چڑیل مجھے مار مار کے تھک گئی اور مجھے گھسیٹ کے حصار سے باہر نکالا تو ایک بدتمیز جن میرے کان میں آ کے کہنے لگا۔

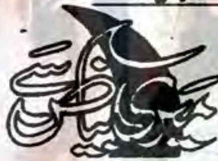
"سرکار! پہلے اپنی بیگم نوں قابو کرو فیر ساڈا سوچنا۔"

ثمرہ، اقرا۔ کراچی



Digitized by Google

خالدہ جیلانی



آسیہ فرید ______ ملتان

غم زندگی تیری راہ میں، شب آرزو تیری چاہ میں
جو اُجڑ گیا وہ بسا نہیں، جو بچھڑ گیا وہ ملا نہیں

حافظ فوزیہ اسد ______ چیچہ وطنی

بن تمہارے کبھی نہیں آئی
کیا میری نیند بھی تمہاری ہے

شائستہ اکبر ______ گڈو کالونی

یہ غم کھاتا چلا جا رہا ہے مجھ کو
مجھے اس خوف سے فرصت نہیں ہے
کہیں برکت نہ اُٹھ جائے وہاں سے
جہاں استاد کی عزت نہیں ہے

آمنہ رئیس ______ گجرات

میرے لہو میں کھلے ہیں تیرے ہجر کے پھول
کب آئے ان پر تیرا موسم وفا دیکھیں
کبھی ہو یوں بھی کہ وہ آئے اور ہم نہ ملیں
کبھی تو اہلِ وفا کا یہ حوصلہ دیکھیں

فوزیہ ثمر بٹ ______ گجرات

سر پڑ پڑی ہے نبھا رہا ہوں جیسے تیسے
دُنیا تیرے مزاج کا بندہ نہیں ہوں میں

نخبہ اکرم ______ گاؤں گوئیکی

ہجومِ غم میں بھی توہینِ ضبط نہ ہوئی
اس احتیاط سے روئے کہ آنکھ نم نہ ہوئی

آمنہ اُجالا ______ ڈہرکی

لفظ کہنے والوں کا کچھ نہیں جاتا
لفظ سننے والے کمال کرتے ہیں

فائزہ بھٹی ______ پتوکی

جن کے دُکھوں کی کوئی حد نہیں ہوتی
ان کے حوصلے کمال ہوتے ہیں

صدف عمران ______ کے ڈی اے

بچھڑے ہوئے کسی کو زمانہ گزر گیا
اس دل کی بے بسی کو زمانہ گزر گیا
دیکھے بغیر جن کے نہ کٹتا تھا ایک پل
دیکھے بغیر اسی کو زمانہ گزر گیا

ہانیہ عمران ______ گجرات

مجھ سے بچھڑ گیا جو گئے سال کی طرح
اس کا بھی حال ہوگا میرے حال کی طرح
آیا نہیں وہ رہ گئے رستے سجے ہوئے
یہ سال بھی گزر گیا ہر سال کی طرح

ثمینہ اکرم ______ کراچی

کوئی پھول جیسی تتلی نہ ستارے جیسا جگنو
تیرے بعد بس اندھیرے میرے ساتھ ہم قدم ہیں

اقصیٰ ناصر ______ گلستان جوہر

ہماری آنکھوں نے بھی تماشا عجب، عجب انتخاب دیکھا
بُرائی دیکھی، بھلائی دیکھی، عذاب دیکھا، ثواب دیکھا
نہ دل ہی ٹھہرا، نہ آنکھ جھپکی، نہ چین پایا، نہ خواب آیا
خدا دکھائے نہ دشمنوں کو جو دوستی میں عذاب دیکھا

یاسمین کنول ______ پسرور

کتنے ویران گھر پڑے ہوں گے
شہر میں لوگ جب لڑے ہوں گے

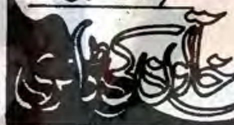
آسیہ جاوید ______ علی پور چٹھہ

بھول جاتی ہیں اپنی ہستی کو
ساری مائیں عجیب ہوتی ہیں

نوال افضل ______ گجرات

کتنی کہانیوں کا ہے عنوان محبت
ہر صاحبِ جنوں کا ہے ارمان محبت

Digitized by Google



عائشہ فاطمہ — کچھ ڈائری سے

ان کے نام جو محبت کرنا بھول چکے ہیں۔ زمانے کے شب و روز کی لایعنی مصروفیات نے جن سے ہنسنے، روٹھنے اور رونے، چہکنے کا ہنر چھین لیا ہے، ان کے پاس پھولوں کو نظر بھر کر دیکھنے، موسم کو محسوس کرنے، ستاروں سے آنکھ مچولی کھیلنے، چاند سے باتیں کرنے، معصوم بچوں میں بچہ بن کر زندگی کا لطف لینے، دوستوں رشتہ داروں اور اپنے دل کی بات سننے کا وقت ہی نہیں۔

ایسا نہیں کہ تجھ سے محبت نہیں رہی
مجھ کو فریب کھانے کی عادت نہیں رہی

تاخیر سے وہ ملنے لگا ہے آج کل مجھے
میرے مزاج میں بھی وہ عجلت نہیں رہی

کارِ جہاں تصورِ جاناں سے بڑھ گیا
رعنائی خیال کی فرصت نہیں رہی

اس دور میں بدلنے لگے ہیں ذہن بھی
ہر بات کو نبھانا روایت نہیں رہی

فوزیہ ثمر بٹ — کچھ ڈائری سے

فاخرہ بتول کی یہ نظم مجھے بہت پسند ہے۔ آپ بھی پڑھیے۔

شام ہو اگر

بچھڑنا ہی اگر لکھا ہے قسمت میں
تو اس میں دیر کاہے کی
چلو اس پل اسی لمحے بچھڑتے ہیں
ابھی تم آنکھ جھپکو گے
ابھی میں ہاتھ اپنے دل پہ رکھوں گی
ابھی تم مجھ سے کہہ دو گے
جدا ہیں راستے اپنے
مگر تم حوصلہ رکھنا
بچھڑنا ہی اگر لکھا ہے قسمت میں
تو اس میں دیر کاہے کی
چلو اس پل اسی لمحے بچھڑتے ہیں

ثوبیہ قطب — کچھ ڈائری سے

بچپن کا دور بہت سہانا ہوتا ہے۔ ہر فکر، ہر غم، ذمہ داریوں سے آزاد۔ دوستوں کے ساتھ ہنسی، قہقہے، روٹھنا منانا۔ عمر کے ساتھ پرانے ساتھی ساتھ چھوڑتے جاتے ہیں اور زندگی کا رنگ بدلتا جاتا ہے۔ یہ نظم ان ہی کیفیتوں کی ترجمانی کرتی ہے۔

ہم بڑے ہو گئے،

مسکراہٹ، تبسم، ہنسی، قہقہے
سب کے سب کھو گئے
ہم بڑے ہو گئے
ذمہ داری مسلسل نبھاتے رہیں
اپنا دکھ سوچ کر رو پڑیں تنہائی میں
محفلوں میں مگر مسکراتے رہیں
کتنے لوگوں سے اب مختلف ہو گئے
ہم بڑے ہو گئے

Digitized by Google

اور کتنی مسافت ہے باقی ابھی
زندگی کی حرارت ہے باقی ابھی
وہ جو ہم سے بڑے ہیں سلامت رہیں
ان سب ہی کی ضرورت ہے باقی ابھی
جو تھپک کر سلاتے تھے خود سو گئے
ہم بڑے ہو گئے
ختم ہونے کو اب زندگانی ہوئی
جانے کب آئی اور کب جوانی ہوئی
جو حقیقت تھی اب وہ کہانی ہوئی
دیکھتے دیکھتے کیا سے کیا ہو گیا
منزلیں مل گئیں
ہم سفر کھو گئے
ہم بڑے ہو گئے

حمدہ خان — کی ڈائری سے

موجودہ حالات کے تناظر میں صادق مدہوش کی یہ غزل قارئین کی نذر۔

شہر میں ایسے لوگ بہت ہیں کتنی زبانیں کٹواؤ گے
کس کس کو چڑھواؤ گے سولی، کس کس کا گھر جلواؤ گے

آج ہے کیا اور کل کیا ہو گا کچھ اس کی فکر کرو
پیچھے مڑ کر دیکھنے والو ہم پتھر ہو جاؤ گے!

دنیا دیکھو، پرتو اس کو، لوگ ہیں سارے مطلب کے
خون کے رشتے باقی ہیں تو لوٹ کے گھر ہی جاؤ گے

بیتے دن اور گزری باتیں خواب ہوئے اور افسانہ بنیں
کس کس کو اب یاد کرو گے، کس کس کو دہراؤ گے

عبرت ہو گی ہم کو دیکھو، ہم کس حال کو پہنچے ہیں
یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے، مٹی میں مل جاؤ گے

کیا حاصل ہے، کیوں پڑتے ہو سود و زیاں کے چکر میں
سچ بولو تاریخ کو سمجھو، امر ہو جاؤ گے

روبینہ، شازیہ، ناہید کوثر — کی ڈائری سے

بے مثال شاعر امجد اسلام امجد کا خوبصورت تحفہ آپ کے لیے۔

دل کے دریا کو کسی روز اُتر جانا ہے
اتنا بے سمت نہ چل لوٹ کے گھر جانا ہے

اس تک آتی ہے تو ہر چیز ٹھہر جاتی ہے
جیسے پانا ہی اسے اصل میں مر جانا ہے

کون اُبھرتے ہوئے مہتاب کا رستہ روکے
اس کو ہر طور سوئے دشت سحر جانا ہے

میں کھلا ہوں تو اسی خاک میں ملنا ہے مجھے
وہ تو خوشبو ہے اسے اگلے نگر جانا ہے

وہ ترے حسن کا جادو ہو کہ میرا غم دل
ہر مسافر کو کسی گھاٹ اُتر جانا ہے

فائکہ سہیل — کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر یہ غزل قارئین کی نذر

بہت مشکل ہے اس کا لوٹ آنا
وہ پوری بات کب سن کر گیا تھا

مجھے پہچانتا بھی ہے کوئی اب
میں لیکن یہ دیکھتے ہی گھر گیا تھا

زمانہ جس کو دریا کہہ رہا ہے
ہماری آنکھ سے بہہ کر گیا ہے

یہ مت سمجھنا خطا کس سے ہوئی تھی
یہ بتا الزام کس کے سر گیا تھا



Digitized by Google



نادیہ خاتون



خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com

مسز زیبا گل زار......لاہور

آپ سب کے ساتھ میرا ناتا پرانا نہیں بہت پرانا، بہت تقریباً پینتیس سال سے میں بھی آپ کے ہم قدم ہوں۔ زندگی نے بہت سے رنگ دکھائے لیکن یہ ناتا نہیں ٹوٹا۔ آپ سب کی کاوشوں سے آج یہ ڈائجسٹ اس مقام پر ہیں۔ تعریف سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ خاص طور پر سب بیٹیوں کی اصلاح و تربیت کر رہے ہیں اس کے لیے تمام والدین کو آپ کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ میں نے 1978ء سے خواتین ڈائجسٹ کا مطالعہ شروع کیا اور پھر شعاع بھی شامل ہوگیا۔ پہلے والدین، بھائی پھر میاں صاحب اور اب میرے بیٹے (ماشاء اللہ) میری اس دیوانگی کو خواب انجوائے کرتے ہیں۔ آپ کو ایک راز اور مزے کی بات بتاؤں 1978ء سے لے کر 2018ء نومبر تک کم و بیش تمام ڈائجسٹ بہت عمدہ حالت میں میرے پاس محفوظ ہیں۔ ایک چھوٹی سی لائبریری کی شکل میں میرا قیمتی اثاثہ مجھے بے حد عزیز ہے۔ آپ کا کبھی لاہور آنا ہو تو میرے لیے بہت بڑے اعزاز کی بات ہوگی اگر آپ اور امتل جی میرے گھر تشریف لائیں اور اس لائبریری کو دیکھیں، میں دل و جان سے منتظر رہوں گی۔

آج بھی قلم اٹھانے کی وجہ ایک خوب صورت ناول ہی ہے۔ پرانے لکھنے والوں کے بارے میں کیا کہوں کہ اولڈ ہمیشہ گولڈ ہی ہوتا ہے لیکن ہماری نئی لکھنے والی بیٹیاں (میں تو بیٹیاں ہی کہوں گی) بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ سمیرا حمید بہت ہی ہونہار بیٹی ہے، پہلے بھی بہت مرتبہ دل دھڑکا چکی ہے لیکن ام الیقین ایک ایسی تحریر ہے کہ میرے بس میں ہو تو ایوارڈ پیش کروں۔ میں آج کل کچھ ذاتی پرابلمز کی وجہ سے بہت ڈپریس ہوں آپ یقین کریں نادرہ جی! اس ناول کی دوسری قسط نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ایسا لگا ایک ایک حرف میرے ہی لیے لکھا گیا ہے، دل کو ڈھارس دیتا ہوا۔ تسلی و تشفی اور حوصلہ بڑھاتا ہوا۔ اللہ پاک اس بیٹی کو دو جہاں کی خوشیاں عطا فرمائے اور آپ کو اجر عظیم دے، ایسا شان دار کام کرنے پر۔

ج: زیبا! ہمیں آپ سے سخت شکایت ہے جب اتنا اچھا لکھ سکتی ہیں تو آپ نے ہمیں پہلے خط کیوں نہیں لکھا۔ موتیوں جیسی لکھائی اور رواں تبصرہ، آپ کا خط پڑھ کر ہمیں بے حد لطف آیا۔

اب ہر ماہ شرکت کیجیے گا اور پرچے کی دیگر تحریروں پر بھی تبصرہ کیجیے گا۔ آپ کے خط کے منتظر رہیں گے۔

سونیا یٰسین، سمعیہ ناز......خیر پور ٹامیوالی

اس بار خط نعیمہ (بہن) کی سہیلی سمعیہ کے پرزور اصرار پر لکھ رہی ہوں جس کی فرمائش ہے کہ نام تو اس کا سر فہرست ہو ہی مگر تحریر میری ہو پر الفاظ اس کے ہوں۔ میں سمعیہ ہوں۔ شعاع اور خواتین کی خاموش قاری۔ شوق تو بچپن سے ہی ہے۔ اب یہ عالم ہے کہ پڑھے بغیر چین ہی نہیں جس کی زندہ مثال لائبریری کے تمام ناولز میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو میں نے نہ پڑھا ہو۔ خواتین کے تمام سلسلے میرے پسندیدہ ہیں، نمرہ احمد میں تو میری جان ہے۔

سمعیہ کے جذبات الفاظ کی صورت میں تو آپ تک پہنچ ہی گئے۔ اب آتے ہیں پرچے کی طرف۔ سب

Digitized by Google

سے پہلے نمرہ احمد کا ''حالم'' پڑھا۔ ہمیشہ کی طرح شان دار ہونے کے ساتھ ساتھ جان دار بھی۔ اس کے بعد ''الف'' پڑھا۔ عمیرہ احمد اچھا لکھ رہی ہیں۔ سمیرا حمید کا ''ام الیقین'' بہت امید افزا ہے، خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جو زندگی سے جنگ لڑ رہے ہیں۔ نعیمہ ناز کا ''رزق زوال'' اچھا رہا مگر تاریخ کے حوالے سے جو حصہ دیا گیا ہے کیا وہ حقیقی ہے یا کہانی کے چارم کے لیے کردار ڈالے گئے ہیں؟ مہابت خان اور قاسم علی کو تو ''خاموش وفا'' میں، میں نے پڑھا ہے۔ تاریخ میں ان کا کافی کردار ہے۔ افسانے تمام اچھے لگے۔ بیوٹی باکس کے حوالے سے شکایت ہے کہ کچھ نیا نہیں آرہا، سب پہلے جیسا ہے۔

☆ سمیعہ اور سونیا! نعیمہ ناز کی کہانی میں کردار فرضی ہیں لیکن واقعات اصلی ہیں۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں جن لوگوں نے انگریز کا ساتھ دیا، اپنوں سے غداری کی، انگریزوں نے انہیں بڑے بڑے انعامات اور خطابات سے نوازا۔ یہ لوگ انڈین سول سروس اور انگریزوں کی فوج میں بھرتی ہوئے، انگریزوں نے جاگیریں اور انہیں زمینیں دیں۔ پاکستان بننے پر وہ پاکستان آگئے اور بڑے بڑے جاگیردار بن گئے۔ آج بھی وہی لوگ کسی نہ کسی شکل میں ہم پر حکومت کررہے ہیں۔

عروج یوسف...... کراچی

آپ اسی طرح ہمارے لیے خوشی کا سامان کرتی رہیں۔ مگر سوئٹ مدیرہ آپ تو اچھی طرح جانتی ہیں کہ فی زمانہ خوشی اسی طرح ملتی ہے جیسے آٹے میں نمک۔ اونٹ کے منہ میں زیرہ۔ سو یہ ڈائجسٹ والی خوشی بھی آپ کی سپر ڈوپر رائٹرز نے تقریباً برباد ہی کرڈالی ہے۔ اللہ جانے کون کون سے فلسفیوں کی چشم و چراغ ہیں۔ ایسی ایسی کہانیاں لکھنے لگی ہیں کہ ہائی بلڈ پریشر والوں کو باقاعدگی سے پڑھنا چاہیے، بغیر دوا کے لو ہوجائے گا۔ Love والا ''لو'' نہیں اور لو بلڈ پریشر والوں کو بھی باقاعدگی سے لینا چاہیے، بغیر دوا کے ہائی ہوجائے گا۔ آپ کے ڈائجسٹ کی صحت دن بہ دن جتنی خراب ہورہی ہے، کمزور ہوتا جارہا ہے۔ آپ کے رائٹرز اتنی ہی تگڑی کہانیاں لکھنے لگی ہیں۔

اوہ خدایا اس پر بات کرنا فضول ہے، ان رائٹرز کو سدھارنا اب اتنا ہی ناممکن ہے جتنا پاکستان میں تبدیلی کا آنا۔ لکھتی رہیں سائرہ، سمیرا، فرزانہ وغیرہ وغیرہ...... اور کرتی رہیں اپنی فلسفی قارئین کو خوش۔ میری اب تمام نامی گرامی رائٹرز سے پکی والی کٹی ہے۔ آج تو میں بڑے مزے سے افشین نعیم کی کہانی پڑھ رہی تھی، ساتھ ساتھ سوچ رہی تھی کن الفاظ میں شاباش دوں گی۔ سکون سے کہانی شروع ہوئی، سکون سے چلی اور سکون سے ختم ہوگئی۔ بڑا مسکراتے ہوئے کہانی کا عنوان پڑھا کہ آپ کو بتا سکوں کہ ستر روپے میں بالآخر اچھی سی، گھریلو سی کہانی مل ہی گئی (میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں ٹائٹل کم ہی پڑھتی ہوں۔ رائٹرز کا نام یا پھر جو شروع میں مزے کی لگتی ہے، بس پڑھ لیتی ہوں)۔ ''میرا دلبر میرے ساتھ'' ڈیئر مدیرہ! آپ کو سارا ایڈٹ خط میں ہی کرنا ہوتا ہے؟ اس ٹائٹل میں سے ''بر'' ایڈٹ نہیں ہوسکتا تھا۔ میں یہ نہیں کہوں گی کہ میں کون ہوتی ہوں آپ سے مطالبہ کرنے والی۔ ہمارا زور آپ پر ہی چل سکتا ہے ورنہ تو نہ گھر میں چلتی ہے نہ ملک چلانے والے مانتے ہیں، نہ لکھنے والے مانتے ہیں تو جو تھوڑی بہت امید ہے آپ سے ہی ہے۔ مورل آف دا اسٹوری یہ ہے کہ مجھے کہانی مزے کی لگی مگر عنوان بے کار۔ اب اجازت، بہت ٹائم لے لیا آپ کا۔ ارے ہاں ہم کراچی والوں کے ساتھ موسم نے جو مذاق کیا ایک دن کی سردی سی آئی تھی اس پر میں نے شعر کہا تھا، بتائیے گا کیسا ہے؟

اتنی سی دیر کی ہی مہمان ہوئی تھی
مچھلی منگائی، مسالا لگایا، سردی چلی گئی

☆ عروج! ہمیں اپنی ساری قارئین بے حد عزیز ہیں اور ہم سب ہی قارئین کی پسند کا خیال رکھتے ہیں۔ ہمارے پرچوں میں سنجیدہ تحریریں ہوتی ہیں لیکن ساتھ ساتھ ہلکی پھلکی مزاحیہ کہانیاں بھی شامل ہوتی ہیں۔

اور ہماری نامی گرامی رائٹرز ہمیشہ ہی صرف سنجیدہ کہانیاں نہیں لکھتیں۔ سمیرا حمید، سائرہ رضا اور فرزانہ کھرل نے ہلکی پھلکی کہانیاں بھی لکھی ہیں اور وہ بے حد پسند بھی کی گئی ہیں۔ ناول کا عنوان آپ کو پسند نہیں آیا، آئندہ خیال رکھیں گے کہ کہانی کے ساتھ ساتھ عنوان بھی خوب صورت ہوں۔

کراچی میں ایک دن کی سردی آئی تھی۔ ہمیں تو یاد نہیں۔ ہمارے کراچی میں تو اب تک صرف مئی جون ہی

Khawateen Digest December 2018
Digitized by Google

چل رہا ہے، ہاں شعر خوب ہے۔

رابعہ نور......رحیم یار خان

میں نے چھبیس ستمبر کو چار سو روپے کا منی آرڈر کیا تھا ڈائجسٹ منگوانے کے لیے۔ خط میں ڈائجسٹوں کے نام بھی لکھے تھے۔ شمارے تھے جولائی، اگست، ستمبر 2014 خواتین ڈائجسٹ اور چوتھا شعاع، اگست 2018۔

☆ رابعہ! آپ کو پرچے بھجوائے جا چکے ہیں، آپ اپنے ڈاک خانے میں پتا کریں۔

یاسمین کنول......پسرور

عمار مسعود اور شنیلا سکندر کا انٹرویو پسند آیا۔ سلمیٰ ناز نے اپنا باورچی خانہ بڑا اچھا لکھا ہے، پسند آیا۔ کھیر پکا کر دیکھیں گے کیسی بنتی ہے، روٹی کی کھیر۔ اشعار سب اچھے ہیں، آپ کا انتخاب غضب کا ہے۔ سمیرا حمید کی تحریر "ام الیقین" کی دوسری اور آخری قسط پڑھی تو پڑھتی ہی چلی گئی۔ والدین کی بیٹی سے محبت کی مثال مشکل سے ملتی ہے، خصوصاً باپ کی محبت...... علاوہ ازیں کوڑھ کے حوالے سے اس طرح کی تحریر میں نے پہلی بار پڑھی ہے، پڑھ کر آنکھیں بھیگ گئیں اف...... بہر حال حقیقت بڑی تلخ ہوتی ہے۔

☆ پیاری یاسمین خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی رائے متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے۔

عمارہ شفیق......اوچ شریف

نومبر میں ناہید اسماعیل کا خط مجھے ذرا پسند نہ آیا، انہوں نے لکھا ہے کہ وہ ماں ہوتے ہوئے سلمیٰ ناز کا ادب کرتی ہیں لیکن ان کے خط سے مجھے ایسا نہیں لگا۔ خیر انہیں تنقید کا پورا پورا حق ہے۔ ڈائجسٹ لیٹ ملنے کی وجہ سے تبصرہ نہیں کر سکتی۔ اس لیے ایک ماہ بعد کا تبصرہ لے کر بیٹھ گئی۔

ج: عمارہ آپ کی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں گئیں۔ خط شائع نہ ہونے کی وجوہات ہم بتا چکے ہیں۔ صفحات کی کمی اور تاخیر سے موصول ہونے کی وجہ سے بہت سے خط شامل نہیں ہو پاتے۔ ناہید اسماعیل کے خط میں ہمیں تو کوئی بے ادبی محسوس نہیں ہوئی۔ انہوں نے بھی سلمیٰ ناز کی طرح اپنے خیالات کا ہی اظہار کیا تھا۔

ارجمند شاہین......حویلیاں ہزارہ

سمیرا کے سب ناول قابل تعریف ہیں لیکن "راہ نور" اور "ام الیقین" کے لیے الفاظ نہیں جن میں تعریف لکھی جائے۔ میں تو یہ کہوں گی کہ جو لوگ ڈپریشن کا شکار ہیں وہ صرف یہ دو ناول بار بار پڑھ لیں، ان کی مایوسی انہیں بائے بائے کر خود ہی چلی جائے گی۔

سمیرا حمید کے لفظوں کا قرض میں پنج گانہ نماز میں ان کی عافیت و صحت کے لیے دعا کر کے ساتھ ساتھ ہی چکا رہی ہوں۔ باقی رائٹرز فرزانہ کھرل، ایمل رضا، عطیہ خالد، سائرہ رضا، نعیمہ ناز بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔

☆ پیاری ارجمند! آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے ہم سمیرا حمید اور دیگر مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

سلمیٰ ناز......اوچ شریف

ناہید اسماعیل نے میرے خط پر اچھا بھلا تبصرہ کیا۔ حیرت ہوئی کہ ان کو میرے لفظوں میں طنز محسوس ہوا جب کہ ایسا نہیں ہے۔ آج کل کے حالات کے تحت میرے لفظوں میں خدشات تو تھے، باقی اور کچھ نہ تھا۔

ناہید آپ کے ابو نے تو آپ کو چار سال کی عمر میں لائبریری کا راستہ دکھایا تھا جب کہ میرے ابو تو صحافت سے وابستہ رہے ہیں (اب ان کی وفات ہو چکی ہے) ان کے بعد میرے بھائی، نعیم احمد ناز صحافت سے وابستہ ہیں۔ ہمارے گھر بھی اپنی لائبریری ہے جب کہ نعیم بھائی صحافت کے ساتھ ساتھ لائبریری کی جاب سے بھی منسلک ہیں۔ ہمارے گھر میں کپڑے، جوتے، میک اپ اور گھر کا سامان اتنا نہیں جتنی کتابیں اور اخبارات ہیں۔ رہی یہ بات آپ کی کہ میری تربیت اور محبت کمزور ہے اور مجھے اپنے بچوں پر بھروسا نہیں تو یہ غلط ہے۔ میری بیٹیاں میرا فخر ہیں، ابھی دونوں پندرہ اور سولہ سال کی ہیں مگر وہ بہت ذمہ دار ہیں۔ وقت آنے پر پورا گھر سنبھال لیتی ہیں، دونوں نہم میں پڑھتی ہیں۔ اچھے ہم سفر کا خواب ہر لڑکی دیکھتی ہے اور یہ اس کا حق بھی ہے۔ ابھی میری بیٹیاں کم عمر ہیں، ان کے خواب، خواہشات بھی معصوم ہیں جیسے "مما برگر کا دل کر رہا ہے یا موسم اچھا ہو تو کہتی ہیں امی پارک چلیں۔"

رہی بات سوشل میڈیا اور موویز کی اور ٹی وی چینلو

Khawateen Digest December 2018

Digitized by Google

کی، تو ٹی وی پر چوبیس میں سے بیس گھنٹے کارٹون اور خوف ناک خبریں ہوتی ہیں (جس میں کبھی خوش خبری نہیں ملتی) اور سوشل میڈیا اور موویز کا پتا نہیں۔ ان چیزوں کی ہمارے ہاں جگہ نہیں ہے۔ ہماری دنیا، ہمارا گھر ہے اور یہ رسالے ہیں۔ میری بچیاں ماشاء اللہ سمجھ دار ہیں۔ اس سمجھ داری میں میرا حصہ کم اور ان رسالوں کا زیادہ ہے اور مجھے فخر ہے اس پر۔ میری وہ سب باتیں ایک ماں کے خدشات تھے جو میں نے آپ سب سے شیئر کیے اور دل کی باتیں انسان اپنی بہنوں ہی سے کرتا ہے، بھائی لوگ تو سمجھتے نہیں۔ جو میرے دل میں خدشات آئیں گے وہ میں سب کے ساتھ شیئر کروں گی، یہ میرا حق ہے اور میری محبت بھی اور ہاں ثمینہ اکرم! وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں، ان کا خط میں بہت دل سے پڑھتی ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے، میں ان سے ملوں جو کہ ناممکن ہے مگر پھر بھی امید پر دنیا قائم ہے۔

☆ پیاری سلمٰی! ایک ماں کے دل میں اپنی اولاد کے لیے محبت کے ساتھ ساتھ جو خدشات ہوتے ہیں، ہمیں ان کا اندازہ ہے۔ آپ کی سوچ غلط نہیں ہے۔ آپ کسی حد تک صحیح سوچتی ہیں۔ کون سا انسان ہے جو اچھی زندگی اور اچھے ساتھی کے خواب نہیں دیکھتا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کی بیٹیوں کو زندگی کی ساری خوشیاں نصیب ہوں۔ آپ جیسی ماں کی بیٹیاں یقیناً بہت اچھی اور سمجھ دار ہوں گی اور ان شاء اللہ ان کے نصیب بھی بہت اچھے ہوں گے۔

سارا جاوید...... کراچی

میں تیرہ سال کی ہوئی ہوں۔ میرا اور ان رسالوں کا ساتھ تقریباً ساڑھے تین، چار سال پرانا ہے۔ ان رسالوں کی طرف مجھے میری ماما نے لگایا ہے۔ مطالعہ کا شوق تو مجھے شروع سے ہی تھا تو ماما نے مجھے "یارم" پڑھنے کو دی پھر چونکہ اس وقت میں چھوٹی تھی لہٰذا "امر حہ" کو "لیڈی مہر" کے پاس چھوڑ کر میں بھاگ گئی، مگر پھر جو لت پڑی تو وہ آج تک موجود ہے۔ "خالی آسمان" اور ایک اور کہانی (نام نہیں یاد آرہا) اور ایک حسن لین اور ٹی کے والی کہانی بھی ماما نے پڑھنے کو دی۔ ابھی بھی ماما ہی کہانی سلیکٹ کرتی ہیں۔ میری فیورٹ رائٹرز ہیں سائرہ رضا، ایمل رضا اور سمیرا حمید۔ سمیرا حمید کی "راہ نور، شوق، مہر میراں" بہترین تھیں۔ "یارم" اب میں دوبارہ سے پڑھ رہی ہوں۔ خواتین میں جاری "دشت جنوں" بہت اچھی کہانی تھی۔ مگر آخر میں معاویہ کو برا دکھا کر دل برا کر دیا۔ "حالم" کے بارے میں، میں کیا کہوں۔ بہت سے لوگوں کو اچھی لگ رہی ہے پر مجھے یہ کہانی بالکل پسند نہیں آئی، حقیقت سے دور۔

☆ پیاری سارا! آپ کو حالم پسند نہیں آئی جب کہ ہماری بیش تر قارئین کو یہ کہانی بہت پسند آرہی ہے۔ خیر پسند اپنی اپنی۔ آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں ہے۔ اطمینان رکھیں، قابل اشاعت ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔

مہناز یوسف...... اورنگی ٹاؤن، کراچی

کیا لکھوں سمجھ میں نہیں آرہا۔ خواتین سے رشتہ کتنا پرانا ہے، معلوم نہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ میرے چچا بچوں کا رسالہ نونہال لاتے تھے اور میں بچپن سے وہ رسالہ پڑھتی تھی، ایک دن میں اپنے پڑوس میں گڈو باجی کے گھر گئی، انہوں نے کہا کہ اب تم ڈائجسٹ پڑھا کرو، بڑی ہوگئی ہو۔ اس میں سبق آموز کہانیاں ہوتی ہیں۔ پھر بہت سارے پرانے ڈائجسٹ کباڑیے سے لے لے کر پڑھے۔ معلوم ہی نہیں تھا کہ نئے ڈائجسٹ کہاں ملتے ہیں۔ گھر پر کوئی پڑھا لکھا نہ تھا، صرف چچا تھے جو کہ نونہال لاکر دیتے تھے۔ شاید سترہ اٹھارہ سال پہلے جب میں حیدر آباد میں میٹرک کی طالبہ تھی۔ تب میں نے چار کہانیاں بھی لکھ کر آپ کے ادارے میں بھیجی تھیں۔ بہر حال اس کے بعد زندگی کی پر پیچ راہوں پر چلتے چلتے کتنی ہی بار خواتین اور شعاع سے ناتا ٹوٹا، کتنی ہی بار جڑا۔ اب تقریباً ایک سال سے مستقل شعاع اور خواتین منگوا رہی ہوں۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ نئی رائٹرز بہت بہترین لکھ رہی ہیں اور نئے نئے اور اچھوتے موضوعات پر لکھ رہی ہیں۔

☆ پیاری مہناز! آپ کی کئی تحریریں خواتین، شعاع میں شائع ہو چکی ہیں۔ آپ میں صلاحیت ہے، بہت اچھا لکھ سکتی ہیں بس تھوڑی محنت اور توجہ کی ضرورت ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ بڑے بڑے موضوعات اور مسائل پر قلم اٹھایا جائے۔ فلسفہ اور تاریخ پر لکھا جائے۔ ہلکے پھلکے گھریلو موضوعات پر بھی دلچسپ کہانیاں لکھی جاسکتی ہیں۔ آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں گئی، اچھی ہوئی تو

Digitized by Google

ضرور شائع ہوگی۔

نوشابہ زینت...... گجرات

اس دفعہ جنوری 2018، فروری اور جولائی کا خواتین بہت بھاگ دوڑ کے بعد بھی نہیں ملا جس کا بہت ملال ہے۔ اصل میں ہمارا بھائی پانچ بجے صبح جاتا ہے اور آٹھ بجے رات کے واپس آتا ہے پھر بھی وہ اپنے اتنے ٹف شیڈول سے ہمارے لیے جینے کی امید (کرن، خواتین، شعاع) لے ہی آتا ہے لیکن خواتین کی دفعہ چھٹیاں بیچ میں آگئیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے گاؤں میں زہر بھی نہیں ملتا کھانے کو، خواتین تو ویسے بھی نایاب ہے خیر پلیز اگر آپ کے پاس جنوری 2018ء، فروری اور جولائی کے خواتین ہیں تو پلیز ہمیں دیں بھیجیں۔ ہم خط میں پیسے رکھ کر بھیج رہے ہیں۔ اب آتے ہیں خواتین کی طرف۔ اچھا تو سب سے پہلے "الف" کی بات کرتے ہیں، میں نے تو "عمیرہ احمد" کا نام ہی دیکھ کر کہہ دیا کہ یہ ہرگز نظر انداز کرنے والا نہیں اور "الف" ہماری توقع سے بڑھ کر نکلا۔ اس کے بعد عطیہ خالد کا "مہمان" کیا ہی اچھا تھا۔ میں بھی ایسے ہی مہمان نوازی کروں گی، ہمارے گھر مہمان بہت کم آتے ہیں۔ اگلا نام نازیہ رزاق کا تھا، مجھے ایسے لگا جیسے یہ پورب پچھم والی نازیہ رزاق ہی ہیں۔ وہی موسیٰ خان اور جنت چوہدری کی تخلیق کار۔ لیکن یہ تحریر ویسی نہیں تھی۔ کامیاب وکیل کے ساتھ ایسا برا کیا ایک دم ہی میں تو حیران رہ گئی۔ اگلا نام بہت بڑا یعنی سائرہ رضا کا تھا۔ جمال زہرا اس کی تعریف کے لیے لفظ نہیں ملتے۔ میں تو ابھی تک تاباں مجاہد کو نہیں بھولی۔ محبت رب سمیرا حمید ہمیشہ سے میری فیورٹ رہی ہیں۔ میرے اندر پتا نہیں کون سی روح سمائی ہے، مجھے یہ پرانے زمانے خاص کر مسلمانوں کے علاقہ جات میں عرب زیادہ پسند ہیں۔ ایک اور تھی "ابن القلم" وہ بھی لاجواب تحریر تھی۔ قرۃ العین سکندر کی تحریر بھی اچھی رہی مگر خاص نہیں لگی۔ نہ جانے کیوں۔ اب آتے ہیں خواتین کی شان، مان اور جان "حالم" کی طرف۔ جی ہاں حالم از مائی موسٹ فیورٹ۔ آپ کہیں گے ہر کہانی تمہاری فیورٹ ہے۔ قسم لے لیں، عمیرہ، نمرہ، سمیرا، سائرہ رضا یہ سب نام ایک سے بڑھ کر ایک لگتے ہیں۔ ویسے سارے رسالوں میں خواتین و شعاع کی شاعری کچھ پڑھنے کے لائق ہوتی ہے ورنہ تو آج کل لوگ نہ جانے شاعری کے نام پر کیا پسند کرتے ہیں۔ خواتین اور شعاع میرے خیال میں نہیں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ خواتین اور شعاع جیسا اور کوئی بھی ڈائجسٹ اس وقت مارکیٹ میں نہیں ہوگا۔ بہت ہی جامع اور مکمل ادب لگتا ہے۔ خواتین سے تو ایسی محبت ہے کہ اس کے سو افسانے بھی بن چکے ہیں۔

☆ پیاری نوشابہ! آپ شاید لفافے میں پیسے رکھنا بھول گئیں کیونکہ آپ کے لفافے میں ہمیں پیسے نہیں ملے۔ رسالے آپ کو بھجوائے جارہے ہیں۔ تاخیر سے پرچا ملنے پر آپ نے پچھلے مہینوں کی کہانیوں پر تبصرہ کیا۔ ہم آپ کی تعریف مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

نازیہ جمیل انصاری...... چنیوٹ

میں دسویں جماعت سے لکھنا شروع ہوئی۔ چھوٹی موٹی کہانیاں، اشعار، نظمیں لکھیں۔ کچھ اشعار اخبارات میں چھپے بھی۔ شادی کے بعد وقت نہیں ملا۔ حالانکہ زندگی کی ہر جنبش پر نظر تھی۔ ہر کسی کروٹ اٹھتی اور بیٹھتی ہے، اس نے بارہا اپنے ناز و انداز سے اپنی بل کھاتی راہ پر مجھے بلایا۔ وقت کی کمی کے پیش نظر اس کی آنکھوں کی مستی کا جواب نہیں دے سکی۔ آپی میں نے ایک سو دس صفحات پر مشتمل ناولٹ لکھا ہے، خدا کرے یہ آپ کے در دل پر دستک دینے میں کامیاب ہوجائے۔

☆ پیاری نازیہ! آپ کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ آپ اپنا ناولٹ بھجوادیں، قابل اشاعت ہوا تو ضرور شائع ہوگا۔

حرا سجاد...... میاں چنوں

دوسری بار خط لکھ رہی ہوں۔ کیا آپ صرف مستقل خط لکھنے والوں کے خط ہی شائع کرتے ہیں؟ پلیز اگر آپ کو یہ خط ملے تو شائع ضرور کریں۔ مجھے شعاع اور خواتین کے ادارے کے تمام اسٹاف سے عقیدت بھری محبت ہے جب بھی رسالہ پڑھتی ہوں تو پہلے انشا جی کو پڑھتی ہوں۔ وہ مجھے بہت پسند ہیں، وہ ہمارے احساسات کو لفظوں میں بہت اچھے سے بیان کردیتے ہیں۔ سمیرا حمید سے شناسائی تب ہوئی جب "محبت مارچ کا موسم" پڑھی۔ اتنی زبردست اسٹوری واہ باقی تمام رائٹرز بھی بہت پسند ہیں۔ نایاب جیلانی، فرزانہ کھرل، نمرہ احمد، عمیرہ احمد، عالیہ بخاری بہت پسند ہیں اور فوزیہ ثمر بٹ اور ناظمہ زیدی اور

Google

قرۃ العین ان سب سے غائبانہ شناسائی ہوگئی ہے۔

☆ پیاری حرا! ہم صرف مستقل خط لکھنے والوں کے خط شائع نہیں کرتے۔ تمام قارئین جو ہمیں خط لکھتی ہیں، ہم ان سب کے خط شائع کرتے ہیں۔ آپ کا پہلا خط ہمیں نہیں ملا ورنہ ہم ضرور شائع کرتے۔ ایک تصحیح کر دیں ''محبت مارچ کا موسم'' سمیرا احمید نے نہیں سائرہ رضا نے لکھا تھا۔ آپ نے خط لکھا بہت خوشی ہوئی۔ خط تاخیر سے ملنے کے باوجود ہم نے شامل کرلیا ہے آئندہ خط جلد بھجوائیں اور تفصیل سے ہر کہانی پر تبصرہ کریں۔

ڈاکٹر فریال خان......ڈی جی خان

میری دیوانگی کا عالم دیکھیں۔ میں کلینک پر بیٹھی آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ اس سے بڑھ کے اور کیا آپ کو محبت کا ثبوت پیش کروں، حق ہا۔ سب سے پہلے ''الف'' کیا کمال کا ناول ہے اور جمال کا تڑکا بھی ساتھ ہے۔ عمیرہ اللہ آپ کو خوش رکھے، آمین۔ پھر آجائیں سمیرا احمید کے پاس۔ سمیرا احمید! اللہ آپ کو سلامت رکھے، وہ جو کہانی لکھی تھی جس میں سارا کھانے پکانے کا ہی ذکر تھا۔ یقین کریں میں تو سوچ رہی تھی، ڈاکٹری چھوڑ کے شیف بن جاؤں، پھر سائرہ رضا۔ سائرہ! یقین کریں آج سے کوئی سال پہلے میں نے اپنی بہن کو یہی کہا تھا کہ ہم لڑکیاں اور عورتیں دوسروں کی بیٹیوں پر باپ بھائیوں کے سامنے تبصرے کر کر کے ان کو بدنام کرتی ہیں۔ ''حالم'' کی طرف آتے ہیں۔ واللہ نمرہ جی! آپ گریٹ ہیں اور حلوے کی پلیٹ ہیں، اللہ نے آپ کو بہت زرخیز دماغ دیا ہے، ماشاء اللہ بہت مزا آرہا ہے پڑھ کے۔ گھر میں اجازت نہیں ہے ڈائجسٹ کی تو کلینک پر آ کے پڑھتی رہتی ہوں۔ کیا کیا جائے نشہ ہے چھوٹتا ہی نہیں، مزا آتا ہے پڑھ کے ''ہے نا؟'' دل چاہتا ہے تمام کہانیوں کو گھوٹا لگا کے ہی جاؤں یا ڈکار جاؤں لیکن یہ ممکن ہی نہیں ہے۔

☆ ڈاکٹر صاحبہ! مریضوں کو انتظار گاہ میں بٹھا کر ہمیں خط لکھا، ہمیں تو آپ کی محبت کا یقین آگیا اور اس محبت کی دل سے قدر بھی کرتے ہیں تب ہی تاخیر سے موصول ہونے کے باوجود آپ کا خط شامل کر رہے ہیں۔ لیکن یہ بتائیے کہ آپ نے اپنے مریضوں کو کس جرم کی سزا دی۔ یہ تو سراسر ظلم ہے آپ کے بیماروں پر۔ نمرہ جی حلوے کی پلیٹ ہیں، کہانیاں گھوٹا لگا کر پینے اور ڈکار جانے کا جی چاہتا ہے۔ کیا نادر تشبیہات ہیں، لگتا ہے کھانے پینے کی زیادہ ہی شوقین ہیں۔

ایک ڈاکٹر پر گھر میں ڈائجسٹ پڑھنے پر پابندی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ گھر والوں کو ٹائم نہیں دیتیں صرف ڈائجسٹ ہی پڑھتی رہتی ہیں۔ ورنہ ڈاکٹر بننے کے بعد والدین کو اتنا اعتماد تو ہو جاتا ہے کہ ہماری لڑکی پڑھنے کے لیے غلط چیزوں کا انتخاب نہیں کرے گی۔

طاہرہ یاسمین......ٹیکسلا کینٹ

اللہ کے فضل و کرم سے خواتین کو 46 سال ہوگئے تو ہم بھی خواتین کی آدھی عمر سے ساتھ ہیں۔ تیئیس سال سے ہمارا ناتا خواتین ڈائجسٹ کے ساتھ ہے۔ لیکن خواتین اور شعاع کا میرا اس طرح کا ساتھ ہے جیسے ماں بیٹی کا یا ایک اچھی دوست کا۔ کیوں کہ میں بہت چھوٹی تھی جب امی کی ڈیتھ ہوگئی تھی۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا، اسی لیے میں اپنی بچیوں کو خود خواتین و شعاع لاکر دیتی ہوں کیونکہ مجھے پتا ہے کہ رسالہ ان کو سکھائے گا۔ خراب نہیں کرے گا۔ نمرہ احمد کا ''حالم'' زبردست جارہا ہے۔ ''الف'' بھی بے مثال ہے۔ آمنہ ریاض کا ''وحشت جنوں'' بھی زبردست تھا۔ کرن کرن روشنی صراط مستقیم پر چلنے کا ذریعہ ہے۔ خاموشی کو یہاں ملے پڑھ کر بڑا اچھا لگتا ہے، کوئی امیر ہو یا غریب، چھوٹا ہو یا بڑا سب اپنے جذبات کا اظہار کرسکتے ہیں۔ دل کی ہر بات لکھ سکتے ہیں۔ اکتوبر کے شمارے میں ڈاکٹر شاہد علی زیدی کا انٹرویو پڑھ کر ہماری معلومات میں اضافہ ہوا۔

☆ عزیز بہن طاہرہ! اتنی طویل رفاقت میں آپ نے ہمیں ایک بار بھی یاد نہیں کیا۔ یہ تو زیادتی ہے ہمارے ساتھ۔ محبت اظہار کی محتاج نہیں ہوتی، خواتین سے آپ کی وابستگی ہی آپ کی محبت کا ثبوت ہے لیکن کبھی کبھی لفظوں میں اظہار خوشی بہت دیتا ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں۔

فضہ یوسف......بہاولپور

رسالہ ملتے ہی سب سے پہلے انٹرویوز چیک کیے پھر حالم کی جانب دوڑ لگائی۔ اب بات کروں گی عمیرہ آپی کے ''الف'' کی آپی! پیر کامل کے بعد الف ہے، جو مکمل یکسوئی سے

Digitized by Google

پڑھوں گی۔ آب حیات نصیب نہیں ہوا۔ اگر حسن جہاں قلب کی امی ہیں تو قلب نے ایسا کیوں کہا کہ اس کی فیملی کا تعلق شوبز سے نہیں؟ ان فیکٹ پہلی قسط سے ہی عمیرہ احمد نے اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ سارا رسالہ زبردست تھا۔ ساحر کا انٹرویو خواتین میں ہی شائع کیجیے گا۔

ج: پیاری فضہ! آپ کا خط ہمیں موصول ہوا اس وقت جب پرچا پریس جا چکا تھا۔ اس لیے آپ کا پچھلے ماہ کا خط اس ماہ شامل اشاعت ہے۔

قلب مومن اپنی فیملی کا ذکر کیوں پسند نہیں کرتا یہ تو ابھی صرف عمیرہ ہی کو پتا ہے۔ آپ ناول پڑھتی رہیے جان جائیں گی۔

ریحانہ چوہدری...... مدکے

کیسی ہیں آپ کافی عرصے بعد خط لکھنے کا وقت نکال سکی ہوں۔ معذرت دراصل پورے سات دن یکم سے لے کر 7 تاریخ تک تین افراد کی ڈیوٹی پہلے شعاع کے لیے پھر خواتین کے لیے لگائی ہوتی ہے کہ جو بھی پہلے لا کر دے اس کی ہی مہربانی۔ ارسلان (بیٹا) سمجھ جائے تو اس کو کہنا نہیں بھولتی انسپکٹر صاحب کی ڈیوٹی سیالکوٹ ہے تو وہ وہاں کے بک اسٹال کھنگالیں اور میرے اسکول کے ملازم بے چارے جب بازار جانے لگیں' مس ریحانہ کی چٹ ڈائجسٹ کے نام والی ان کے ہاتھ میں۔ سات ستمبر سے لے کر گیارہ تک روزانہ گجرات کا سفر کرنا پڑا کہ سیالکوٹ، نوکو بھانجے کی شادی میں شرکت کرنی تھی 10 ستمبر کو بھتیجی غزل کی منگنی کا نائٹ فنکشن اٹینڈ کرنے اسکول سے چھٹی کے بعد وہاں پہنچی اور 11 ستمبر کو صبح 6 بجے وہاں سے نکلی اور سوا سات بجے وہیں سے اسکول ڈیوٹی پر پہنچی' یوں شعاع میں خط نہ لکھ سکی۔

مدیر صاحب کی رائے سے سو فیصد متفق ہوں کہ صاف ستھرا شہر اور خوش گوار ماحول ہماری صحت کا ضامن ہے میں خود روزانہ اسکول میں بھی بچوں کو یہی سبق دیتی ہوں کہ خود سے شروع ہو کر مدرسے، گھر اور ماحول کو صاف رکھنا شروع کریں پورا شہر اور پاکستان صاف رہے گا۔ "کرن روشنی" کی ہر کرن ہمارے ذہن و دل کے دریچوں کو منور کرتی ہے۔ عمیرہ احمد کا ایک اور شاہکار ہمارے ہاتھ میں۔ "پوت کے پاؤں پالنے میں" کے مصداق ابھی سے اندازہ ہو گیا ہے کہ ہم کوئی عام چیز نہیں پڑھ رہے۔ آمنہ ریاض کو دشت جنوں کی تکمیل کی مبارکباد، یقیناً یہ ایک یادگار ناول تھا۔ "عالم" نمرہ جی یہ کیا کیا۔ ایڈم بے چارہ ایک معصوم بھا سورخ جس کا دل تو ویسے ہی خون گشتہ دی پارہ، رہتا ہے ایک چھوٹی سی بچی "لیزا" کے ہاتھوں بھی اس کی تذلیل کروا دی۔ شاعری لاجواب ہے۔ نمرا حمید کا قلم محبت رب ہمیشہ جادوئی الفاظ بکھیرتا ہے۔

نزہت رضوان قاضی کا باورچی خانہ کچھ مختصر سا لگا۔ خاتون کی ڈائری کے سب ورق خوب صورت ہیں۔ اس وقت میں اپنے کچن گارڈن میں بیٹھ کر خط لکھ رہی ہوں کہ رات کے دامن سے صبح کا جھانکنا مجھے بہت پسند ہے لیموں کے پودوں، پر چڑیاں چوں چوں کرتے ہوئے میرے ارتکاز، کو برابر منتشر کر رہی ہیں۔ کاغذ سے نظر اٹھاتی ہوں تو کدو کی بیلیں تو بھنڈی توری، بینگن، شملہ مرچ کے پودوں پر حاوی ہونے میں، مصروف ہیں ان سے لٹکتے ہوئے لوکی (کدو) پہلے میری نظروں کو اسیر کرتے ہیں اللہ کے فضل سے میری (لوکی کدو) کی بیلوں پر اتنا پھل لگا ہے کہ میں اپنے گاؤں میں اسکول میں اور سب رشتہ داروں میں خوب خوب کدو بانٹا ہے دو بیلیں تھیں مگر اتنا پھل لگا اور اتنا مزے کا سالن بنتا تھا کہ کئی لوگوں نے بار بار فرمائش کر کے کئی مرتبہ کدو منگوایا۔ اگر آپ لوگ نزدیک ہوتے تو میں اپنے باغیچے میں لگی تازہ سبزیاں آپ کو ضرور بھجواتی۔

ریحانہ! اگر آپ نزدیک ہوتیں تو ہم خود آپ کے گھر سے کدو منگواتے۔ کراچی میں سبزیاں تو ساری ہی ملتی ہیں لیکن ذائقہ کم ہی اچھا ہوتا ہے اور کدو تو کبھی گلنے کا نام ہی نہیں لیتا۔

بھانجے کی شادی اور بھتیجی کی منگنی مبارک۔ آپ نے اتنی مصروفیات کے باوجود وقت نکال کر خط لکھا، بہت شکریہ

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

Google

خبریں وبریں

واصفہ سہیل

تشہیر

قوی خان ان فنکاروں میں سے ہیں جو کئی دہائیوں سے فلموں اور ٹی وی سمیت ریڈیو پر بھی اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ ان کی ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ انتہائی خاموشی سے اپنا کام کرتے ہیں۔ اب یہی دیکھ لیں کہ قوی خان کو ہالی وڈ فلم "فارہڈن اسٹیپ" میں کاسٹ کیا گیا ہے۔ یہ فلم مغربی ممالک میں مسلمانوں کو درپیش مسائل کے بارے میں بنائی جارہی ہے۔ قوی خان کا کردار ایسے مذہبی شخص کا ہے جو مضبوط اسلامی نظریات رکھتا ہے۔

قوی خان کا کہنا ہے کہ "میں اپنے کسی بھی پروجیکٹ کی پہلے سے تشہیر نہیں کرتا۔ کیوں کہ میرا خیال ہے کہ چاند جب نکلتا ہے تو سب کو خود ہی نظر آجاتا ہے (جب کہ بعض فنکار تو بھارتی فلموں کی آفر نہ آنے کے باوجود اپنے کاسٹ کیے جانے کے اعلان کرتے نظر آتے ہیں۔ آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ......)

ترجیح

گلوکارہ حمیرا ارشد کا کہنا ہے کہ اچھے فنکاروں کو سیاست سے دور رہنا چاہیے (یعنی جو سیاست کے قریب ہیں آپ کے بقول وہ اچھے نہیں ہیں) ان کا کہنا ہے کہ وہ دنیا کے بیشتر ممالک میں پرفارم کرچکی ہیں (تو ہم کیا کریں......؟) اور ہر جگہ ملک کا نام روشن کیا ہے۔ (موم بتی جلا کر......) حمیرا نے مزید کہا کہ انہوں نے نہ آج تک غیر اخلاقی گانے گائے اور نہ آئندہ ارادہ ہے۔ (یعنی وہ جو آپ نے نہیں گائے وہ غیر اخلاقی تھے۔ یا جو دوسرے گا رہے ہیں وہ غیر اخلاقی ہیں......؟)

حمیرا ارشد کا کہنا ہے کہ انہیں بچپن سے ہی گانا



گانے میں دلچسپی تھی (اس میں نئی بات کیا ہے......؟) اس لیے انہوں نے موسیقی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ (اف اس پر یہ حال......) گلوکاری کے دوران انہیں اداکاری کی آفرز بھی ہوتی رہیں (آہم! جی گلوکاری کے مقابلے میں اداکاری......؟) لیکن ان کی ترجیح ہمیشہ گلوکاری ہی رہی (اداکاری کی خیر......!) اور انہوں نے اداکاری کے شعبے میں قدم نہ رکھنے کا فیصلہ کیا......اور اپنی گلوکاری کو ہمیشہ اولین ترجیح سمجھا۔

☆☆☆

اعزاز

یاسر حسین جس تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کررہے ہیں عموماً وہ لوگوں کا خواب ہی ہوتا ہے۔ یاسر حسین ایک باصلاحیت ورسٹائل فنکار ہیں۔ انور مقصود کے مقبول ترین ڈرامے "آنگن ٹیڑھا" کو ہدایت کار داور محمود نے اکبر کے کردار کے لیے یاسر حسین کو

Digitized by Google

کبریٰ خان اس سے پہلے سنگ مرمر اور الف اللہ اور انسان جیسے مشہور ڈراموں کے ساتھ ایک فلم میں بھی کام کر چکی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ یاسر حسین کے ساتھ بھی ایک سیریل کر چکی ہیں۔ (لیکن ان سب میں تاثرات کی کمی رہی) کبریٰ خان اس سیریل کو لے کر بہت پرامید ہیں۔ (ہم بتاتے چلیں کہ یہ ڈرامہ خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہونے والے عمیرہ احمد کے ناول الف پر بنایا جارہا ہے۔)

ادھر اُدھر سے

☆ شہزادہ چارلس اسلام سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں، قرآن پاک کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتے ہیں اور عربی پڑھتے ہیں۔ جب بھی وہ عرب رہنماؤں کو نجی خط لکھتے ہیں تو دستخط عربی میں ہی کرتے ہیں۔

(شہزادہ چارلس کی 70 ویں سالگرہ پر شائع ہونے والی کتاب میں انکشاف)

☆ خودستائشی، صاف گوئی اور پاکستان کو کرپشن سے پاک کرنے کے دعوے بہت بجا لیکن خدارا یہ بھی ذہن میں رہے کہ دنیا اپنے گندے کپڑے بیچ چوراہے میں دھونے والے کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھا کرتی۔

(ارشد وحید چوہدری...... پوائنٹ آف آرڈر)

☆ ماضی کی تلخیوں کا اسیر نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن ان کا بے لاگ تجزیہ کر کے کچھ سبق ضرور سیکھنا چاہیے، ہم نے اس کی زحمت نہیں کی۔ ایک سادہ نسخہ ہمارے ہاتھ لگ گیا تھا کہ امیروں کی دولت چھین کر معیشت کے خدوخال سنوارے جائیں۔ یہ تو ہم نے سوچا ہی نہیں کہ یہ غیر پیداواری چھینا جھپٹی تو ایک کوٹھڑی کے دھان دوسرے کمرے میں منتقل کرنے کے مترادف ہے۔ ہماری معیشت ایسی لڑکھڑائی کہ سرمایہ کار کا اعتماد پھر کبھی بحال نہ ہوسکا۔ بھٹو صاحب کے بیشتر وزراء نا تجربہ کار تھے۔

(وجاہت مسعود...... تیشہ نظر)



کاسٹ کیا۔ اس کے بعد یاسر حسین نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ انور مقصود نے یاسر حسین کی اداکاری کی بے حد تعریف بھی کی۔ یاسر حسین نے انور مقصود کی تعریف کے جواب میں کہا "انور صاحب کے الفاظ میرے لیے دنیا کا سب سے بڑا ایوارڈ ہیں۔ معین اختر اور سلیم ناصر جیسا نہ کوئی آیا' نہ کوئی آئے گا۔ مگر اداکار ان کے کام سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے وہ کردار کرنے کا موقع ملا ہے۔

امید

خواتین تو خواتین مرد بھی اب اپنی عمر کے معاملے میں انتہائی حساس ہو گئے ہیں لیکن ہمارے اداکار عام زندگی میں کتنے ہی کم عمر ہوں، کردار نبھانے کے لیے وہ بڑی عمر کا روپ بھی دھار لیتے ہیں۔ اب یہی دیکھیں کہ نوجوان اداکارہ کبریٰ خان، نجی پروڈکشن ہاؤس کے تحت بننے والے ایک ڈرامے میں خود سے بڑے (کافی...... بڑے) حمزہ علی عباسی کی والدہ کا کردار کر رہی ہیں۔ انہیں اس میں ستر کی دہائی کی ہیروئن دکھایا گیا ہے (ستر کی دہائی' ہیروئن اور......؟)

Google

بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع

دسمبر 2018
کے شمارے کی ایک جھلک

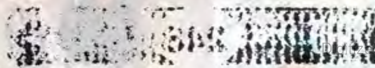


دسمبر 2018
کا شمارہ شائع ہو گیا

- ''کاسہ ذات'' قرۃ العین خرم ہاشمی کا مکمل ناول،
- ''شہرزاد'' صائمہ اکرم چوہدری کا ناول،
- ''شام کی حویلی میں'' رخسانہ نگار عدنان کا ناول،
- ''پھول منڈی'' فرزانہ کھرل کے ناول کی دوسری اور آخری قسط،
- ''ممی ڈیڈی کے بھانجے'' راشدہ رفعت کا ناولٹ،
- سعیدہ عمیر، حمیرا نوشین، انعم نجف رضوی، علیہ خالد اور شازیہ الطاف ہاشمی کے افسانے،
- ''دستک'' معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ،
- ''ایڈووکیٹ اے بی لاشاری'' سے ملاقات،
- ''جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے'' قارئین کا سلسلہ،
- ''پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں'' اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

شعاع ہر ماہ پوری محنت سے ترتیب دیتے ہیں، لیکن آپ کے خط ہمیں بتاتے ہیں کہ ہم اپنی محنت میں کتنے کامیاب ٹھہرے، ہمیں خط لکھنا نہ بھولیے گا۔

شعاع دسمبر 2018 کا شمارہ آج ہی خرید لیں



Digitized by Google

خاموشی کو بیاں ملے

ادارہ

مجھے اپنا تعارف کروانا بالکل بھی نہیں آتا ہے اور ویسے بھی ایک عام بندے کا تعارف کیا ہو سکتا ہے؟ خیر مجھے جیسا تعارف آتا ہے میں ویسے ہی لکھ دیتی ہوں۔ میرا نام تبسم بشیر حسین ہے ہماری فیملی ٹوٹل پانچ افراد پر مشتمل ہے۔ ایک عدد ڈوگی (Taffy) کو بھی شامل کر لیا جائے تو ہم ٹوٹل چھ ہیں۔ مووی اور ڈرامے دیکھنا مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہے اس معاملے میں بہت چوزی ہوں (مرغی کے بچے والی نہیں ہاں) جو اچھے لگیں وہی دیکھتی ہوں۔ اس کے علاوہ رسالے پڑھنا اور موٹے موٹے ناولز پڑھنا بے حد پسند ہے۔ میں کھانا کھائے بغیر رہ سکتی ہوں پر ڈائجسٹ اور ناولز کے بغیر نہیں۔ میں ہزار کا سوٹ لیتے ہوئے مر جاؤں گی پر پندرہ سو کا ناول خرید کر مجھے دلی سکون ملے گا۔ اس کے علاوہ اسٹوریز لکھنا، ڈائری لکھنا، شاعری کرنا، میوزک سننا مجھے بے حد پسند ہے۔ رنگوں میں مجھے بلیک کلر سے عشق ہے۔ ڈرائنگ کرنا، چارٹ سے مختلف چیزیں بنا کر پورے گھر کو سجانا، گیم کھیلنا یہ سب میرے مشاغل میں شمار ہوتا ہے۔

خوبیاں اور خامیاں۔

ہر انسان کی طرح مجھ میں بھی خوبیاں اور خامیاں ہیں۔ خوبیاں تو دوسرے ہی بتا سکتے ہیں البتہ اپنی خامیاں مجھے معلوم ہیں۔ بے حد حساس ہوں، چھوٹی چھوٹی باتوں پر رونے لگ جاتی ہوں، غصہ بہت آتا ہے اور غصے میں اکثر اپنا ہی نقصان کر دیتی ہوں۔ ہر وقت دوسروں کی ٹینشن لگی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ دوسری خامی یہ ہے ہر کسی پر جلد اعتبار کر لیتی ہوں اور بعد میں نقصان اٹھاتی ہوں۔

خواتین کب سے زیر مطالعہ ہے؟

خواتین میں اسکول سے پڑھ رہی ہوں ہر ماہ تو نہیں لیتے تھے لیکن جب بھی بک اسٹال کا چکر لگتا تو ڈھیروں ڈھیر پرانے (خواتین، شعاع اور کرن) لے آتے اور پھر اسکول کے ساتھ ساتھ ان کو بھی پڑھتے پہلی دفعہ میں نے اپریل 2011ء کا خواتین پڑھا تھا جو آدھا پھٹا ہوا تھا اور مجھے ہاسپٹل کے گارڈن سے ملا تھا شاید کسی نے پھینکا تھا، میں نے اٹھا لیا۔ تب سے اب تک اس ڈائجسٹ کی سب سے بڑی دیوانی ہوں۔ صحیح طرح سے 2016ء اگست سے ہر ماہ لینا شروع کیا۔

اس کی بے شمار تحریریں بلکہ یوں کہنا زیادہ بہتر رہے گا کہ ساری کی ساری ہی تحریریں بہت کمال اور بے مثال ہوتی ہیں۔ ہر کہانی نے زندگی کے موڑ پر رہنمائی کی ہے۔ نومبر 2016ء میں لگنے والا ناول ''محبت خواب، جزیرہ'' میرا فیورٹ ناول ہے اس کے علاوہ اور بھی بہت سے ہیں پر ابھی ذہن میں نہیں آ رہے ہیں۔ نمرہ احمد، سمیرا حمید، سائرہ رضا، منشا محسن علی، نعیمہ ناز، عطیہ خالد، ام مریم اور دُرِ ثمن، صدف آصف مجھے بے حد پسند ہیں۔ سب سے زیادہ عنیزہ سید پردہ آج کل لکھتی نہیں ہیں، پلیز جلدی سے واپس آ جائیں۔

سالگرہ؟

میری آمد 10 مارچ کو اس دنیا میں ہوئی۔ برابر طریقے سے کبھی سالگرہ نہیں منائی۔ نہ منانا اچھا لگتا ہے۔ البتہ دوست وغیرہ سرپرائز پارٹی دے دیتی ہوں۔ بس کیک کاٹ لیا، تحفے لے لیے، ہو گیا اور تحفہ بھی ایسا ویسا نہیں چلے گا مجھے ناولز ہی چاہئیں ہر حال میں۔ سو ہر سال یہ ہی تحفے میں ملتے ہیں اس سال مما نے سمیرا

Google

حمید کا ''سودا'' اور بہن نے سائرہ کا ''اب کر میری رفوگری'' دیا۔
اس سال میں نے جتنی کتابیں، رسائل، میگزین اور کہانیاں پڑھی ہیں پہلے کبھی نہیں پڑھی۔ اس سال میں نے شاید دس، گیارہ ناول (کتابی) ختم کیے۔
جہاں تک فیورٹ شعر کی بات ہے تو ڈائریاں یہ موٹی موٹی بھری پڑی ہیں۔ مشکل ہے انتخاب کرنا پھر میں خود بھی شاعری کرتی ہوں، ایک اپنی نظم لکھ رہی ہوں اگر شائع ہو جائے تو کیا ہی بات ہے۔ پڑھ کر بتائیے کیسی ہے؟

میری ذات کے
کئی پہلوؤں سے ابھی
بے خبر ہے تو جاناں
جو بھی مجھے تلاش کرنے
نکلے گا، تو خود کو کھو دے گا
اس لیے تو یوں کر کہ مجھے
''راز'' ہی رہنے دے فاش
مت کر......

ایک شعر حفیظ جالندھری کا جو مجھے پسند ہے۔

کیوں عشق کے شکوے کرتا ہے
کیوں درد کے رونے روتا ہے
اب عشق کیا ہے تو صبر بھی کر
اس میں تو یہی کچھ ہوتا ہے

ایک اور شعر......

کبھی سجدے کبھی آنسو، کیں ہزار کوششیں لیکن
جو قسمت میں نہیں لکھا وہ رونے سے بھی نہیں ملتا

ایک یہ بھی......

اس نے یہ سوچ کر ہمیں الوداع کہہ دیا
یہ غریب لوگ ہیں، محبت کے سوا کیا دیں گے

اوکے جی، اللہ حافظ۔

ماہنامہ حنا
بہنوں کا اپنا ماہنامہ
لاہور

دسمبر 2018 کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

دسمبر 2018 کے شمارے کی ایک جھلک

☆ "اب ھجر کا استفادہ اوڑھے" فلک تنویر کا مکمل ناول،
☆ "اک تیرے نام کی چاہ" ام ایمنا قاضی کا مکمل ناول،
☆ "تم میرے پاس رہو" در ثمن بلال کا مکمل ناول،
☆ "مسی زہیمہ" بشریٰ سیال کا ناولٹ،
☆ "شہر دل کا راستہ" تحسین اختر کا ناولٹ،
☆ "پہلی بارش" شگفتہ زاہد کا ناولٹ،
☆ رمشا احمد، سعدیہ عابد، سیما بنت عاصم، ثناء کنول اور نادیہ جہانگیر کے افسانے،
☆ "دل گذیدہ" ام مریم کا سلسلے وار ناول
☆ "پربت کے اس پار کہیں" نایاب جیلانی کا سلسلے وار ناول،



پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں، انشاء نامہ، عید کے پکوان، مہندی کے رنگ اور وہ تمام مستقل سلسلے جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں

دسمبر 2018 کا شمارہ آج ہی اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب کریں

Digitized by Google

آپ کا باورچی خانہ

طاہرہ یاسمین

میری امی کہا کرتی تھیں کہ عورت کی سلیقہ شعاری دیکھنی ہو تو اس کا باورچی خانہ دیکھ لو۔ باورچی خانہ کی گھر میں بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ میری کوشش اور خواہش ہوتی ہے کہ ہر چیز طریقے سے رکھی ہو۔ پھیلاوا بالکل بھی اچھا نہیں لگتا۔ اب سوالوں کی طرف آتے ہیں۔

(1) س:- کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟

ج:- کھانا بناتے ہوئے مجھے بہت خیال رکھنا پڑتا ہے بلکہ اکثر دو کھانے بنانے پڑتے ہیں کیونکہ میاں جی خوش خوراک تو تھے ہی، اوپر سے ہارٹ پیشنٹ بھی ہو گئے تو ان کے لیے جو کھانا بناتی ہوں ان کو تو پسند آتا ہی نہیں ...... ساتھ بچوں کو بھی اچھا نہیں لگتا اسی لیے ان کے لیے سبزی بناتی ہوں تو ساتھ بچوں کے لیے چکن تو کبھی دال چاول بنا لیتی ہوں۔ دال چاول سب ہی بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ سب کی پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے کھانا بناتی ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ کچن کی صفائی کا بھی خیال رکھتی ہوں۔ سبزیوں کے چھلکے ساتھ ہی سمیٹ دیتی ہوں۔ برتن ساتھ ساتھ دھوتی جاتی ہوں اور ایک اور بات یہ کہ مجھے گیلا کچن بہت برا لگتا ہے۔ ہر چیز کو خشک رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔

(2) س:- کھانے کا وقت ہے اور چند مہمان آ گئے ہیں تو آپ انہیں فوری طور پر کیا پیش کریں گی؟

ج:- مہمان تو واقعی ——— اچانک آتے ہیں اور بہت زیادہ آتے ہیں کیونکہ ایک تو ہمارا خاندان ماشاء اللہ کافی بڑا ہے۔ دوسرا ہماری امی خاندان کی واحد بڑی بزرگ رہ گئی ہیں تو سب بڑی امی سے ملنے آتے رہتے ہیں۔ اسی لیے میں فریج میں گوشت، قیمہ، چکن اور ابلے چنے رکھتی ہوں۔ شامی کباب بھی بنا کر رکھتی ہوں۔ چنوں والے چاول بنا لیتی ہوں، کبھی کبھی سبزی والے چاول بھی بناتی ہوں اور چکن کا سالن بنا لیتی ہوں۔ جو بہت آسان طریقہ ہے کہ چکن کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں کر کے ان کو کڑاہی میں ڈال کر ساتھ ہی ٹماٹر، ادرک پیس کر اور سبز مرچیں اور ہلدی اور سرخ مرچ ڈال کر آئل بھی ڈال دیں اور تھوڑا سا چکن تکہ مسالہ ڈال دیں۔ ایک پیالی پانی ڈالیں اوپر سے ڈھکن دے دیں۔ آٹھ یا دس منٹ بعد ڈھکن کھولیں اور اچھی طرح سے بھون لیں، تھوڑی سی گریوی بنانی ہو تو ایک کپ پانی ڈال کے تین منٹ پکائیں اور چولہا بند کر کے سبز دھنیا ڈال کر پیش کریں۔

(3) س:- مہینے میں کتنی بار باہر کھانا کھاتی ہیں؟

ج:- کبھی کبھی دو یا تین مہینوں کے بعد باہر کھانا کھا لیتے ہیں۔ خان پور ڈیم ہمارے پاس ہے، بچوں کو وہاں لے جاتے ہیں یا میوزیم چلے جاتے ہیں تو کھانا بھی وہیں کھا لیتے ہیں۔ اسپیشلی کھانا کھانے کے لیے باہر کبھی نہیں گئے۔

(4) س:- چھٹی والے دن ناشتے میں کیا خاص اہتمام کرتی ہیں؟

ج:- چھٹی والے دن ناشتے میں خاص اہتمام کرتی ہوں۔ کبھی حلوہ پوری بنا لیتی ہوں۔ کبھی ہرا دھنیا پودینہ ڈال کر آملیٹ بنا لیتی ہوں۔ ساتھ پراٹھے اور چائے۔ عام دنوں میں رات کا سالن پراٹھا۔ یا بچوں کو فرائی انڈا بنا دیتی ہوں۔ کبھی کبھی بریڈ بھی چل جاتی ہے جام کے ساتھ۔ مہینے میں ایک بار تمام مسالوں کو دھوپ لگواتی ہوں۔ ڈبے دھوتی ہوں۔ چولہا تو تقریباً روز دھلتا ہے۔ اور ہمارے ہاں موسم کو مدنظر رکھ کر کھانوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ سردیوں میں خصوصی طور پر مکھڈی حلوہ بنایا جاتا ہے۔ بارش کے موسم میں چائے کے ساتھ پکوڑے بنتے ہیں۔ ساتھ پودینے والی چٹنی بھی۔

آخر میں ماؤں سے گزارش ہے کہ بڑی ہوتی بچیوں کو کچن کے کام میں ساتھ ضرور لگائیں، کوکنگ بھی سکھائیں اور کچن کو کیسے سنبھالا جاتا ہے، بتائیں بلکہ چھوٹے چھوٹے کام ان سے کروائیں ☆

موسم کے پکوان

خگلہ جیلانی

شاہی گوشت

اجزاء:-

گوشت	آدھا کلو
لیموں کا رس	تین یا چار کھانے کے چمچے
ادرک	دو کھانے کے چمچے
پسا گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
نمک	آدھا چائے کا چمچہ
تیل	ایک چوتھائی کپ
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچ	چھ تا آٹھ عدد
کھوپرا پاؤڈر	دو کھانے کے چمچ

ترکیب:-

گوشت کو سب سے پہلے ابال لیں۔ تیل گرم کریں۔ اس میں گوشت، اور زیرہ (بھنا اور پسا ہوا)، پسا گرم مسالا، ہری مرچ، نمک اور کھوپرا پسا ڈال کر پکائیں۔ پھر مسالا بھون لیں۔ گوشت گل جائے تو ادرک اور لیموں کا رس ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ ہرا دھنیا اور ہری مرچ چھڑک کر نان کے ساتھ پیش کریں۔

بہاری پسندے

اجزاء:-

گائے کے پسندے	ایک کلو
دہی	ایک پیالی
سرسوں کا تیل	ایک پیالی
پودینہ	ایک گٹھی
پیاز	ایک عدد
ثابت کالی مرچ	چھ عدد
چھوٹی الائچی	آٹھ عدد
بڑی الائچی	چار عدد
ہری مرچیں	چار عدد
لیموں	چار عدد
ثابت لال مرچیں	دس عدد
ثابت دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
ثابت سفید زیرہ	ایک کھانے کا چمچہ
خشخاش	ایک کھانے کا چمچہ
پسا ہوا پپیتا	تین کھانے کے چمچے
پسی ادرک	دو کھانے کے چمچے
بھنے ہوئے چنے	دو کھانے کے چمچے

ترکیب:-

ثابت لال مرچ، سفید زیرہ، ثابت دھنیا، الائچی، کالی مرچ، چنے اور خشخاش کو توے پر بھون کر باریک پیس لیں۔ پسندوں کو چل کر ان پر دہی، ادرک اور کچا پپیتا لگا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ آدھی پیالی سرسوں کا تیل گرم کر کے اس میں پیاز سنہری کر لیں۔ اس میں مسالا لگے پسندے ڈال کر تھوڑا سا بھونیں اور ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔ پسندوں کا پانی خشک ہونے لگے تو اس میں پودینہ، لیموں کا رس اور ہری مرچ ڈال کر پندرہ منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ مزے دار بہاری پسندے گرما گرم پیش کریں۔

پکوان

اجزاء:

چینی	ایک پاؤ
گھی	ایک کپ
سفید آٹا	آدھا کلو
سوجی	دو کھانے کے چمچے
پسی الائچی	آدھا چائے کا چمچہ
سونف	دو کھانے کے چمچے

Digitized by Google

بیکنگ سوڈا	ایک چمچہ

ترکیب:

دو گلاس پانی میں چینی، سونف اور الائچی ڈال کر شیرہ بنالیں۔

آٹے میں گھی، بیکنگ سوڈا اور سوجی ملادیں۔

پھر شیرے سے گوندھ لیں آٹا تھوڑا سخت گوندھیں۔

پھر اسے بیل کر گول، یا لمبائی میں آدھا انچ موٹا کاٹ لیں۔ کڑاہی میں گھی گرم کرکے اسے تل لیں سنہرا ہوجانے پر نکال لیں۔ مانسہرہ کے مزے دار میٹھے سے لطف اندوز ہوں۔

بیف نہاری

ضروری اشیاء

گوشت	دو کلو
ادرک پسی	ایک کھانے کا چمچہ
لہسن پسا	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
پیاز	چار عدد
آٹا	ایک کپ
سونٹھ کا ٹکڑا	ایک عدد (بڑا)
سونف	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
گرم مسالہ پسا	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
بڑی الائچی	چار عدد
بادیان کے پھول	تین عدد
سرخ مرچ پاؤڈر	دو کھانے کے چمچے
تیل	حسب ضرورت
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب:

ململ کے کپڑے میں سونٹھ کا ٹکڑا، سونف، گرم مسالا، بڑی الائچی، بادیان کے پھول ڈال کر پوٹلی تیار کرلیں۔ پتیلی میں تیل گرم کریں اس میں پیاز ڈال تل لیں پھر اس میں گوشت، ادرک، لہسن اور نمک ڈال کر بھون لیں۔ گوشت بھوننے کے بعد اس میں لال مرچ پسی اور تیار کی ہوئی پوٹلی ڈال کر دوبارہ بھونیں اور حسب ضرورت پانی ڈال کر گوشت گلنے تک پکائیں۔ گوشت گل جائے تو ایک کپ پانی میں آٹا گھول کر اس میں ڈالیں۔ تیز آنچ پر مسلسل چمچہ چلاتے ہوئے پکائیں تاکہ گٹھلیاں نہ بنیں۔ پندرہ سے بیس منٹ کے بعد آنچ دھیمی کرکے ڈھکن ڈھک کر روغن اوپر آنے تک پکائیں مزیدار بیف نہاری تیار ہے۔

ڈش میں نکال کر ہرا دھنیے، ادرک، پودینے اور لیموں سے سجا کر پیش کریں۔

باربی کیو چکن

ضروری اشیا

چکن لیگ پیسز	چار عدد
لہسن پسا	ایک چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
پسی سفید مرچ	حسب ذائقہ
باربی کیو ساس	دو کھانے کے چمچے
تیل	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب

چکن لیگ پیسز کو دھو کر خشک کرلیں۔ ایک پیالے میں لہسن، لیموں کا رس، نمک، پسی سفید مرچ، باربی کیو ساس اور تیل ڈال کر ملالیں۔

اب اس آمیزے کو چکن لیگ پیسز پر لگا کر رات بھر کے لیے فریج میں میرینیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔

چکن لیگ پیسز کو گرلر یا کوئلوں پر تیار کرلیں۔ یا پھر کسی پتیلے میں ہلکا سا تیل ڈال کر ہلکی آنچ پر پکالیں۔ جب چکن گل جائے تو کوئلے کی دھونی دے دیں۔ مزیدار باربی کیو چکن تیار ہے۔ ڈش میں نکال کر سجا کر پیش کریں۔

☆

Digitized by Google

عکس اور آپ

کیسا آئی کو آپ کی گئی بجھائیں

نورین...... کراچی

س: ہم لوگ مڈل کلاس سے تعلق رکھتے ہیں۔ شکل وصورت معمولی ہے۔ میں تھرڈ ایئر میں تھی کہ میرا رشتہ آیا۔ لڑکا بی کام تھا۔ وہ ہمارے دور کے رشتے دار تھے۔ زیادہ چھان بین کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ رشتہ منظور کرلیا گیا۔ شادی میرے گریجویشن کرنے کے بعد طے پائی۔ منگنی کا پیریڈ انتہائی خاموشی سے گزرا۔ ان کے پاس میرا سیل نمبر تھا۔ ایک سال کے عرصہ میں صرف دو بار فون کیا۔ پہلی بار صرف یہ پوچھا کہ کیا آپ اس رشتہ سے خوش ہیں؟ لہجہ کچھ عجیب سا تھا۔ میں منہ کھول کر ہاں نہیں کہہ سکتی تھی۔ یہی کہا کہ میں اپنے والدین کی خوشی میں خوش ہوں۔ انہوں نے انتخاب کیا ہے تو کچھ سوچ کر ہی کیا ہوگا۔ دوسری بار شادی سے ایک ماہ پہلے فون کیا تو کہنے لگے کیا آپ شادی کی تیاری کررہی ہیں۔ میں نے کہا ”کیا مطلب؟“ تو جلدی سے خدا حافظ کہہ کر فون بند کردیا۔

شادی کی تاریخ طے ہوگئی۔ دوسرے شہروں سے مہمان بھی آگئے۔ ہماری ننھیال اور ددھیال پنجاب میں ہے۔ مجھے مایوں بٹھادیا گیا تھا۔ مایوں والے دن ان کے گھر سے کوئی بھی رسم کرنے نہیں آیا۔ گھر والے انتہائی پریشان تھے۔ ان لوگوں کو فون کیا تو کہا گیا کہ لڑکے کے والد کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ وہ آئی سی یو میں ہیں۔ اس لیے نہیں آسکتے۔ ہمارے گھر والوں نے مایوں کی رسم کردی لیکن دوسرے دن جو بات پتا چلی اس نے ہوش اڑادیے۔ لڑکے نے کہیں شادی کررکھی تھی۔ اور اب اس کی بیوی گھر آگئی تھی اور واپس جانے کو تیار نہیں تھی۔ لڑکی کا تعلق اچھے گھرانے سے نہیں تھا۔ اس کے گھر والے لڑکی کو خود لے کر آئے تھے۔ یہ خبر سن کر سب پریشان ہوگئے —— سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اب کیا ہوگا۔ سب سے زیادہ مجھے اپنے ابو کی فکر تھی۔ وہ یہ صدمہ کیسے برداشت کرپائیں گے۔ کارڈ بٹ چکے تھے۔ شادی کے تمام انتظامات مکمل تھے۔ بہرحال یہ کٹھن گھڑی بھی گزر گئی۔

میرا اس لڑکے سے کوئی قلبی تعلق نہیں تھا لیکن جو جگ ہنسائی اور میری تذلیل ہوئی تھی۔ اس کے بعد مجھے شادی کے نام سے بھی نفرت ہوگئی تھی۔ میں نے کچھ وقت بعد ایم اے میں داخلہ لے لیا۔ ایم اے کے بعد مجھے ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ میں اچھی جاب مل گئی۔ امی ابو چاہتے تھے کہ میں شادی کرلوں لیکن میں شادی کا نام سننے کو بھی تیار نہ تھی۔

اب ایک نیا مسئلہ کھڑا ہوگیا ہے۔ اس لڑکے نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے۔ اس کے گھر والے بار بار آکر معافی مانگتے ہیں۔ اس کے والد نے تو ابا کے پیر تک پکڑ لیے۔ وہ خود مجھے بہت بار فون کرچکا ہے۔ اپنی غلطی پر ندامت کا اظہار کرتا ہے۔ معافیاں مانگتا ہے۔ اب اس لڑکے کی ترقی بھی ہوگئی ہے۔ ڈائریکٹر بن گیا ہے۔ گھر والے کہتے ہیں، تم ناشکری کررہی ہو۔ جبکہ میرا دل نہیں مانتا۔ مجھے بتائیں کیا کروں؟

ج: اچھی بہن! آپ اس لڑکے کی ذہنیت پر غور کریں۔ منگنی ہوتے وقت اس نے اپنے گھر والوں کو نہیں روکا۔ خاموشی سے منگنی کرلی۔ منگنی کے بعد آپ سے بات کی لیکن آپ کو اپنی شادی کا نہیں بتایا —— شادی کی تاریخ طے ہوگئی تب بھی کچھ نہیں بولا۔ مایوں والے دن اگر وہ لڑکی نہ آتی تو شاید یہ راز شادی کے بعد ہی کھلتا۔ ایسے کمزور اور بے حس انسان سے جسے دوسروں کی عزت کا پاس نہیں، ایک لڑکی کے جذبات کا احساس نہیں، اس سے کوئی توقع رکھنا حماقت ہے۔ آپ خود مختار ہیں، اچھی جاب پر ہیں۔ آپ کو اچھے رشتے مل سکتے ہیں۔ اپنے گھر والوں کو سمجھائیں ایک ہی جگہ سے بار بار دھوکا کھانا بے وقوفی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ سنجیدگی سے اپنے بارے میں سوچیں۔ ایک رشتہ ختم ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ دنیا ختم ہوگئی اور سب لوگ ایسے ہی ہوں گے۔ دنیا میں اچھے لوگ بھی ہیں۔

Google

افشاں علی ... ڈسکہ

عدنان بھائی! آپ کو بہت مجبور ہو کر خط لکھ کر رہی ہوں۔ پتا نہیں میرے مسئلے کا کوئی حل آپ کے پاس ہے یا نہیں۔

میرا ایک اچھے گھرانے سے تعلق ہے۔ روپے پیسے کی کمی نہیں لیکن گھر کا ماحول بہت سخت ہے۔ مجھے لکھنے پڑھنے کا بہت شوق تھا جب میں نے بہت ضد کی تو ابو نے اجازت دے دی —— گھر پر ہی۔ ایک لیڈی ٹیچر کا انتظام کیا گیا۔ میں چاہتی تھی کم از کم میٹرک کی سند حاصل کرلوں لیکن اس کے لیے امتحان دینے جانا پڑتا۔ ابو سے پوچھا تو تھوڑے ردوکد کے بعد وہ راضی ہو گئے۔ ٹیچر نے ہی میٹرک کا فارم منگوالیا اور مجھے فل کرنے کے لیے دیا۔ دوسرے دن ٹیچر کے پاؤں میں فریکچر ہو گیا۔ وہ خود تو نہ آسکیں اپنے بھائی کو فارم لینے بھیج دیا۔ فارم لے کر خود اس کے سامنے چلی گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظریں جیسے میرے چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ میں بھی مبہوت سی اسے دیکھ رہی تھی۔ میں نے بھی اتنا خوبصورت چہرہ اور ایسی گہری آنکھیں نہیں دیکھی تھیں یا شاید میری کم عمری تھی۔ اس عمر میں مخالف صنف میں ایسی ہی کشش محسوس ہوتی ہے۔ مجھے دو جگہ سائن کرنے تھے۔ وہ میں نے جیسے تیسے کیے۔ وہ فارم لے کر چلا گیا۔ لیکن ساتھ میرا چین وقرار بھی لے گیا۔

میں نے دوسرے دن امی سے کہا کہ مجھے اپنی ٹیچر سے کچھ سوال پوچھنے ہیں، انہوں نے چھوٹے بھائی کے ساتھ مجھے بھیج دیا۔ ٹیچر کے پاؤں میں فریکچر تھا۔ وہ بیڈ پر تھیں۔ ٹیچر سے تو کیا پوچھنا تھا۔ میری نظریں تو اسے ڈھونڈ رہی تھیں۔ اسے بھی شاید میری آمد کی اطلاع مل گئی تھی۔ میں باہر نکلنے لگی تو اس نے ایک پرچا مجھے تھما دیا۔ اس نے اپنے دل کا حال لکھا تھا۔ اس کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہ تھی۔ آگے معاملات تیزی سے بڑھے۔ طے یہ ہوا کہ جس دن میں پیپر دینے جاؤں گی، اس دن کسی طرح میں اس سے مل لوں۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم نکاح کرلیں۔ پھر جب وہ تعلیم مکمل کر کے کسی قابل ہو جائے تو مجھے یہاں سے نکال لے جائے گا۔ اس کا کہنا تھا کہ نکاح کے بعد وہ مطمئن ہو جائے گا کہ کوئی ہمیں علیحدہ نہیں کرسکتا۔

میں پیپر دینے گئی۔ لیکن ایک گھنٹے بعد ہی بہانے سے باہر نکل آئی۔ وہ میرا منتظر تھا۔ مجھے ایک مولوی کے پاس لے گیا۔ وہاں اس کے چار دوست بھی تھے۔ میری عمر سولہ سال تھی لیکن مولوی صاحب کو اٹھارہ سال بتائی انہوں نے نکاح پڑھا دیا۔ میں واپس سینٹر آگئی۔ مقررہ وقت پر بھائی لینے آگئے تھے۔

تین ماہ گزر گئے اس نے مجھے موبائل فون لا دیا تھا۔ اب میں رات کو سب کے سونے کے بعد اس سے باتیں بھی کرتی۔ اس نے بتایا کہ اس کے چچا کینیڈا میں رہتے ہیں، انہوں نے وہاں یونیورسٹی میں داخلہ کرادیا ہے وہ کینیڈا جارہا ہے۔ مجھے شاک تو لگا لیکن یہ اس کے مستقبل کا سوال تھا۔ وہ چلا گیا۔ فون میرے پاس تھا۔ شروع شروع وہ میں فون کرتا رہا پھر آہستہ آہستہ فون آنا کم ہو گئے۔ میں فون کرتی تو اٹھاتا ہی نہیں پھر ایک سال بعد یہ سلسلہ ختم ہی ہو گیا شاید اس نے اپنی سم تبدیل کرلی تھی۔

میں کیا کرسکتی تھی۔ شدید پریشانی نے مجھے بیمار کردیا لیکن پھر خود کو سنبھالنا ہی پڑا۔ آہستہ آہستہ مجھے بھی صبر آ گیا۔ میں اسے بھولنے لگی۔

اب سات سال گزر گئے ہیں۔ میرا اس سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ گھر والے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ ایک جگہ بات بھی تقریباً طے ہو گئی ہے۔ لیکن میں شدید پریشان ہوں۔ وہ نکاح؟ کیا اس کی شرعی حیثیت ہے؟ کیا میں خلع یا طلاق لیے بغیر دوسری جگہ شادی کرسکتی ہوں؟

گھر والوں کو کیا بتاؤں؟ کیا کوئی میری پاک دامنی پر یقین کرے گا۔ میری کم عمری کی وہ حماقت اب میرے گلے کا پھندا بن گئی ہے۔ میں اس سے رابطہ کیسے کروں؟ میرے پاس اس کا پتا بھی نہیں ہے۔

ج: زندگی میں اٹھایا ہوا ایک چھوٹا سا غلط قدم انسان کو تاریکیوں میں دھکیل سکتا ہے، ہمارے ہاں والدین اولاد پر سختی کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ سختی سے صرف ضد جنم لیتی ہے اگر گھر کا ماحول اتنا سخت نہ ہوتا تو شاید آپ کے اندر بغاوت جنم نہ لیتی اور آپ اتنا بڑا قدم اٹھانے کی ہمت نہ کرتیں گھر کا ماحول خواہ کیسا ہو، باپ بھائی کتنے سخت ہوں۔ کم از کم ماؤں کو چاہیے کہ وہ اپنی بیٹیوں سے دوستانہ تعلق رکھیں تا کہ وہ اپنی ہر بات انہیں بتا سکیں۔

آپ نے اپنی ٹیچر کے متعلق نہیں لکھا کہ وہ اب کہاں ہیں۔ آپ کے شہر میں ہیں یا شادی ہو کر کسی اور شہر میں چلی گئی ہیں۔ آپ جس طرح بھی ممکن ہو، ان کو تلاش کریں اور ان سے کہیں کہ وہ اپنے بھائی سے کہہ کر اس مسئلہ کو حل کرائیں۔ وہ آپ کو طلاق دے دے تو آپ آزاد ہوں گی پھر آپ کسی دوسری جگہ شادی کرسکتی ہیں۔

☆

Google

بیوٹی بکس

امت الصبور

فوزیہ مرزا......نوشہرہ

س: اصل آپی میرا مسئلہ یہ ہے کہ سردیوں میں میری جلد خشک ہوجاتی ہے، رنگ بھی دب جاتا ہے میں روزانہ رات کو کلینزنگ کرکے سوتی ہوں اور کولڈ کریم بھی لگاتی ہوں۔ مگر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ج: سرد موسم میں خشک اور کھردری جلد نہ صرف چہرے کی رونق ختم کردیتی ہے بلکہ اکثر خواتین جلد پھٹنے کی شکایت میں بھی مبتلا رہتی ہیں۔ موسم سرما میں جلد کی خشکی کا سبب ہوا میں نمی کا کم ہونا ہے، لیکن اس موسم میں خود پر تھوڑی سی توجہ اور احتیاط جلد کی خوب صورتی اور صحت برقرار رکھ سکتی ہے۔ سرد موسم میں بہت زیادہ گرم پانی سے نہانا جلد کو خشک کردیتا ہے۔ اس لیے ضرورت سے زیادہ گرم پانی کے استعمال سے احتیاط برتیں جبکہ جلد کو خشکی سے بچانے کے لیے نہانے سے قبل پانی میں بے بی آئل کے چند قطرے ڈال لیں۔ چہرے پر زیتون کے تیل کا مساج کرنے سے بھی آپ کی جلد تروتازہ شاداب رہنے کے ساتھ خشک بھی نہیں رہے گی۔

ثمرین خواجہ......لاہور

س: میری عمر بائیس سال ہے لیکن میری جلد زیادہ آئلی ہے۔ جس کی وجہ سے دانے بھی ہوتے ہیں؟

ج: چہرے کی چکنائی دور کرنے کے لیے بیسن کا تیار کردہ ماسک بہترین ثابت ہوتا ہے۔ اس سے چہرہ چکنائی سے پاک اور فریش ہوجاتا ہے۔

اس کے ساتھ رات کو سونے سے قبل ایلوویرا کے جیل سے ہلکا سا مساج کریں اور صبح اٹھ کر دھولیں۔ آپ واضح فرق محسوس کریں گی۔

سائرہ حسین......کراچی

س: آپی سردیوں میں میرے ہاتھوں کی جلد سخت کھردری ہوجاتی ہے جبکہ جلد اترنے بھی لگتی ہے۔ اس کی وجہ سے مجھے ہاتھوں میں ہر وقت کھجلی کا بھی سامنا رہتا ہے۔

ج: موسم سرما میں سب سے بڑا درپیش مسئلہ ہاتھوں کی جلد اترنے کا ہوتا ہے۔ اس مسئلے سے نجات حاصل کرنے کے لیے گلاب کے عرق میں دو چمچے گلیسرین، ایک بڑے لیموں کا رس ملا کر کسی بوتل میں محفوظ کرلیں۔ رات کو سونے سے قبل اس سے مساج کریں۔ آپ کے ہاتھوں کی پھٹی ہوئی جلد بھی ٹھیک ہوجائے گی جبکہ ہاتھ بھی نرم و گداز ہوجائیں گے۔ دن میں تین بار ہاتھوں کو خشک کرکے کسی بھی اچھے برانڈ کا لوشن ضرور لگائیں۔ آپ کو چند دنوں میں ہی فرق محسوس ہوگا۔

اس کے ساتھ سردیوں میں پیاس کم محسوس ہوتی ہے اس لیے ہم پانی کم پیتے ہیں۔ جسم میں پانی کی کمی ڈی ہائیڈریشن کا سبب بنتی ہے، ایسے میں مالٹے، سنگترے، گاجر، مولی اور دیگر موسمی پھلوں سے بھی جسم میں پانی کی کمی پوری کی جاسکتی ہے۔ پانی کا زیادہ استعمال جلد کے لیے ضروری نمی کو برقرار رکھتا ہے۔

زہرہ خان......راولپنڈی

س: میرے سر پر آگے سے بال بہت کم ہوگئے ہیں، ایک گول سا دائرہ بن گیا ہے۔ کوئی آسان سا گھریلو نسخہ بتائیں؟

ج: دیسی لہسن — کو چھیل لیں، چھری نہ لگائیں، ہاتھ سے دو حصوں میں تقسیم کرلیں، اس کو سر کی جلد پر رگڑیں اتنی دیر تک کہ جلد میں جلن محسوس ہونے لگے

سر میں پیاز کا پانی لگانے سے بھی بال نکل آتے ہیں۔ اپنی غذا پر توجہ دیں۔ تازہ پھل اور سبزیاں کھائیں، خصوصاً سیب چھلکوں سمیت کھائیں۔ سیب میں آئرن ہوتا ہے جو بالوں کو توانا اور مضبوط بناتا ہے۔ بالوں میں چمک پیدا ہوجاتی ہے۔

☆

Digitized by Google